

# اقبالیات: تفہیم و تجزیہ

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر  
محمد سہیل مفتی  
ناظم

اقبال اکادمی پاکستان  
(حکومت پاکستان، قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن)  
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 36314-510

Fax: [+92-42] 36314-496

Email: [iqbalacd@lhr.comsats.net.pk](mailto:iqbalacd@lhr.comsats.net.pk)

Website: [www.allmaiqbal.com](http://www.allmaiqbal.com)

ISBN 969-416-360-9

طبع اول : ۲۰۰۵ء  
طبع دوم : ۲۰۱۰ء  
طبع سوم : ۲۰۱۶ء  
تعداد : ۵۰۰  
قیمت : ۶۰۰/- روپے  
مطبع : ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶- میکوڈ روڈ، لاہور، فون: ۳۷۳۵۷۲۱۴

مشفق خواجہ  
(م: ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء)

کی یاد میں

## اظہارِ تشکر

بعض احباب خصوصاً پروفیسر خورشید رضوی، ڈاکٹر تحسین فراقی، پروفیسر جعفر بلوچ اور عبدالعزیز ساحر نے زیر نظر مضامین کی تحریر و تکمیل اور نظر ثانی کے مراحل میں بعض اہم نکات کی طرف متوجہ کیا۔ فاضل دوست ملک حق نواز خاں صاحب نے یہ مضامین پڑھ کر مفید مشوروں سے نوازا۔ کتابت اور ترتیب و تدوین کے فنی اور تکنیکی امور میں برادر عزیز پروفیسر سلیم منصور خالد کی مہارت بہت کام آئی۔ اقبال اکادمی لاہور کے کارکنوں نے، علامہ اقبال کی بیاضوں اور مسودوں کے عکس مہیا کرنے میں بے حد تعاون کیا۔ عزیزم ڈاکٹر رفاقت علی شاہد، برادرم ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی اور بیٹی قدسیہ نے پروف خوانی میں معاونت کی۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے اشاریہ مرتب کیا۔

میں ان سب کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے

نوازے۔ آمین!

— مؤلف

## ترتیب

- تقدیم ۷ ڈاکٹر وحید قریشی
- حرفِ اوّل: دیباچہ طبع اوّل ۱۱ مؤلف
- دیباچہ: طبع دوم ۱۴ مؤلف

مضامین:

### ۱

- ۱۷ علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری
- ۳۳ میر انیس اور علامہ اقبال

### ۲

- ۴۳ خطباتِ اقبال (تفہیم، رجحانات، معنویت)
- ۶۳ فکرِ اقبال اور مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار
- ۷۷ اقبال اور عالمی نظام کی تشکیلِ جدید
- ۹۵ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی
- ۱۱۳ اقبال کا تصورِ جہاد
- ۱۳۷ اسلامی نشاۃِ ثانیہ اور علامہ اقبال

۳

- ۱۵۵ تاریخ ہند: چند تصریحات  
 ۱۷۳ بالِ جبریل کا متروک کلام  
 ۲۰۳ کچھ غیر مطبوعہ کلام  
 ۲۲۱ غیر مطبوعہ رقعات بنام پرویں رقم

۴

- ۲۳۱ اقبال صدی کی سوانح عمریاں  
 ۲۷۱ کلامِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

○

ضمیمے:

- ۲۸۷ رشید حسن خاں ۱- کلامِ اقبال کی تدوین  
 ۳۱۴ مؤلف ۲- تاریخ ہند: مزید تصریحات

○

- ۳۱۸ کتابیات  
 ۳۱۹ اشاریہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## تقدیم

اقبالیات: تفہیم و تجزیہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مقالات کا چوتھا مجموعہ ہے، جس میں پچھلتے برس میں لکھے گئے بعض مقالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ طباعتِ حاضرہ میں ان مقالات پر نظر ثانی کر کے انھیں آپ ٹو ڈیٹ کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مقالے اپنی موجودہ شکل میں زیادہ مکمل اور جامع ہو گئے ہیں۔

کتاب کو چار بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلا حصہ اقبال اور اکبر حیدری اور میرا نیں اور اقبال کے موضوع پر ہے۔ دوسرے حصے میں فکرِ اقبال کے بعض پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ تیسرے اور چوتھے حصے کا تعلق خالصتاً اقبالیاتی تحقیق سے ہے۔

آغازِ کار میں ہاشمی صاحب کی دلچسپی زیادہ تر سوانحی اور واقعاتی چھان پھٹک تک محدود تھی، اس مجموعے میں تنقیدی حصے کو بھی اہمیت دی گئی ہے چنانچہ ان مضامین میں فکرِ اقبال کے تجزیاتی مطالعے سے ہاشمی صاحب کے ربط و دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تنقیدی حصے میں شامل بعض مقالے 'اقبال کا تصورِ جہاد'، 'اسلامی نشاتِ ثانیہ اور اقبال' اور 'فکرِ اقبال اور مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار' نسبتاً زیادہ اہم ہیں۔ ان مقالات میں انھوں نے فکرِ اقبال کے بعض ایسے گوشوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے جنہیں دوسرے نقادوں نے یا تو یکسر نظر انداز کر دیا یا ان کی طرف معمولی اشارے کر کے آگے نکل گئے۔ ہاشمی صاحب نے ان موضوعات پر جم کر لکھا ہے۔ البتہ دو مقالوں میں بعض مقامات پر انھوں نے کسی قدر مرآت سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اور سہیل عمر کے لیے موصوف ایک

نرم گوشہ رکھتے ہیں، اس لیے پنجابی محاورے میں یہاں انھوں نے اپنا ہاتھ خاصا 'ہولاً' رکھا ہے۔ خطباتِ اقبال کے حوالے سے کئی اختلافی مقامات سے وہ خاموشی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ زندہ رُود کے بارے میں اگرچہ ان کا موقف یہ ہے کہ اب تک لکھی گئی سوانح عمریوں میں یہ سب سے اچھی سوانح عمری ہے لیکن تین چار بار نظر ثانی کے باوجود آخری ایڈیشن میں بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی غلطیاں موجود ہیں، جن سے ہاشمی صاحب نے صرف نظر کیا ہے۔ معاصرین کے بارے میں لکھتے ہوئے، نقاد اور محقق بعض اوقات بڑی مشکل سے دوچار ہوتا ہے اور ہاشمی صاحب بھی اس صورتِ حال میں کسی قدر مجبور دکھائی دیتے ہیں لیکن عمومی طور پر وہ اپنے معاصرین کی تحقیق کے بارے میں دو ٹوک بات کرنے کے عادی ہیں اور یہی ان کی تحقیق کا بنیادی وصف ہے۔

ان کے علم کا جو ہر تحقیقی حصے میں زیادہ نمایاں ہوا ہے کیوں کہ یہی اُن کا اصل میدان ہے۔ اقبال سے منسوب درسی کتاب تاریخ ہند کو کم و بیش سبھی نقادوں نے اقبال کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ہاشمی صاحب نے داخلی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اس کتاب پر محض اقبال کا نام درج ہے، فی الحقیقت اس کا علامہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح مضمون 'بال جبریل کا غیر مطبوعہ کلام' ان کی تحقیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے، جس میں اقبال اکادمی کی طرف سے کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال کی بعض فروگزاشتوں کی بالواسطہ تصحیح کی گئی ہے اور ایسے اشعار پیش کیے گئے جو کلیاتِ باقیات میں جگہ نہیں پاسکے۔ اسی طرح 'اقبال صدی کی سوانح عمریاں' میں وہ اصل مآخذ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے، اقبال کے سوانح نگاروں کی اکثر فروگزاشتوں کی برملا نشان دہی کرتے ہیں جس سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال پر اس سمت میں کام کرنے کی ابھی کتنی گنجائش موجود ہے۔ ہاشمی صاحب نے کلامِ اقبال کی تدوین جدید کے ضمن میں بعض اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس حوالے سے چونکہ میں بھی بعض امور سے متعلق رہا ہوں، اس لیے دو تین ایسی باتوں کی نشان دہی ضروری ہے، جن سے ہاشمی صاحب کے خیالات کی تائید ہوتی ہے اور وضاحت بھی۔



کلیاتِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں جس کمیٹی کا ذکر کیا گیا ہے اس میں میں بھی شامل تھا۔ ہاشمی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ کمیٹی میں صرف املا کے امور زیر بحث آئے تھے اور کلام کی تدوین اور دوسرے امور پیش نظر نہیں رہے۔ کمیٹی کا کوئی دوسرا اجلاس بھی نہیں ہو پایا، اس لیے تدوین کا کام دفتری عملے نے انجام دیا اور انھی پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

کلیاتِ اقبال کے آغاز میں جو دیباچے وغیرہ کے صفحے لگائے گئے، اگر ان کے لیے الگ نمبر شمار یا حروف ابجد سے کام لیا جاتا تو اچھا تھا۔ صفحات کا سلسلہ کلامِ اقبال سے شروع ہوتا تو جو خلفشار بعد کے اڈیشنوں میں ہاشمی صاحب کو نظر آتا ہے، وہ شاید پیدا نہ ہوتا۔ شروع کے صفحات کو کلامِ اقبال کے ساتھ نمبر وار ملانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کسی نئے دیباچے یا ابتدائیے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ پروفیسر محمد منور صاحب کے سبک دوش ہو جانے پر، شہرت بخاری ڈائریکٹر ہوئے تو کلیات میں ان کے نام کا اندراج بھی ہو گیا۔ شروع کے صفحات میں جو چیزیں ہاشمی صاحب کو کھٹکتی ہیں، اس کا سبب یہی ہے۔ اس کے بعد جو اڈیشن نکلے، ان میں طباعت کی خرابی بدستور قائم رہی۔ میرے زمانہ نظامت میں کلیات کے چار اڈیشن شائع ہوئے: عوامی اڈیشن ۱۹۹۴ء۔ سپر ڈی لکس اڈیشن، نومبر ۱۹۹۴ء، سفید کاغذ ۱۹۹۵ء۔ اور سفید کاغذ ۱۹۹۷ء۔

یہ سب اڈیشن متن کے اعتبار سے یکساں ہیں، صرف کاغذ اور جلد بندی کا فرق ہے۔ سپر ڈی لکس اڈیشن کی تقطیع قدرے بڑی ہے۔ ارزاں (عوامی) اڈیشن میں انور جاوید کے اشعار بہ امر مجبوری حذف کر کے میرے دیباچے کے لیے گنجائش نکالنی پڑی۔ میرے دیباچے میں ایک جملہ تھا: ’’اگر اسے پذیرائی ملی تو ان شاء اللہ اگلا اڈیشن قیمت کے لحاظ سے مزید سستا اور کاغذ کے لحاظ سے بہتر ہوگا‘‘۔ اس کی نشان دہی ہاشمی صاحب نے بھی کی ہے۔ دراصل اسی متن اور کتابت سے ایک پاکٹ اڈیشن میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، جو بعض مالی مشکلات کے سبب میرے زمانے میں ممکن نہ ہو سکا۔ میرا دور نظامت ختم ہوا تو موجودہ ناظم صاحب نے آئندہ اڈیشن (۲۰۰۰ء) سے میرے ابتدائیے کو خارج

کرنا اور 'حسن' اہتمام کے دو صفحات کا اضافہ کرنا ضروری سمجھا۔ شاید اس طرح اس منصوبے میں اپنی شرکت کا احساس دلانا تھا۔

ہاشمی صاحب نے رشید حسن خاں کے مضمون کو بطور ضمیمہ زیر نظر کتاب میں شامل کیا ہے۔ خان صاحب نے کلامِ اقبال کی تدوین کے ضمن میں اصولِ املا کی بات بھی کی ہے۔ میرے خیال میں تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ اقبال کے اصل املا کو بھی دیکھا جائے۔ ارمغانِ حجاز علامہ کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ آخر عمر میں علامہ اقبال کی بینائی متاثر ہو گئی تھی اور وہ اپنا کلام زیادہ تر دوسروں سے املا کراتے تھے۔ اس سلسلے میں سید نذیر نیازی اور م ش اور بعض دوسرے افراد کی املا بھی شامل کلام ہو گئی تھی۔ علامہ کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے کوئی بنیادی اصول املا وضع نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اپنے دور کی مروجہ املا کو اختیار کیا جس کی وجہ سے خود ان کی تحریر میں بھی کوئی ایک طریق کار جاری دکھائی نہیں دیتا۔

ایک سوال یہ ہے کہ یہ کلیات کس کے لیے ہے؟ اگر اس کی اشاعت عام قاری کے لیے ہے تو جدید اصولِ املا کو اختیار کرنا مناسب ہوگا اور اس کے ساتھ دیباچے میں اقبال کے طرزِ املا کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ اور اگر یہ متن عالموں اور محققوں کے لیے ہے تو اقبال کے املا کی پیروی لازماً کی جانی چاہیے تھی۔

ان چند گزارشات کے ساتھ، میں ہاشمی صاحب کے ان وقیع مقالات کی ایک جا اشاعت پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہاشمی صاحب نے پچھلے تین پینتیس برس میں اقبال کو مسلسل سینے سے لگائے رکھا اور اس سمت میں ان کی تحقیق نئے نئے انکشافات پیش کر کے محققین سے دادِ تحقیق وصول کرتی رہی ہے۔ اقبالیات کے ضمن میں ان کی مساعی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر وحید قریشی

پروفیسر اے ریٹس، جی سی یونیورسٹی لاہور

[سابق ڈائریکٹر: اقبال اکادمی پاکستان]

## حرفِ اوّل

یہ مضامین کئی برسوں میں وقفوں وقفوں، بلکہ بعض اوقات طویل وقفوں سے لکھے گئے۔ ان میں بعض تو از خود کسی خاص موضوع پر اپنے نقطہ نظر یا کسی جہت کی توضیح و تعبیر کے لیے قلم بند کیے گئے اور بعض کسی اقبال سیسی ناز، کانفرس یا اقبالیاتی مجلے کے مدیر کی فرمائش پر تحریر کیے گئے۔ ان میں اقبال کی شخصیت کے بعض پہلوؤں اور ان کے ذہن اور فکر کے بعض نکات یا اقبالیات کے کسی نکتے اور مسئلے یا کسی خاص پہلو کی تفہیم و تعبیر کی کوشش کی گئی ہے۔



ان مضامین کے موضوعات و مباحث میں کچھ نہ کچھ نیا پن ضرور ہے، مگر ان میں بہت ٹھوس اور پیچیدہ یا فکری و فلسفیانہ بحثیں نہیں ملیں گی۔ راقم نے سیدھے سادے انداز میں بعض نکات اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیشتر مضامین کا تعلق اقبالیات کے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے ہے، مثلاً: 'کلامِ اقبال کی تدوین جدید' جس میں کلامِ اقبال کی اصل ترتیب کی بحالی، اور اس کی تحقیقی تدوین کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ بد قسمتی سے اصولِ تحقیق و تدوین کے مطابق اقبال کی شاعری کی ترتیب اور معیاری اشاعت کا موضوع 'غیر علمی' ہونے کے سبب، التفات کے قابل نہیں سمجھا گیا، مگر راقم کے نزدیک یہ اقبالیات کے تمام علمی اور فکری کاموں کی بنیاد ہے اور اس سے صرف نظر کر کے اقبالیات کی کوئی عمارت راست بنیادوں پر اُستوار نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح 'تاریخِ ہند: چند تصریحات' میں علامہ اقبال سے تاریخِ ہند کے انتساب کی اصلیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخِ ہند چالیس برس سے علامہ سے منسوب چلی آ رہی ہے اور حیرت انگیز طور پر بشیر احمد ڈار اور ممتاز حسن جیسے جید علمائے اقبالیات بھی (شاید کتاب کے سرورق کی بنا پر) اس باب میں

غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ راقم کے نزدیک اس کتاب کے محتویات واضح طور پر شاہد ہیں کہ اس کی تالیف و تصنیف سے علامہ کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ابتدائی دو مضامین (علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری۔ میر انیس اور علامہ اقبال) اور خطباتِ اقبال بھی قابلِ توجہ ہیں۔

خطبات پر ایک تازہ کتاب (خطباتِ اقبال: ایک مطالعہ، الطاف احمد اعظمی دہلی، ۲۰۰۱ء) کا ذکر، متذکرہ بالا مضمون میں نہیں آسکا کیوں کہ یہ ہمیں حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے اور وہ بھی خاصی تگ و دو کے بعد۔ اعظمی صاحب کی رائے علما کی اُس جماعت (سید سلیمان، سید مودودی، علی میاں، برہان احمد فاروقی، محمد منور اور محمد سہیل عمر وغیرہ) کے نقطہ نظر سے قریب بلکہ کسی قدر شدید تر ہے، جو خطبات کے بعض مباحث سے نامطمئن ہیں۔ اعظمی صاحب نے پانچویں (اسلامی ثقافت) اور چھٹے (اصول حرکت یا اجتہاد) کو تو ”عالمانہ اور فکر انگیز“ قرار دیا ہے مگر ان کا خیال ہے کہ علامہ کا مطالعہ قرآن زیادہ عمیق نہیں تھا (ص ۱۷)۔ اس لیے اسلامی عقائد کی توضیح میں ان سے بعض فکری لغزشیں سرزد ہوئی ہیں (ص ۱۴)۔ اور ان کا زاویہ نگاہ ٹھیک وہی ہے جو وحدت الوجود کا ہے (ص ۹)۔ اعظمی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اقبال نے قرآنی آیات کا مطلب کھینچ تان کر نکالا ہے بلکہ ان کے ہاں بعض مقامات پر ’دانستہ تحریف‘ کا گمان ہوتا ہے (ص ۱۶)۔۔۔۔۔ ہمارے خیال میں اقبال پر ’دانستہ تحریف‘ کا گمان کرنا، محض بدظنی اور زیادتی ہے۔ اسی طرح اعظمی صاحب کی یہ بات بھی درست نہیں کہ اب تک [اقبال] کے خطبات کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا۔ (ص ۱۶)۔۔۔۔۔

کسی ادعا کے بغیر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ مضامین کسی نہ کسی درجے میں اقبال اور اقبالیات کی تفہیم و تعبیر میں معاون اور مفید ثابت ہوں گے۔



قارئین کو اس کتاب میں املا لے آؤٹ اور تدوین کے مروج اسالیب سے کچھ انحراف (یا اجتہاد) نظر آئے گا مثلاً:

۱- املا زیادہ تر جناب رشید حسن خاں کے اصولِ املا کے مطابق ہے، اگرچہ

بعض عملی دشواریوں اور دیگر وجوہ سے، اس کی سو فی صد پابندی نہیں کی جاسکی۔

۲- اقتباسات میں صرف دائیں جانب جگہ (پوٹ) چھوڑی گئی ہے اور اقتباسات کا خط، متن سے قدرے خفی ہے۔ مروّج طریقے کے مطابق ان پر واوین نہیں لگائے گئے، کیوں کہ ان کے بغیر بھی اقتباسات بخوبی نمایاں اور واضح ہیں۔

۳- کتابوں اور اخبارات و رسائل کے نام خطِ نسخ میں دیے گئے ہیں۔ (اسے اُردو کا *italics* سمجھ لیجیے) اس طرح یہ نام عام عبارت سے الگ اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ مروّج طریقے کے برعکس، ان پر واوین لگائے گئے، نہ انھیں خطِ کشیدہ کیا گیا ہے۔

یہ اجتہادات، صاحبانِ ذوق کے لیے دعوتِ فکر و تاامل ہیں۔ بسا اوقات 'طرزِ کہن' سے آگے بڑھ کر، آئین نو، اختیار کرنے میں افادیت اور سہولت کے کچھ پہلو بھی نکلتے ہیں۔



میں استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے زیرِ نظر مضامین کو پسند کیا اور کتاب پر 'تقدیم' رقم فرما کر، میری اور کتاب کی توقیر بڑھائی۔

رفیع الدین ہاشمی

سابق استاد و صدر شعبہ اُردو

پنجاب یونیورسٹی اور نیٹل کالج لاہور

## دیباچہ

(طبع دوم)

زیر نظر اشاعت میں پروف اور بعض حوالوں کی غلطیاں درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دو چار مقامات پر عبارتوں میں تبدیلی اور اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ تاریخ ہند: چند تصریحات کے سلسلے کی نئی معلومات ضمیمہ ۲ میں دی جا رہی ہیں۔

یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ پہلے ایڈیشن پر سنہ طباعت ۲۰۰۴ء درج ہے لیکن بالفعل کتاب ۲۰۰۵ء میں چھپ کر آئی تھی اور اسے ۲۰۰۵ء کے ”قومی صدارتی اقبال اورڈ“ کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

کتاب کی ”تقدیم“ مرحوم استاد ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھی تھی اور انتساب، جناب مشفق خواجہ کے نام کیا گیا تھا۔ اس عرصے میں آسمان تحقیق و تدوین کے یہ دونوں تاب ناک ستارے غروب ہو گئے۔ باری تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، آمین!

رفیح الدین ہاشمی  
۱۴ جولائی ۲۰۱۰ء

○○○

## دیباچہ

(طبع سوم)

اس اشاعت میں محدودے چند اغلاط کی درستی کی گئی ہے۔ عبارات میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں کیا گیا۔

رفیح الدین ہاشمی

۲۵ مئی ۲۰۱۶ء

پروفیسر شعبہ اقبالیات

پنجاب یونیورسٹی اور نیٹل کالج لاہور

مضامین

## اختصارات

بعض کتابوں اور ناشرین کا ذکر مضامین میں بار بار آیا ہے ان کے لیے حسب ذیل مختصر نام اختیار کیے گئے ہیں:	
پس چہ باید کرد	پس چہ باید کرد امے اقوام شرق مع مسافر، مسمولہ: کلیاتِ اقبال، فارسی
تشکیلِ جدید	تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ: علامہ اقبال (مترجم: نذیر نیازی) بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۵۸ء
تصانیفِ اقبال	تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۲ء
کلیاتِ باقیات	کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، مرتب: ڈاکٹر صابر کلوروی۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۳ء
مکاتیب بنام گرامی	مکاتیبِ اقبال بنام گرامی، مرتب: محمد عبداللہ قریشی۔ اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۹ء
<i>The Reconstruction of Religious Thought in Islam</i>	<i>Reconstruction</i>
علامہ اقبال۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور بہ اشتراک: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۶ء	
<i>'Speeches, Writings and Statements of Iqbal</i>	<i>Speeches</i>
مرتب: لطیف احمد شروانی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء۔	
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور	غ/ع/غلام علی
اقبال اکادمی پاکستان لاہور	اقبال اکادمی



## علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری

علامہ اقبال طبعاً ملین سار اور مرعجان مرخ شخصیت کے مالک تھے۔ دوست احباب سے ہمیشہ مروّت اور وضع داری سے پیش آتے اور دوستوں کے بارے میں حتیٰ الوسع کسی طرح کی بدگمانی سے احتراز کرتے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں سے قطع تعلق کے سوا، ان کی پوری زندگی میں بد مزگی کی ایسی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ نواب موصوف سے بھی وہ مصالحت پر آمادہ ہو گئے تھے مگر نواب صاحب اچانک انتقال کر گئے اور علامہ اقبال کو عمر بھر اس کا شدید قلق رہا۔

علامہ اقبال کے احباب میں سرائیکبر حیدری (۱۸۶۹ء-۱۹۴۲ء) وہ دوسرے شخص ہیں جن سے قطع تعلق کی نوبت تو نہیں آئی مگر باہمی تعلقات میں کچھ تلکد ر پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ ۱۹۰۴ء کے ایک گروپ فوٹو میں اقبال اور سرائیکبر دونوں موجود نظر آتے ہیں تاہم یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں کی پہلی ملاقات کب ہوئی۔ سید شکیل احمد کے مطابق عطیہ فیضی اکبر حیدری کی رشتے دار تھیں اور حیدری صاحب سے اقبال کا تعارف انھوں نے کرایا تھا۔ یہ تعارف ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد میں کرایا گیا یا اس سے پہلے؟ کس موقع پر؟ کب اور کہاں؟ شکیل احمد کی روایت میں اس کی صراحت نہیں ملتی چنانچہ دستیاب شہادت کے مطابق دونوں کی پہلی شعوری ملاقات مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوئی جب علامہ اقبال پہلی بار حیدرآباد دکن گئے۔ اکبر حیدری کی ”نہایت مہذب، وسیع، فراخ دل اور جذبہ ہمدردی“ سے مالا مال شخصیت نے انھیں متاثر ہی نہیں کیا، ان کا دل موہ لیا۔ ان کے ہاں

اقبال کو ”گھر کا سا آرام ملا“۔ اقبال نے سفر حیدرآباد کی یادگار نظم ”گورستانِ شاہی، کو سراکبر اور ان کی بیگم کے نامِ نامی سے منسوب کیا، جنھوں نے اپنی مہمان نوازی کے سبب اقبال کے ”قیام حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا“۔<sup>۵</sup>

اس اوّلین ملاقات کے بعد، آئندہ برسوں میں دونوں اکابر کے درمیان خوش گوار رابطہ قائم رہا۔ نواب مشتاق احمد خاں کی روایت ہے کہ اکبر حیدری ”اُردو اور فارسی دونوں زبانوں سے نابلد تھے اور وہ [اقبال] کا کلام نہیں پڑھ سکتے تھے“۔<sup>۶</sup> بایں ہمہ وہ، علامہ اقبال کی غیر معمولی علمی اور تعلیمی قابلیت، ایک قومی شاعر اور ایک سربرآوردہ مسلم شخصیت کی حیثیتوں میں ان کے قدردان تھے۔ علامہ اقبال بھی، سراکبر کے حسن سلوک کے سبب ان کے مدّاح رہے۔ جس زمانے میں مولانا گرامی حیدرآباد میں مقیم تھے، علامہ نے ۱۸ جنوری ۱۹۱۵ء کو انھیں لکھا: ”حیدری صاحب سے کبھی کبھی ضرور ملا کیجئے“۔<sup>۷</sup> پھر ۲۸ جنوری ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: ”حیدری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں اور نہایت با مذاق۔ آپ ان سے ضرور ملا کریں“۔<sup>۸</sup>

اسی دوران میں حیدرآباد ہائی کورٹ میں سید ہاشم بلگرامی کے انتقال سے جج کا ایک عہدہ خالی ہوا تو میونسپل گزٹ لاہور کے ایڈیٹر نشی دین محمد نے اس عہدے کے لیے علامہ اقبال کا نام تجویز کیا۔ اخبارات میں چرچا ہوا تو اقبال کو مبارک باد کے تار آنا شروع ہو گئے۔<sup>۹</sup> عدالتِ عالیہ میں جج کا منصب اقبال کے لیے ایک باوقار ملازمت کے مترادف تھا۔ مزید برآں حیدرآباد میں مہاراجا سرکشن پرشاد، سراکبر حیدری اور دیگر مذاہنوں کی موجودگی اقبال کے لیے باعثِ کشش تھی۔ مولانا گرامی جیسے بے تکلف اور ہم مذاق سخن گو کی صحبت کا امکان اس پر مستزاد۔۔۔ اس منصب کے حصول کے لیے اقبال نے کچھ زیادہ دوڑ دھوپ تو نہیں کی تاہم بطور جج تقرر کے وہ آرزو مند ضرور تھے۔<sup>۱۰</sup>

مولانا گرامی اور شاد کے نام، اقبال کے اس دور کے خطوط دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں بعض خدشات کے باوجود، وہ ایک حد تک پُر امید تھے۔ بہ نسبت اکبر حیدری کے، ان کی توقعات مہاراجا شاد سے زیادہ تھیں۔ سراکبر ریاست حیدرآباد میں

ایک مؤثر شخص تھے، مگر اقبال اُن سے کچھ زیادہ امید نہیں رکھتے تھے۔ مولانا گرامی کو ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں: ”حیدری صاحب کمزور آدمی ہیں، اگر وہ کوشش کریں تو ممکن ہے مگر اس معاملے میں میرا لکھنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا“۔<sup>۱۱</sup> گویا اقبال کسی سبب سے محسوس کرتے تھے کہ حیدری صاحب ان کے تقرر کے لیے کوئی مؤثر کوشش نہیں کر رہے۔

چونکہ شاد سے علامہ اقبال کی قربت زیادہ تھی اور وہ ریاست میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے اس لیے ناسازگار حالات کے باوجود، علامہ ان کے نام ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء کے خط میں اپنی تعلیم، استعداد و صلاحیت اور تصانیف وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔<sup>۱۲</sup> اس خیال سے کہ شاید مہاراجا شاد، اس معاملے میں کسی طرح کی مدد کر سکیں مگر یہ معاملہ بہت دنوں بلکہ کئی مہینوں تک معلق رہا۔

اس دوران میں حیدری صاحب، علامہ کو بار بار حیدرآباد آنے کی دعوت دیتے رہے، مگر علامہ کسی واضح مقصد سفر یا یقین دہانی کے بغیر، ایک لمبا سفر کرنا بے معنی سمجھتے تھے۔ پھر بھی ان کے اصرار پر انھوں نے سفر حیدرآباد کا عزم کر لیا۔<sup>۱۳</sup> (لیکن اندازہ ہے کہ حیدرآباد کی طرف سے بھی کچھ سرد مہری کا مظاہرہ ہوا، اس لیے یہ سفر ملتوی ہوتا رہا، بالآخر منسوخ۔۔۔!)

پہلے تو علامہ اقبال خاصے پُر امید تھے، پھر رفتہ رفتہ انھیں مایوسی ہونے لگی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ جولائی یا اگست میں حیدری صاحب نے علامہ اقبال کو (ایک متبادل ملازمت کے طور پر) جامعہ عثمانیہ میں قانون کی پروفیسری کی پیش کش کی تھی۔<sup>۱۴</sup> اب اس پیش کش سے اقبال کو شاید یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ انھیں حج بنانا مشکل ہے (حالانکہ ان کی ترجیح یہی تھی) چنانچہ اقبال کچھ اور مایوس ہو گئے۔ یہ مایوسی اس لیے بھی تھی کہ اس وقت جامعہ عثمانیہ کا قیام ابھی زیر توجیز تھا، جامعہ بالفعل وجود میں نہیں آئی تھی اور علامہ کو خدشہ تھا کہ ”شاید یونیورسٹی کبھی بروے کار بھی نہ آئے“۔<sup>۱۵</sup> اور اگر یونیورسٹی قائم ہو گئی تو بھی ”جو آدمی وہاں پر موجود ہیں، وہ اپنے ذاتی مفاد کی غرض سے اپنے سے قابل تر اور زیادہ

کارکن آدمیوں کو حیدرآباد نہ گھسنے دیں گے،“۔<sup>۱۷</sup>

اس دوران میں حیدرآباد سے اقبال کے نام ایک گم نام خط آیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم تو آپ کے آنے کے لیے شب و روز دعا کر رہے ہیں مگر بعض آدمی جو بظاہر آپ کے دوست ہیں، حقیقت میں آپ کے یہاں آنے پر خوش نہیں ہیں۔ اس خط میں بقول اقبال: ”حیدری صاحب کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا تھا“۔<sup>۱۸</sup>

علامہ اقبال پہلے ہی طرح طرح کے خدشات میں مبتلا تھے، اب ان حالات میں ان کے دل میں اکبر حیدری کے بارے میں کچھ ملال اور تکدّر پیدا ہونا فطری تھا۔ مہاراجا شاد کو ۱۷ اکتوبر کے خط میں لکھتے ہیں: ”حیدری صاحب کسی قسم کی اُمید پیدا نہیں کرتے بلکہ محض تفقن طبع کے لیے حیدرآباد کی دعوت دیتے ہیں“۔<sup>۱۹</sup>

حیدری صاحب کی دعوت کے جواب میں اقبال کی سردمہری اور سفر سے (بجاطور پر) گریز کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدری صاحب بھی خاموش ہو گئے۔ مولانا گرامی کو اقبال نے مطلع کیا کہ ”حیدری صاحب کا پھر کوئی خط نہیں آیا“۔<sup>۲۰</sup>۔۔۔ بہر حال اس قصے کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ اقبال ان سے مایوس ہوئے۔ دل میں ایک ملال اور تکدّر باقی رہا۔

اکبر حیدری سے اقبال کا ربط و تعلق اس کے بعد بھی قائم رہا۔ حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے کلیاتِ اقبال (مرتب: مولوی عبدالرزاق) کا جھگڑا انھی کی وساطت سے طے ہوا۔<sup>۲۱</sup> سفر جنوبی ہند میں علامہ اقبال نے جنوری ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد میں تین لیکچر دیے، اس موقع پر ۱۷ جنوری کو اکبر حیدری نے علامہ کے اعزاز میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ، محکمہ مالیات کے عہدے دار اور معززین شہر بھی شریک تھے۔<sup>۲۲</sup> بایں ہمہ ان کے لیے اقبال کے ہاں پہلا سا جوش و جذبہ باقی نہ رہا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے علامہ کے دل میں سراکبر کے لیے کوئی گہرہ پڑ گئی تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس (منعقدہ لندن: اکتوبر، نومبر ۱۹۳۱ء) کے موقع پر علامہ اقبال اور سراکبر حیدری کو باہم ملاقاتوں کے مواقع میسر آئے مگر ۱۹۱۷ء میں سراکبر کے متعلق اقبال کے ہاں جو ایک طرح کا تحفظ و تاامل (reservation and hesitation) اور ان

کے دل میں تلکدّ اور ملال پیدا ہو گیا تھا، وہ ختم نہ ہو سکا، بلکہ کانفرنس کے دوران میں ایک واقعے کے سبب اس میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ نظر حیدر آبادی لکھتے ہیں:

بہادر یار جنگ سے روایت ہے کہ اُن سے خود اقبال نے کہا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس کے دوران نجی طور پر وزیر ہند اور انگلستان کے دوسرے مدبرین سے حیدرآباد کے آئینی موقف کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور انہیں اپنے دلائل سے قائل کر دیا کہ حیدرآباد کو اس کے مفوضہ علاقوں کی واپسی کے ساتھ مقبوضہ جاتی درجہ دے دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی آزاد حیثیت میں کامن ویلتھ کی تقویت کا باعث ہو لیکن بد قسمتی سے خود حیدرآباد کے وفد کے سربراہ اکبر حیدری نے اس کی مخالفت کی اور مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ایسا عمل قبل از وقت ہوگا اور ممکن ہے اس اقدام سے ہندو جماعتیں ایچی ٹیشن کریں اور دوسری ریاستیں بھی ایسے ہی مطالبات نہ پیش کر دیں..... بہادر یار جنگ بیان کرتے ہیں کہ اس سہی پُر خلوص کی ناکامی کا اقبال کو آخربیک افسوس رہا۔<sup>۲۲</sup>

اس واقعے کے بعد، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اکبر حیدری کے بارے میں اقبال کے رنج و ملال اور تلکدّ اور ملال کچھ اور اضافہ ہو گیا، تاہم فکر و نظر کے اختلاف کے باوجود ذاتی سطح پر دونوں کے باہمی تعلقات بدستور قائم رہے۔ کانفرنس سے واپسی پر پورٹ سعید سے بمبئی تک دونوں نے ایک ہی جہاز ”پلسنا“ میں سفر کیا۔ اکثر اوقات کھانے کی میز پر ملاقات ہوتی تھی اور متفرق موضوعات پر گفتگو بھی رہتی۔ اکبر حیدری نے ایک دفعہ علامہ اقبال، مولانا شفیع داؤدی اور ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کی دعوت بھی کی۔<sup>۲۳</sup>

ہندستان واپس پہنچنے کے بعد علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری کے تعلقات کی نوعیت رسمی یا کام چلاو (working relations) تو رہی، مگر دیرینہ تعلقات میں کسی طرح کی گرم جوشی دکھائی نہیں دیتی۔

عمر کے آخری برسوں میں جب علامہ کو علالت اور مالی پریشانی کا سامنا تھا، ان کے بعض مخلص احباب ان کے لیے مستقل اعانت یا وظیفے کی تدبیر کرنے لگے۔ نواب حمید اللہ صاحب والی بھوپال نے نظام دکن کو خط لکھ کر، تجویز پیش کی کہ ریاست حیدرآباد

سے علامہ اقبال کو ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ جاری کیا جائے مگر نواب بھوپال کی یہ اپیل بے نتیجہ رہی۔<sup>۲۴</sup> البتہ انھیں ریاست بھوپال سے، یکم جون ۱۹۳۵ء سے، پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ دیا جانے لگا۔<sup>۲۵</sup>

علامہ کے ایک مداح سردار امرائے سنگھ چٹھیا، سرائے حیدری کے دوستوں میں شامل تھے۔ سرائے نے ۱۹۳۶ء میں ریاست حیدرآباد کے صدر اعظم باب حکومت کا عہدہ سنبھالا تو سردار امرائے سنگھ نے اکبر حیدری کو آمادہ کیا کہ وہ بھوپال کی طرح، حیدرآباد سے بھی اقبال کے لیے مستقلاً وظیفہ جاری کرانے کی کوشش کریں۔<sup>۲۶</sup>

اس دوران میں اقبال اور سرائے کے درمیان سلسلہ مکاتبت بھی رہا۔ غالباً اقبال کو اجراءے وظیفہ کے لیے امرائے سنگھ کی تحریک کا علم ہو چکا تھا اور انھوں نے وظیفہ ملنے کی آس باندھ لی تھی۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کے نام ان کے ایک مکتوب (بتاریخ ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء) کا حسب ذیل اقتباس قابل توجہ ہے:

آپ کو یاد ہوگا کہ کسی گذشتہ خط میں آپ نے مجھے لکھا تھا کہ مجھے اپنے دنیاوی افکار سے مضطرب نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس اضطراب کو اپنے احباب کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ کیا اس معاملے میں آپ نے کوئی عملی اقدام کیا؟ اگر اب تک نہیں کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت موقع ہے کیونکہ سرائے حیدری نے اپنے گذشتہ خطوں میں اُمید دلائی ہے یا ایسے اشارات کیے ہیں جن سے اُمید بندھتی ہے۔<sup>۲۸</sup>

اگر یہ مان لیا جائے کہ سرائے، علامہ کا اُردو کلام بھی نہیں پڑھ سکتے تھے اور وہ سیکولر ذہن رکھتے تھے۔<sup>۲۹</sup> تب بھی قرآن کہتے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے ہمدرد، یہی خواہ اور قدردان تھے۔ وہ علامہ سے بالا بالا ان کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کی مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے۔<sup>۳۰</sup> گویا وہ، کسی حد تک صاحب اختیار بھی تھے۔ اس کے باوجود حیدرآباد سے اقبال کا وظیفہ جاری نہ ہو سکا۔۔۔ کیوں؟

ہمارے خیال میں اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں:

اول: مغربی تہذیب اور یورپ کی سامراجی طاقتوں، بالخصوص (نام لیے بغیر)

علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری

برطانوی نوآبادیاتی سامراج پر علامہ اقبال کی شدید تنقید اس کا ایک سبب ہو سکتی ہے۔<sup>۳۱</sup> اس کی طرف سرائیکبر حیدری کے نام، سردار امر او سنگھ کے ایک خط میں اشارہ ملتا ہے۔ سردار صاحب نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ علامہ نے پس چہ باید کرد امے اقوام شرق میں، (مغرب کے بارے میں جن شدید معاندانہ اور حریفانہ خیالات) کا اظہار کیا ہے<sup>۳۲</sup> وہ کہیں، حیدرآباد سے ان کی وظیفہ یابی میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔ یہ اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ان کے لیے وظیفے کی تجویز پر، تحقیق ہونے لگی جس کا ذکر سردار امر او سنگھ کے نام اکبر حیدری کے ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء کے مکتوب میں ملتا ہے۔ سرائیکبر کہتے ہیں:

I am sorry that a reply was not sent to you owing to your letter being filed along with the inquiry being made about Dr. Iqbal himself.<sup>۳۳</sup>

یوں اقبال کے خلاف یہ تحقیق، وظیفے کے اجرا میں سدّ راہ بنی۔

دوم: ریاست حیدرآباد میں ”غیر ملکیوں“ کے خلاف ایک ردِ عمل اور ایک حریفانہ رجحان ہمیشہ سے موجود رہا۔ عوامی اور ادبی حلقوں میں علامہ اقبال کی غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی کے باوجود، سرکاری اور حکومتی سطح پر بعض اوقات ان کے بارے میں عجیب و غریب رویوں کا اظہار ہوتا تھا۔<sup>۳۴</sup>

سرائیکبر حیدری ایک منجھے ہوئے، تجربہ کار اور دور اندیش بیوروکریٹ تھے۔ ”تو بازمانہ بساز“ کا مفہوم بخوبی سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے حیدرآباد میں غیر معمولی عروج حاصل کیا۔ ایک ”غیر ملکی“ ہونے کے باوجود ترقی کرتے کرتے وزیراعظم بن جانا، معمولی بات نہ تھی۔ خیال رہے کہ اس زمانے میں، مختلف امور کی نگرانی کے لیے ریاستوں میں انگریز ریڈیٹنٹ اور دیگر افسران موجود رہا کرتے تھے۔ حکومتی عہدے دار بالعموم ان کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے کیونکہ جاہ و منصب کی اس ترقی میں، ایک عنصر انگریز دوستی یا انگریزوں کی حمایت کا بھی ہو سکتا ہے۔ نظر حیدرآبادی کہتے ہیں کہ ”اکبر حیدری

کی سیاسی فہم و فراست کا محور دراصل انگریز ریڈیڈنٹ کی چہار دیواری تھی۔<sup>۳۵</sup> انگریز ریاستی معاملات میں دخیل رہتے تھے۔ اُن کی رائے کو نہ صرف اہمیت دی جاتی تھی بلکہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام بے حد مشکل ہوتا تھا۔ نظر حیدر آبادی لکھتے ہیں:

اقبال --- کے سفارشی خط لے کر لوگ حیدرآباد جاتے اور اعلیٰ ملازمتیں اور وظائف حاصل کر لیتے تھے، تو پھر خود ان کی عملی خدمات سے حیدرآباد کیوں محروم رہا؟ اس سوال کے جواب میں قیاس یہ کہتا ہے کہ باخبر اور ہوش مند انگریز، جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ ہوتے تھے اور جس نے حیدرآباد میں وقار الملک، محسن الملک، ظفر علی خاں، عبدالعلیم شرار اور آخر میں علی امام کو نکلنے نہ دیا تھا، وہ حیدرآباد میں اقبال جیسے ”خطرے“ کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔<sup>۳۶</sup>

حیدرآباد میں اقبال کے بارے میں جن تحقیقات کا اُوپر ذکر آیا، وہ انگریز افسروں کی دخل اندازی سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر ریاستی صاحبان اختیار تو بہت پہلے علامہ اقبال کو وظیفہ دینے کی علانیہ مخالفت کر چکے تھے۔<sup>۳۷</sup> بلکہ حکومت کے عہدے داروں کو اقبالیاتی سرگرمیوں میں شریک ہونے سے منع کیا گیا تھا۔<sup>۳۸</sup>

اس صورتِ حال میں نہایت ذہین اور دُور اندیش سر اکبر، جو نواب مشتاق احمد خاں کے بقول: سیکولر ذہن رکھتے تھے [اور] ملی تحریکوں سے دُور ہی [نہ تھے] بلکہ ان کی مخالفت کرتے تھے،<sup>۳۹</sup> اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ علامہ اقبال کے لیے کسی وظیفہ کے اجراء میں اپنا رسوخ و اعتبار موثر طریقے سے استعمال کریں اور شاید یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال کی درخواست کے باوجود سر اکبر حیدری، آفتاب اقبال کو عثمانیہ یونیورسٹی کی نوکری نہیں دلا سکے۔<sup>۴۰</sup>



ریاست حیدرآباد سے اقبال کا وظیفہ تو جاری نہ ہو سکا اور اس سے بہت پہلے،



علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری

علامہ اقبال کو حج بنانے کی تجویز بھی، باوجود سرائیکبر کی کوششوں کے، رو بہ عمل نہ آسکی مگر علامہ اقبال کی مالی اعانت کا خیال برابر سرائیکبر کے دامن گیر رہا۔ سرائیکبر اسٹنگھ کے نام ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

Some slight financial help has also been given but that is not enough.<sup>۴۱</sup>

غالباً یہ اُس ایک ہزار روپے کی ”خدائی کی زکات“ کی طرف اشارہ ہے، جو یومِ اقبال کے موقع پر ایک چیک کی صورت میں علامہ اقبال کو ”بطور تواضع“ بھیجی گئی تھی۔ یہ بجا ہے کہ اس واقعے میں غلطی دفتر کے متعلقہ ہندو کلرک کی تھی جس نے دفتری زبان میں ایک خشک اور سپاٹ سا مراسلہ بھی چیک کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس پر لکھا تھا: ’.....توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے.....‘ جسے پڑھ کر علامہ کو رنج ہوا<sup>۴۲</sup> اور انھوں نے ’سرائیکبر حیدری کے نام کے عنوان سے ارمغانِ حجاز میں شامل وہ اُردو قطعہ لکھ کر چیک واپس کر دیا جس کا آخری شعر ہے:

غیرتِ فقر، مگر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے: یہ ہے میری خدائی کی زکات<sup>۴۳</sup>

اقبال اور اکبر حیدری کے تعلقات کے پورے پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے اور یہ کہ ریاست حیدرآباد نے اقبال کو مایوس کیا تو اقبال کا یہ تلخ ردِ عمل فطری معلوم ہوتا ہے۔ سر معین نواز جنگ سے روایت ہے کہ: ’اکبر حیدری کو ہمیشہ اس کا ملال رہا کہ وہ اس غیر متوقع واقعے کی صفائی اور تلافی نہ کر سکے.....‘<sup>۴۴</sup> سرائیکبر حیدری کا یہ ملال بھی فطری تھا۔ اس کا سبب، علامہ اقبال سے ان کا وہ تعلقِ خاطر تھا جس کا آغاز، ۱۹۱۰ء میں، علامہ کے پہلے دورہ دکن کے موقع پر ہوا تھا۔ یہ تعلقِ خاطر نشیب و فراز کا شکار رہا۔ سرائیکبر، سرائیکبر کی خاطر بعض امور میں بہت آگے جانے میں بوجہ متماثل رہے۔ ممکن ہے اس میں سرائیکبر کی بعض قرار واقعی مجبوریوں کو بھی دخل ہو مگر سرائیکبر کے متماثل اور ان کی سردمہری نے باہمی تعلقات کو بہر حال متاثر کیا۔

وفات سے تین چار ہفتے پہلے، سرائیکبر نے اقبال سے کچھ اشعار کی فرمائش کی۔ اقبال نے اشعار، براہ راست سرائیکبر کو بھیجنے کے بجائے ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کی وساطت سے روانہ کیے۔ غالباً اس لیے کہ انھیں اپنے اور سرائیکبر کے درمیان حائل شدہ حجاب کا خوب احساس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر قریشی نے اقبال سے متعلق کسی مسئلے پر سرائیکبر سے گفتگو کی تو اقبال نے اسے پسند نہیں کیا۔ وفات سے تین ہفتے پہلے ڈاکٹر قریشی کو لکھتے ہیں:

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے حیدرآباد کی طرف سے میرے اعتراض کیے جانے کے متعلق حیدری صاحب سے ذکر کیا، شاید آپ کو سارے حالات کا علم نہیں۔ اس وجہ سے آپ نے اُن سے ذکر کیا، ورنہ حالات اس قسم کے ہیں کہ حیدری صاحب سے اس بات کا ذکر کرنا، نامناسب ہے۔ آئندہ احتیاط رکھنا چاہیے۔<sup>۴۵</sup>

اس اقتباس میں ایک جملہ ”آپ کو سارے حالات کا علم نہیں“ معنی خیز ہے۔ حالات کی تفصیل کا کسی کو بھی علم نہیں لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہی ”حالات“ (جو بھی تھے) علامہ کے لیے رنج و ملال اور تکتد رکاب کا باعث ہوئے اور دونوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو گیا۔ علامہ اقبال نے سرائیکبر کو ”ایک کمزور آدمی“ قرار دیا تھا<sup>۴۶</sup> مگر انھوں نے اپنی ”کمزوریوں“ کے باوجود، علامہ اقبال سے اپنے تعلق خاطر کو اقبال کی وفات تک برقرار اور قائم رکھا۔



اوپر کی سطور میں معین نواز جنگ کے حوالے سے سرائیکبر کے ملال کا ذکر آیا ہے، اقبال کی وفات کے بعد، ممکن ہے اسی ملال کو مٹانے کے لیے سرائیکبر نے خانوادہ اقبال سے اپنا ہمدردانہ برتاؤ جاری رکھا ہو۔ آفتاب اقبال نے، ان سے کئی بار مالی اعانت حاصل کی۔ اس طرح اقبال کی پہلی بیوی (والدہ آفتاب اقبال) کے لیے ریاست سے پچاس روپے اور غالباً ان کے دونوں بچوں کے لیے بھی پچاس پچاس روپے کے وظائف جاری ہوئے۔<sup>۴۷</sup> ان وظائف میں یقیناً اکبر حیدری کا ایما اور ان کی دلچسپی شامل ہوگی۔ اس دلچسپی

کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مزارِ اقبال کا جو نقشہ یا تعمیری خاکہ ریاست حیدرآباد کے ماہر تعمیرات نواب زین یار جنگ نے تیار کیا تھا اس کی تیاری میں بھی سرائیکبر حیدری کا مشورہ اور ہدایات شامل تھیں۔<sup>۴۸</sup>

علامہ اقبال اور اکبر حیدری کے باہمی تعلقات کے باب میں، بعض حیدرآبادی مصتفین نے جاوید نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار کا انتساب اکبر حیدری کی جانب کیا ہے:

کے شبِ ہندوستان آید بروز      مُردِ جعفر، روحِ او زندہ ہنوز  
تا ز قیدِ یک بدنِ وامی رہد      آشیاں اندر تنِ دیگر نہد  
گاہ او را بالکیسا ساز باز      گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز

دینِ او، آئینِ او سوداگری است

عستری اندر لباسِ حیدری است<sup>۴۹</sup>

نظر حیدرآبادی نے براہِ راست نواب بہادر یار جنگ سے روایت کی ہے کہ نواب صاحب کے اس استفسار پر کہ یہاں ”حیدری“ کا اشارہ اکبر حیدری کی طرف تو نہیں ہے؟ اقبال نے نواب صاحب کو لکھا: ”میں خوش ہوں کہ آپ میرا کلام اتنے غور سے پڑھتے ہیں“۔<sup>۵۰</sup> عبدالواحد معینی نے اسی بات کو اپنی دو تحریروں میں، دو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، لہٰذا مگر کیا ان اشعار کا مصداق واقعی سرائیکبر حیدری تھے؟ ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں سخت تاثر ملتا ہے۔

نواب بہادر یار جنگ کی متذکرہ بالا روایت کے سوا، اقبال کے کسی شارح (بشمول یوسف سلیم چشتی) کے ہاں ایسا کوئی ذکر یا اشارہ نہیں ملتا کہ ”عستری اندر لباسِ حیدری است“ میں اقبال نے اکبر حیدری کی مذمت کی ہے۔ مزید برآں، بے شک اقبال اور اکبر حیدری کے تعلقات میں خاصا تکرر پیدا ہو گیا تھا اور اقبال سرائیکبر سے مایوس ہو گئے تھے لیکن اُن جیسے مرنجانِ مرغ اور وضعِ دارِ شخص سے بعید ہے کہ وہ سرائیکبر سے اتنی نفرت کرنے لگے ہوں کہ انھیں جعفر و صادق اور عستری کی صف میں شامل کر لیں۔

## حوالے اور حواشی

- ۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد عبداللہ قریشی کا مضمون: ”نواب سر ذوالفقار علی خاں“، مشمولہ: معاصرین، اقبال کی نظر میں۔ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء۔
- ۲- نظر حیدر آبادی کہتے ہیں کہ ۱۹۱۰ء سے لے کر گول میز کانفرنس تک، دونوں کے درمیان غلط فہمیوں یا شکوک و شبہات کی کوئی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ (اقبال اور حیدر آباد: نظر حیدر آبادی۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱۱) ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں، جیسا کہ زیر نظر مقالے میں آگے چل کر اصل صورت حال کی وضاحت کی گئی ہے۔
- ۳- روز گار فقیر، جلد دوم، تصویر نمبر ۳ (اس تصویر کے ساتھ ”دہلی“ درج ہے۔ میرے خیال میں شاید یہ تصویر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس یکم تا ۳ اپریل ۱۹۰۴ء منعقدہ لاہور کی ہے جس میں، تصویر میں موجود تمام اکابر، مولانا حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، حکیم اجمل خاں اور سر عبدالقادر وغیرہ شریک تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
- ۴- اقبال اور حیدر آباد: سید شکیل احمد۔ الکتب حیدرآباد دکن، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۔
- ۵- مخزن: لاہور، جون ۱۹۱۰ء، بہ حوالہ: مکاتیب بنام گرامی، ص ۹۲، نیز: Iqbal: عطیہ بیگم۔ آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۶۰-۶۱۔
- ۶- نواب مشتاق احمد خاں کا مکتوب مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۸۹ء، بنام رفیع الدین ہاشمی۔ (غیر مطبوعہ)
- ۷- مکاتیب بنام گرامی، ص ۹۹۔
- ۸- ایضاً، ص ۱۰۲۔
- ۹- ایضاً، ص ۱۱۳۔
- ۱۰- ایضاً، ص ۱۱۲، نیز: اقبال بنام شاد، ص ۲۲۵، ۲۳۴۔
- ۱۱- مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۱۴۔
- ۱۲- اقبال بنام شاد، ص ۲۲۵۔
- ۱۳- مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۳۲۔
- ۱۴- اقبال بنام شاد، ص ۲۳۴۔
- ۱۵- مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۳۷۔
- ۱۶- ایضاً

- ۱۷- ایضاً
- ۱۸- اقبال بنام شاد، ص ۲۳۷۔
- ۱۹- مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۳۹۔
- ۲۰- تفصیل کے لیے دیکھیے، نقش اقبال: عبدالواحد معینی۔ آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۶۵-۸۲۔
- ۲۱- اقبال اور حیدر آباد: سیدنگیل احمد، ص ۲۰۔
- ۲۲- نظر حیدر آبادی نے اپنی کتاب اقبال اور حیدر آباد میں لکھا ہے کہ متعدد حیدر آبادی احباب، مثلاً عبداللہ المسدوسی اور محمد احمد خاں وغیرہ نے بھی اس روایت کی تصدیق کی ہے (ص ۱۹، ۲۰)۔ بعض دیگر اصحاب نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے، مثلاً: محمد احمد خاں (ارمغانِ دکن، کراچی، ص ۲۷-۲۸) اور عبدالواحد معینی (نقش اقبال، ص ۲۷)۔
- محمد احمد خاں کی روایت کے مطابق متذکرہ ملاقات لاہور میں ہوئی لیکن نہیں معلوم اس کی سند کیا ہے۔ متعدد دیگر اصحاب کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق یہ ملاقات دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے ”روزنامچے“ میں تصدیق کی ہے کہ یہ ملاقات ۱۳ مارچ ۱۹۳۳ء کو بجے دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہوئی اور وہ اس موقع پر بھی بہادر یار جنگ کے ہمراہ، علامہ سے ملنے گئے تھے (بحوالہ: اوداقِ گم گشتہ، مرتب: رحیم بخش شاہین۔ اسلامک سہلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷-۲۸)
- ۲۳- سفر نامہ اقبال، مرتب: محمد حمزہ فاروقی۔ مکتبہ معیار کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۸۶۔
- ۲۴- تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال، نئی تحقیق: سیدنگیل احمد۔ اقبال اکیڈمی حیدر آباد دکن، ۱۹۸۵ء، ص ۲۹ تا ۳۸۔
- ۲۵- بحوالہ: اقبال نامے، مرتب: ڈاکٹر اخلاق اثر۔ طارق پبلی کیشنز، بھوپال، ۱۹۹۰ء، ص ۲۲۔
- ۲۶- اقبال، نئی تحقیق، ص ۲۰۔
- ۲۷- اکبر حیدری نے علامہ کو لکھا تھا کہ میں آپ کے خطوط جمع کر رہا ہوں۔ (خطوطِ اقبال، ص ۲۷)
- ۲۸- اقبال اور عبدالحق، مرتب: ڈاکٹر ممتاز حسن۔ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۵۰۔
- ۲۹- نواب مشتاق احمد خاں نے راقم کے بعض استفسارات کے جواب میں لکھا: ”سراکبر حیدری لادینی (secular) ذہن رکھتے تھے۔ ملی تحریکوں سے دور ہی نہیں، بلکہ ان کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں سے نا بلد تھے۔ وہ ان کا کلام نہیں پڑھ سکتے تھے“۔ (غیر مطبوعہ مکتوب مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۸۹ء)۔
- ۳۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال، نئی تحقیق، ص ۲۳-۵۷۔

۳۱- سر اکبر خوب سمجھتے تھے کہ: ”علامہ اقبال کا پیغام طاقت و قوت کا پیام ہے“ (ارمغانِ دکن، ص ۴۷) اور وہ دین و سیاست کی یکجائی کے قائل ہیں۔ انھیں خوب اندازہ تھا کہ ”عصانہ ہو تو کلیسیا ہے کار بے بنیاد“ کی تلقین کرنے والے شخص کے ساتھ گہرے تعلقات استوار کرنا، انگریزی حکومت کی نظر میں خود کو مشکوک بنانا تھا۔ ملی تحریکوں سے، اکبر حیدری (فقط اپنے سیکولر مزاج کی وجہ ہی سے نہیں بلکہ) انگریزوں کے خوف کی وجہ سے بھی دُور رہتے ہوں گے۔

۳۲- ایضاً، ص ۴۲۔

۳۳- ایضاً، ص ۴۱۔

۳۴- مثلاً ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال حیدرآباد گئے تو ریاست کے بعض وزیر اور عہدے دار، انھیں سرکاری مہمان بنانے یا سرکاری سطح پر ان کے استقبال کے حق میں نہیں تھے۔ پھر جب انھیں ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تو نظام دکن نے بھی دُبے لفظوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسی طرح ان کے وظیفے کی تجویز قبول نہیں کی گئی (دیکھیے: اقبال: نئی تحقیق، ص ۳۲۰-۳۳)۔ بعض اوقات حکومتی عہدے داروں کو اقبالیاتی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کیا جاتا۔ نواب مہدی یار جنگ کارویہ بھی مخالفانہ تھا، اگرچہ اقبال کی وفات کے بعد، وہ بھی اقبال کی مدح سرائی کرتے نظر آتے ہیں (اقبال اور حیدرآباد: سید نکلیل احمد، ص ۴۳)۔

۳۵- نظر حیدرآبادی، ص ۲۰۸۔

۳۶- ایضاً، ص ۲۰۔

۳۷- اقبال: نئی تحقیق، ص ۳۳-۳۴۔

۳۸- اقبال اور حیدرآباد: سید نکلیل احمد، ص ۵۴۔

۳۹- نواب مشتاق احمد خاں، حوالہ ۲۹۔

۴۰- اقبال: نئی تحقیق، ص ۵۳، نیز: اقبال اور حیدرآباد: سید نکلیل احمد، ص ۶۱۔

۴۱- اقبال: نئی تحقیق، ص ۴۱۔

۴۲- ”توشہ خانہ“ کی وضاحت کرتے ہوئے عبدالرؤف عروج لکھتے ہیں:

”یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حیدرآباد میں ”توشہ خانہ“ کی اصطلاح صرف خاص کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس سے بھی مطلب ہوتا تھا کہ یہ رقم نظام کی ذاتی آمدنی سے ہے لیکن اقبال کے عاقبت نائندیش حاشیہ نشینوں نے توشہ خانے کو خیرات خانے کے مترادف بنا دیا اور ان کے دل میں یہ بات جاگزیں کر دی کہ یہ رقم ان کو بطور خیرات دی ہے حالانکہ اس سے پہلے بھی یہ رقم آفتاب اقبال کی تعلیم اور ادارہ معارف اسلامیہ کے لیے اسی توشہ خانے سے دی گئی تھی اور اقبال کے حاشیہ نشینوں کو اس پر غور

علامہ اقبال اور سرائیکبر حیدری

کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سلسلے میں نواب معین نواز جنگ کا یہ بیان بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک ہندو ملکر کی غلطی کی وجہ سے توشہ خانے کی سلپ چیک کے ساتھ چلی گئی۔ (اقبال اور بزم اقبال، (حیدرآباد دکن): عبدالرؤف عروج۔ دارالادب کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۴۷)۔

کوئی ایک ماہ بعد ۳ فروری ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال نے ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کو خط میں لکھا: ”حیدری صاحب نے مجھ پر ایک مزید عنایت کی، اور وہ یہ کہ اقبال ڈے کے موقع پر حضور نظام کے توشہ خانے سے بھی ایک ہزار روپیہ عنایت فرمایا، مگر افسوس کہ میں اس عطیے کو قبول نہ کر سکا“۔ (انوار اقبال، ص ۱۳۲)

- ۴۳- ارمغانِ حجاز، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۶۹۰/۴۸۔
- ۴۴- نظر حیدرآبادی، ص ۲۱۴۔
- ۴۵- انوار اقبال، ص ۱۳۹۔
- ۴۶- مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۱۴۔
- ۴۷- اقبال اور حیدرآباد: سید شکیل احمد، ص ۶۲۔ نیز: اقبال، نفی تحقیق، ص ۵۸ تا ۵۶۔
- ۴۸- ارمغانِ دکن، ص ۴۷۔ نیز: مفکر پاکستان اور حیدرآباد دکن، محمد حسام الدین خاں غوری۔ دارالادب پاکستان کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۵۔
- ۴۹- جاوید نامہ، ص ۱۴۵۔
- ۵۰- نظر حیدرآبادی، ص ۲۰۹۔
- ۵۱- نقشِ اقبال، ص ۲۷۶-۲۷۷، اور ارمغانِ دکن، ص ۴۴۔
- ۵۲- جناب رشید حسن خاں (۱۹۲۵ء-۲۰۰۶ء) نے یہ مضمون پڑھ کر ۳۱ جولائی ۲۰۰۵ء کو راقم الحروف کے نام ایک خط میں لکھا: ”بھائی! حیدری صاحب والے معاملے میں، میں آپ سے متفق نہیں۔ یہ میری قطعی رائے ہے کہ ”حیدری“ سے اقبال کی مراد سرائیکبر حیدری ہی ہیں۔“ (مکاتیب رشید حسن خاں، بنام رفیع الدین ہاشمی: ارشد محمود ناشاد (مرتب)۔ ادبیات لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۲)
- (مجلہ خیابان، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء، نظر ثانی: فروری ۲۰۰۴ء)





## میر انیس اور علامہ اقبال

عموماً میر انیس اور علامہ اقبال کے درمیان کسی قسم کے اشتراک کا تصور کرنا مشکل ہے، تاہم بعض اہل نظر نے دونوں کے درمیان چند مماثلتیں قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

انیس اور اقبال کی شاعری کے میدان ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کے فکر و خیال شمس میں کسی مشترک عنصر کی موجودگی کا دعویٰ بظاہر بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو انیس اور اقبال کی شاعری میں ایک بہت بڑا نصب العینی اشتراک موجود ہے..... انیس اور اقبال دونوں اپنے اپنے مخصوص شاعرانہ مسلک کے پابند ہو کر بھی قاری تک ایک ہی بات پہنچانا چاہتے ہیں۔ دونوں عظمتِ آدم کے معترف ہیں۔ دونوں فقر، صداقت، عدل، شجاعت، سخاوت، رحم و کرم اور غیرت و خودداری کو انسانی کردار کی عظمت کی نشانیاں جانتے ہیں۔ یہ، دونوں کے نزدیک، سرمایہ شہیری ہے اور میراثِ مسلمانی بھی۔

انیس اور اقبال نے شبیر کے اس سرمایہ عزیز کو مسلمانوں کی کھوئی ہوئی دولت اور اس کی میراث سمجھ کر اُس تک پہنچانے کا بیڑا اس لیے اٹھایا ہے کہ دین داری کے جس ماحول میں ان دونوں عظیم شاعروں کی پرورش ہوئی، اس کا فطری تقاضا ہی یہ ہے!

وقار صاحب نے اپنے مقالے میں آگے چل کر انیس اور اقبال کے درمیان شاعرانہ فن کے بعض پہلوؤں، مثلاً: ڈرامائیت، تغزل، مخصوص بحروں کے انتخاب اور ردیفوں کی جھکاؤ، ترمیم، نغمگی اور صنائع بدائع کے استعمال میں اشتراک و یکسانیت اور

ہم آہنگی کا سراغ لگایا ہے۔

میرے خیال میں استاد محترم کی منقولہ بالا رائے محل نظر ہے۔ میرا نہیں اور اقبال کے تقابلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ دونوں کی شاعری ہی میں نہیں، ان کی شخصیتوں میں بھی بعد المشرقین ہے۔

مضفر شاعری کے چند پہلوؤں کو مماثلت یا اشتراک کی بنیاد بنایا جائے، تو صرف اقبال ہی نہیں، اردو کے بیسیوں شعرا کے ہاں میرا نہیں کے شاعرانہ فن کے متعدد عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے میرا نہیں اور اقبال کے درمیان اشتراک کی کوئی امتیازی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ جہاں تک ”نصب العینی اشتراک“ کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ سید الشہد حضرت امام حسینؑ، کربلا کے وہ ہیرو ہیں جن میں اقبال کے مرد مومن کی تمام صفات موجود ہیں، خصوصاً اقبال کے اس نوعیت کے اشعار:

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ع رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کا مصداق اُن سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ انھی کی شخصیت اور انھی کے وجود نے داستانِ حرم کو رنگینی بخشی ہے۔ انھوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شیریؑ بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

لیکن یہاں انیس اور اقبال کے درمیان فرق یہ ہے کہ میرا نہیں نے حضرت امام حسینؑ کے جو اوصاف بیان کیے ہیں، اُن کا انداز و لہجہ تمام تر بیانیہ ہے۔ امام حسینؑ کی یہ مبالغہ آمیز تعریف، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے بقول: ہماری فطرت میں اس محرک کو نہیں اُبھارتی، جو ہمیں اپنی اصلاح کی طرف لے جاتا ہے، بلکہ اس محرک کو اُبھارتی ہے، جو تعجب اور پرستش کی طرف رجوع کرتا ہے۔<sup>۲</sup>

اقبال کا لہجہ فکری اور انقلابی ہے اور اقبال کے مردِ مومن کا تصور، انسانِ کامل کی محض ایک خوب صورت تصویر یا اس کے اوصاف کا مجزّد بیان ہی نہیں، بلکہ ایک دعوتِ انقلاب اور اصلاح کی ایک پُر جوش پکار بھی ہے، جو ہمیں مردِ مومن کی کش مکش انقلاب میں شریک ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔

نصب العینی اشتراک کی بات یوں بھی درست نہیں کہ انیس کی شاعری کا مقصد ”مدّاحی شبیر“ کے آبائی فریضے کی انجام دہی تھا: ع  
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں ۳

اور :

جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو

پھر انیس جس ماحول کے پروردہ تھے، اس میں امام حسینؑ کی شہادت اور سانحہ کربلا پر رونا، تو شہ آخرت سمجھا جاتا تھا۔ گویا انیس کی مرثیہ گوئی کا دوسرا بڑا (اور بنیادی) محرک ان کا تصورِ مذہب تھا۔ انیس نے اپنی مرثیہ گوئی کے اس مقصد کو جگہ جگہ بیان کیا ہے: ع  
نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب!

ع : مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے، جدا

عابد علی عابد کے بقول: ”مرثیے کی کامیابی انیس، دبیر اور دوسرے مرثیہ گو شعرا کی نظر میں یہ ہے کہ بین سے پہلے لوگ واہ واہ کریں اور ماتم داری کے وقت شور و گریہ وزاری پیا ہو،“ گویا مرثیہ نگار کا مقصد رونا رُلانا اور سامعین کو گریہ و بکا پر مائل کرنا ہے اور مرثیے کے مختلف حصے، حصولِ مقصد میں معاون ہوتے ہیں چنانچہ منظر نگاری، جذبات نگاری اور مرقع نگاری وغیرہ میں میر انیس کی کامیابی، اسی مقصد کی مرہونِ منت ہے۔ میر انیس کے ہاں رونے رُلانے کے اس مقصد کو اس قدر فوقیت حاصل ہے کہ وہ مبالغے اور روایات و واقعات میں تحریف سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے الفاظ میں:

”یہ ادب برائے مجلس ہے اور مجلسیوں کی زندگی کے عناصر کی طرف اشارے اس لیے ضروری تھے کہ مجلس کی علتِ غائی، یعنی گریہ و زاری حاصل ہو۔“<sup>۱</sup>

اس کے برعکس اقبال کی شاعری کا مقصد اُمتِ مسلمہ کو جگانا اور اس بڑے انقلاب کے لیے تیار کرنا ہے جس کے بغیر حیات و کائنات میں وہ اپنا کھویا ہوا مقام نہیں پاسکتی۔ اقبال کی شاعری میر انیس کے ”ادب برائے مجلس“ کے مقابلے میں ”ادب برائے زندگی“ ہے۔ میر انیس کی شاعری کا جو مقصد تھا، وہ پورا ہوا، یعنی مرثیہ انیس کو سن کر لوگ سر دھنتے رہے اور آہ و بکا بھی کرتے رہے۔ لکھنؤ کے خوش مزاج اس اعتبار سے بے نصیب رہے کہ وہ مرثیے کے مثالی کرداروں سے رونے کے سوا کچھ بھی حاصل نہ کر سکے اور یہی انیس کا مقصد بھی تھا۔ اقبال کی شاعری نے مسلمانوں کو صرف جگایا ہی نہیں، زندگی کی انقلابی جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی اور قاری کو اُس کے لیے تیار بھی کیا۔ مرثیہ انیس کے مقاصد دورِ انیس تک محدود رہے اور اسی لیے اس کے مستقبل کے امکانات ختم ہو گئے، مگر شعرِ اقبال کے مقاصد ہمہ گیر ہیں اور اسی لیے اس کے امکانات غیر ختم ہیں۔ یہ مقاصد کسی مخصوص ماحول کے پابند تھے، نہ دورِ اقبال کے ساتھ مخصوص۔

مذہب کو انیس اور اقبال کے درمیان نصب العینِ اشتراک کا بڑا سبب قرار دیا جاسکتا ہے، مگر بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ انیس کا تصورِ مذہب محدود ہے اور اس میں رونا رُلانا ہی حصولِ ثواب کا گُر اور آخرت میں کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس اقبال کے تصورِ مذہب میں حصولِ ثواب کا انحصار، حیات و کائنات کی متحارب قوتوں کی کش مکش میں براہِ راست شرکت پر ہے۔ یوں انیس اور اقبال کے نصب العین میں اتنی خلیجِ حائل ہے کہ کسی طرح بھی دونوں کو ہم آہنگ و مماثل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تاہم میر انیس اور اقبال کے درمیان فکری اور فنی لحاظ سے مشترک اور مماثل پہلوؤں کی تلاش کی نشان دہی کیے بغیر بھی ان کا تقابلی مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔

درحقیقت میر انیس اور اقبال کی شاعری میں بُعد و اختلاف کا بنیادی سبب دو عظیم شخصیتوں کے مزاج کا فرق ہے۔ انیس کو شاعری ورثے میں ملی، مگر اقبال کے لیے اُن

کے آبا و اجداد نے ایسی کوئی روایت نہیں چھوڑی۔ میر انیس کو مرثیے کا بنا بنایا سانچا مل گیا اور وہ ماحول اور فضا بھی، جو مرثیے کے پنپنے کے لیے سازگار تھی، جب کہ اقبال کی شاعری کا رنگ و آہنگ بالکل نیا تھا، جس کے لیے انھیں کسی روایت کی عدم موجودگی کے سبب، محض اپنے شعر کے زور اور تخلیقی قوت کے اعجاز سے ماحول کو سازگار بنانا پڑا، گویا انیس نے بازار کی ”طلب“ کے مطابق بلند معیار کی ”رسد“ بہم پہنچائی، جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اقبال کے تخلیقی ذہن نے اپنی اپج کی بدولت بالکل ہی انوکھی ”رسد“ پیش کی، جس میں جدت و ندرت سوا تھی، اور معیار ایسا بلند کہ ہر طرف سے از خود اس کی ”طلب“ ہونے لگی۔ انیس کو اُن کے والدِ محترم نے غزل گوئی سے منع کر کے ان کی صلاحیتوں کا رُخ مرثیہ گوئی کی طرف موڑ دیا جب کہ اقبال زمانے کے اقتضا سے، ایک عرصے تک، روایتی غزل کے راستے پر چلتے رہے۔ میر انیس کی مرثیہ گوئی کا بڑا انحصار اُن کی مرثیہ خوانی پر تھا۔ مرثیہ پڑھنے کے لیے انھیں ایسی مجالس میسر تھیں جن کے سامعین خوش ذوقی اور طبع سلیم سے مالا مال تھے اور مرثیے کی ادبی خوبیوں سے کما حقہ، واقف، چنانچہ بقول عابد علی عابد:

[مرثیہ نگار] مرثیہ لکھنے اور پڑھنے میں وہ نئی نئی خصوصیتیں پیدا کر کے کمالِ فن تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا اور سامعین شورِ خمین یا صدائے گریہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ اس طرح ایک خاص قسم کی فضا، جو جذبات کو براہِ چہنہ کرنے کے سلسلے میں بغایت مؤثر ہوتی تھی، پیدا ہو جاتی تھی۔ مرثیوں کے مخفی جوہر چمک اُٹھتے، اور جو بجلیاں الفاظ میں خوابیدہ ہوتی تھیں، وہ باذوق سامعین کے سامنے چمکنے لگتی تھیں۔

مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں سامعین کی اس اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کی ایک مجلس میں میر انیس مرثیے کے بارہ بند پڑھ چکے تو خیال گزرا کہ سامعین پوری طرح متوجہ نہیں ہیں۔ بے دل ہو کر حاضرین پر ایک نظر ڈالی، مرثیہ توڑ کر زانو پر رکھا اور ایک حسرت ناک آواز سے کہا: ”ہاے لکھنؤ! تجھے کہاں سے لاؤں“۔ پھر ناسازی طبع کا بہانہ کر کے منبر سے اتر آئے۔<sup>۵</sup>

اقبال کو شعر گوئی یا شعر خوانی کے لیے سامعین اس وسیع اور منظم پیمانے پر میسر نہ

تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے بعض جلسوں میں انھوں نے چند نظمیں سنائیں، مگر ان کی نظم گوئی، مجالس شعر یا سامعین کی مرہونِ منت نہ تھی، بلکہ بسا اوقات وہ فرمائش پر شعر سنانے سے انکار کر دیتے تھے۔

انیس کے دور میں لکھنؤ ایک مخصوص اور متعین ڈگر پر چل رہا تھا۔ زندگی میں بے ترتیبی اور الجھنیں پیدا نہ ہوئی تھیں۔ اگرچہ مسلمانانِ ہند کی عظمت و شوکت رو بہ زوال تھی مگر لکھنؤ میں اس کا کچھ ایسا گہرا احساس موجود نہ تھا۔ اقبال کے دور میں فرد، فکری اور تہذیبی انتشار اور افراتفری کا شکار ہو چکا تھا، آزادی کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں، سیاسی سطح پر ہنگامہ خیزی راہ پانے لگی تھی۔ یوں دورِ اقبال کو نسبتاً نئے، پیچیدہ اور مشکل مسائل درپیش تھے۔ یہ سارے پہلو میر انیس کے لیے بہت سود مند اور اقبال کے لیے چنداں فائدہ مند نہ تھے۔ میر انیس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور کامیاب رہے، مگر اقبال بھی، باوجود ”ناسازگاری حالات“ کے، ناکام نہیں رہے۔ اپنی شاعرانہ شخصیت اور قوتِ تخلیق کے زور سے انھوں نے بھی اپنے افکار کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ انیس نے مرثیہ گوئی اختیار کرنے میں ایک مخصوص ماحول کے تقاضوں کا خیال رکھا، پھر اپنے مرثیے کو بہتر اور موثر بنانے کے لیے انھوں نے مذہبی روایات اور کرداروں میں جو تحریف کی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا، اس کا سبب بھی یہی زمانے کا اقتضا تھا۔ عابد علی عابد کے بقول: ”انیس نے اواخرِ عمر میں جو مرثیے کہے، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا سفر سلاست سے رنگین نفاست کی طرف اور فصاحت سے بلاغت کی طرف ہے، کہ لکھنؤ کا مذاق اس کا تقاضا کرتا تھا“۔<sup>۹</sup>

اقبال نے اپنے عہد کے اس نوع کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی طبیعت کے محتسب رجحانات نے انھیں خوب تر کی جستجو میں ہمیشہ مصروف اور سرگرم سفر رکھا۔

اب ذرا ایک دوسرے زاویہ نظر سے انیس اور اقبال کو دیکھیے۔ انیس ایک مخصوص و محدود ماحول کے پروردہ تھے۔ انیس کی نظر میں جو کچھ تھا، بس لکھنؤ ہی تھا۔ شاہانِ اودھ نے اپنے آبا و اجداد کی دولت کے بل بوتے پر اپنے عشرت کدے آباد کر رکھے تھے۔

اقبال کو نسبتاً ایک وسیع ماحول ملا۔ پنجابی ماحول اور علاقائی پس منظر میں انھیں دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک اور وہاں کے معاشرے میں کچھ عرصہ گزارنے کا موقع ملا، جس نے اُن کے فکرو فن اور شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے۔ میر انیس نے ایک محدود ماحول میں تعلیم و پرورش پائی جب کہ اقبال کی تعلیم ایک وسیع اور بہتر ماحول میں ہوئی اور انھیں زیادہ قابل اور عالم فاضل اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

میر انیس کے سامنے فنی اعتبار سے شاعری کا ایک ہی مخصوص سانچا تھا، انھیں ہر بار ایک ہی صنف اور ایک ہی ہیئت کے سانچے میں نیا انداز اور نیا لہجہ پیدا کرنا پڑا، جب کہ اقبال کے لیے کسی مخصوص سانچے کی پابندی لازم نہ تھی۔ انھیں ہر ہیئت اور ہر صنف میں شعر کہنے کی آزادی تھی۔ یہ صورت حال اقبال کے لیے مفید ثابت ہوئی، اور اگر اس کے نتائج و اثرات ہمیں اقبال کی شاعری میں نظر آتے ہیں تو وہ بے جا نہیں۔ صورت حال کا یہی تقاضا تھا، جس کی تکمیل میں اقبال نے کمال فن کا ثبوت دیا۔ میر انیس اور اقبال کے تقابلی مطالعے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شعر انیس کی بعض خامیاں ایک خاص ماحول اور ایک خاص دور کی پیداوار ہیں اور اقبال کی شاعری کی بعض خوبیوں میں ان کی شخصیت کے علاوہ اُن کے زمانے کو بھی دخل ہے۔

میر انیس فقط ایک شاعر تھے، لیکن اقبال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی اور مفکر بھی تھے۔ میر انیس کے ہاں مثالی کردار ہیں اور مثالی خاندانی روابط کا نمونہ بھی۔ اُن کے مرثیے انسان کو رُلاتے ضرور ہیں، مگر ان سے جذبات میں اس طرح ہلچل پیدا نہیں ہوتی جیسے شعر اقبال کا عطا کردہ جذبہ عشق انسان کو پُر لگا کر اڑاتا ہے۔ میر انیس کی اخلاقیات بیانیہ شاعری کا عمدہ ادب ہے، اور شعر اقبال کی اخلاقیات ایک مفکر کے مکمل اور مربوط نظام فکر کا جز ہے۔ انیس کے مرثیوں میں تاثیر ضرور ہے، مگر رونے کی حد تک، اقبال کی تاثیر رُلاتی نہیں، بلکہ ”ولولہ تازہ“ عطا کرتی ہے۔

ان خیالات سے مرثیہ انیس کی اہمیت کو گھٹانا مقصود نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ اقبال نے مرثیے کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا ہے۔ ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو سراج الدین پال

کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے، ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین --- اس ترک دنیا کے پردے میں تو میں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو، جو ان کی تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔<sup>۱</sup>

بعض نقادوں کے نزدیک میر انیس کی یہ عطا کسی طرح کم تر قرار نہیں دی جاسکتی کہ انھوں نے زوال پذیر دور میں مسلمانوں کے سامنے ایسے کرداروں کو پیش کیا، جو حق گوئی، حق پرستی، راست روی اور حسن اخلاق میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے تابناک ماضی کی زندہ روایات کو نظم کا حسین و جمیل پیکر عطا کیا۔ مرثیے میں ان کی فصاحت و بلاغت، مرصع کاری اور قدرت بیان، اوج کمال پر ہے۔ اُردو شاعری میں اُن کا درجہ بہت بلند ہے اور ان کے مرثیے ان کی فنی انفرادیت کے ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے تابناک ماضی کی زندہ روایات کو منظوم کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان روایات کی بنیاد پر ایک ذہنی تحریک کو جنم دیا، جس کے نزدیک ماضی سے زیادہ حال اور حال سے بھی زیادہ مستقبل کی منزل اہم ہے۔ یہ منزل آسان ہو جائے تو دنیا ہی نہیں، عاقبت بھی سنور جائے گی۔

میر انیس اور اقبال کے تقابلی مطالعے میں یہ بات خاص طور پر اہم ہے کہ مراٹھی انیس کی فضا، ماحول اور کرداروں پر گہری ہندستانی چھاپ اور لکھنؤ کا پرتو بہت واضح ہے۔ حضرت امام حسینؑ، آپ کے اعزہ اور دیگر رفقا کے خالص عربی کردار، نہ صرف عجمی بلکہ ہندی نظر آتے ہیں، اس کے برعکس اقبال کا انداز فکر ہی نہیں، اس کا طرز بیان بھی صاف عثمناز ہے کہ وہ ہر شے کو عربیت کے رنگ میں رنگنے (Arabicizing) کی کوشش میں مصروف ہے۔

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری



اقبال کو بیسویں صدی کے اندلسی باشندوں کی رگوں میں بھی عربی خون گردش کرتا نظر آتا ہے، اُسے یورپ کی ہواؤں میں ”بوے یمن“ کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور اس کی نواؤں میں ”رنگِ حجازی“ کا نغمہ سنائی دیتا ہے، حتیٰ کہ ”کافرِ ہندی“ کی زبان پر بھی درود و صلوة جاری ہے۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اقبال کی شاعری back to Arabia کی پُرسوز پکار ہی نہیں، ”رجعتے سوے عرب“ کی باقاعدہ دعوت، بلکہ ہدایت بھی ہے۔ گویا میر انیس کا سفر ”عربیت“ سے ”ہندیت“ کی طرف ہے اور اقبال کا ”ہندیت“ سے ”عربیت“ کی طرف، اور یہ چیز میر انیس اور اقبال کے مزاج کے اختلاف، بلکہ تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ تمثیل کی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ دو مسافر، جو مختلف سمتوں میں سرگرم سفر ہیں، راستے میں کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کو ”کراس“ (cross) بھی کرتے ہیں، اور یہ مقام ان کے تمام تر تضاد کے باوجود ان کا ایک نقطہٴ اتصال پیش کرتا ہے۔ بس ایسا ہی ایک اتصال میر انیس اور علامہ اقبال کے ہاں بھی ہے۔

### حوالے اور حواشی

- ۱- اقبالیات کا مطالعہ، پروفیسر سید وقار عظیم (مرتب: ڈاکٹر سید معین الرحمن)۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۷۱، ۲۷۶۔
- ۲- مرثیہ نگاری اور میر انیس، اردو اکیڈمی لاہور، ص ۵۵۔
- ۳- یہ مصرع اُس مرثیہ کا ہے جو میر انیس نے اپنے صاحبزادے میر عسکری رئیس کو کہہ کر دیا تھا، اسی لیے پانچویں پشت کہا ہے، ورنہ انیس تک پانچ نہیں، چار پشتیں بنتی ہیں (رئیس، انیس، خلیق، حسن، ضاحک)۔ بعد میں معلوم ہو گیا کہ یہ مرثیہ انیس کا ہے۔ انیس نے بعض مصرعوں میں ترمیم کر دی مگر یہ مصرع زبانِ زودعام ہو چکا تھا، اس لیے اصل حالت میں رہنے دیا (معمود حسن رضوی ادیب: روح انیس۔ لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ۲۰۱)
- ۴- رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں: ”خلقِ خدا ماتم حسین میں روتی ہے۔ لاکھوں رویا اس راہ میں صرف

ہوتا ہے۔ چالیس شب نہیں سوتا ہے۔ تخم عمل نیک، مزرعہ آخرت میں پوتا ہے۔ (فسانہ عجائب،

مرتب: رشید حسن خاں۔ ادارہ نقوش لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۱)۔

۵- [مقدمہ]: موازنہ انیس و دبیر: مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۶-۱۷۔

۶- مرثیہ نگاری اور میر انیس، ص ۸۱۔

۷- [مقدمہ]: موازنہ انیس و دبیر، ص ۸۔

۸- ایضاً۔

۹- ایضاً، ص ۹۔

۱۰- اقبال نامہ، اول، ص ۴۴-۴۵۔

(مجلد خیابان، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی۔ میر انیس نمبر، دسمبر ۱۹۷۴ء۔ تجدید نظر: اکتوبر ۲۰۰۲ء)

## خطباتِ اقبال

(تفہیم، رجحانات، معنویت)

علامہ اقبال نے ۲۹-۱۹۲۸ء میں اپنے معروف انگریزی خطبات: مدراس، بنگلور، میسور، حیدرآباد دکن اور علی گڑھ کے علمی اور عوامی جلسوں میں پیش کیے۔ اگلے برس، یعنی ۱۹۳۰ء میں یہ Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیے گئے۔ دوسرے ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں مزید ایک خطبے کا اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں ایک شاعر، مفکر اور قومی وطنی رہنما کی حیثیت سے اقبال کی شہرت بام عروج پر تھی۔

۱

مذکورہ خطبات ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول ”حضرت علامہ کا فکری شاہکار تھے“۔<sup>۱</sup> بشیر احمد ڈار کے مطابق، امیر ٹکیب ارسلان اور بعض دوسرے اکابر کے خیال میں، ان خطبات کے حوالے سے، گذشتہ دو سو سال میں کوئی مسلم اسکالر، اقبال کا ہم پلا نظر نہیں آتا۔<sup>۲</sup> اسی طرح ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے خطبات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

ڈاکٹر اقبال کو اسلام اور جدید فلسفہ و سائنس کے اصولوں کی جو گہری بصیرت حاصل ہے،

ان کے مالہ، و ماعلیہ کے بارے میں انھیں جیسی تازہ ترین اور وسیع معلومات حاصل ہیں، ایک جدید نظام فکر تعمیر کرنے کی جیسی مہارت اور استعداد انھیں میسر ہے، بہ الفاظِ دیگر فلسفے اور اسلام کو ہم آہنگ کرنے اور تطبیق دینے کی جیسی بے مثل لیاقت ان میں پائی جاتی ہے، اس نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ اس کام کو دوبارہ انجام دیں، جو صدیوں پہلے یونانی فلسفہ و سائنس کے روبرو ہمارے عظیم علما، مثلاً: نظام اور (ابوالحسن) اشعری نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اپنے ان خطبات میں انھوں نے ہمارے لیے ایک جدید علم کلام کی نیور کھ دی ہے۔<sup>۱۷</sup>

ڈاکٹر سید ظفر الحسن، علامہ اقبال کے دیرینہ مداح تھے۔ انھی کے ایما اور ترغیب پر ان کے دو شاگردوں نے خطبات پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا۔ عشرت حسن انور کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ *The Metaphysics of Iqbal* چھپ چکا ہے،<sup>۱۸</sup> اور برہان احمد فاروقی کا مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے،<sup>۱۹</sup> مگر اس کے سوا، اشاعت کے ساہا سال (قریب قریب نصف صدی) بعد تک، خطبات کی جانب کوئی خاص اعتنا نہیں ہوا، خصوصاً بر عظیم کے علمی، فکری اور تعلیمی حلقوں میں ان کی کوئی خاص پذیرائی نظر نہیں آتی ہے۔

خطبات کی اشاعت (۵ مئی ۱۹۳۰ء) کے فوراً بعد روزنامہ انقلاب (۱۵ مئی ۱۹۳۰ء) میں 'ایک مبصر' کے قلم سے تشکیلی جدید الہیاتِ اسلامیہ پر ایک مضمون شائع ہوا، اس سے ایک دلچسپ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

بہتر تو یہی تھا کہ انگریزی اور اردو مجلّات ایک ہی وقت میں طبع ہوتیں، بلکہ کوئی ایسا انتظام ہوتا کہ اس انقلاب انگیز تصنیف کے تراجم، تمام اسلامی ممالک کی مختلف زبانوں میں، بیک وقت شائع ہوتے، لیکن اس قسم کے اہتمام کی توفیق، مسلمان افراد تو درکنار، آج تمام اسلامی اقوام کو نصیب نہیں۔ اسی کتاب، بلکہ اس سے کسی کم درجے کی تصنیف کا مالک اگر سر آئیور لاج یا برنارڈ شایا ایچ جی ویلز یا برگساں یا آئن سٹائن کی قوم سے ہوتا تو کتاب کا کم از کم نصف حصہ مضمون، اب تک خلاصوں اور تبصروں کی شکل میں بذریعہ تار برقی، دنیا جہان کے اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکا ہوتا۔ دنیا کے ہر مشہور روزنامے اور ہفتہ وار اخبار میں مصنف کی تصویر چھپ جاتی اور دوسری بلکہ تیسری ایڈیشن ایک ہی ہفتے یا پندرہ روز کے اندر نکلنے والی

ہوتی، مگر یہاں مصنف اقبال ہے اور اس کی قوم مسلمان۔<sup>۵</sup>

بظاہر تو یہ، خطبات سے، برّ عظیم کے تعلیم یافتہ طبقے کی عدم دلچسپی کا شکوہ ہے، مگر مطالعہ خطبات کی جانب یہ ایک ترغیب بھی ہے۔ دو سال بعد سید نذیر نیازی نے بھی اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا: 'سب سے بڑھ کر یہ فرض مسلمانوں کا ہے کہ وہ اس کے مطالب پر غور کریں اور حضرت علامہ کے ان ارشادات سے مستفیض ہونے کی کوشش کریں، جو ان کے تمدنی ارتقا میں، بجا طور پر، ان کی رہبری کا حق ادا کر سکتے ہیں۔'<sup>۶</sup>

خود نذیر نیازی نے خطبات کا جو اردو ترجمہ تیار کیا، اس کی اشاعت، علامہ اقبال کی وفات کے بیس برس بعد عمل میں آئی۔ (بہ عنوان: تشکیل جدید الھیاتِ اسلامیہ: بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۸ء) اور دوسرے اڈیشن کی نوبت ۲۵ برس بعد آئی۔ ڈاکٹر محمد حسن کو بجا طور پر یہ کہنے کا موقع ملا کہ: 'شاعر اقبال کو قبول عام ملا، مگر ان کے سات خطبات کو آج تک پاکستان میں قبولیت ملی، نہ ہندستان میں۔' برّ عظیم کے ادبی و شعری اور فکری و سیاسی حلقوں میں علامہ اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت، اور ان کے عالمانہ خطبات کی ممتاز حیثیت کے پیش نظر، خطبات سے یہ بے اعتنائی اور بے نیازی بظاہر حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، لیکن اس صورتِ حال کا اصل سبب، مذکورہ خطبات کی وہ مشکلات ہیں، جن سے خطبات کے قارئین اور طلبہ کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

تشکیل جدید الھیاتِ اسلامیہ ایک مشکل کتاب ہے، کیونکہ اس میں مشرق و مغرب کے ڈیڑھ سو سے زائد قدیم و جدید فلسفیوں، سائنس دانوں، عالموں اور فقیہوں کے اقوال و نظریات کے حوالے دیے گئے ہیں اور اقبال، قاری سے توقع رکھتے ہیں کہ خطبات کے مطالعے سے پیشتر، وہ ان سب شخصیات کے زمانے، ماحول اور افکار سے شناسا ہوگا۔ ان شخصیات میں بعض تو معروف ہیں اور بعض غیر معروف۔ علاوہ اس کے، خطبات کا اندازِ تحریر نہایت پیچیدہ ہے۔ بسا اوقات کسی مقام پر ایک ہی بحث میں کئی مسائل کو اٹھایا گیا ہے یا ایک مسئلے پر جاری بحث کو اچانک چھوڑ کر کسی اور مسئلے کا ذکر چھڑ جاتا ہے اور اس پر اظہارِ خیال کی تکمیل کے بعد پھر چھوڑے ہوئے مسئلے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بعض نظریات کی وضاحت کی خاطر

نئی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اور ان میں الفاظ کی ترتیب، مطالب کے فہم و تفہیم کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ کئی مقامات پر انگریزی زبان میں استدلال ناقابل فہم ہے اور اس کے بار بار تعاقب کرنے سے بھی معانی صاف نہیں ہوتے۔<sup>۱۲</sup>

بلاشبہ نذیر نیازی مرحوم نے خطبات کے ترجمے میں حتی الوسع محنت و کاوش اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ بعض حصوں کا ترجمہ خود حضرت علامہ نے ملاحظہ فرمایا اور بعض الفاظ اور مصطلحات، حتیٰ کہ بعض عبارتوں تک کی اصلاح کی۔<sup>۱۳</sup> اسی طرح ترجمے کا ایک حصہ مولانا محمد السورقی اور سید عابد حسین مرحوم نے دیکھا۔<sup>۱۴</sup> مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محمد منور، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسے اکابر علم و ادب اور اقبال شناسوں نے اس ترجمے پر اطمینان ظاہر کیا۔<sup>۱۵</sup> نذیر نیازی نے ترجمے پر ایک سیر حاصل مقدمے، تصریحات اور مصطلحات کا اضافہ بھی کیا، اس کے باوجود خطبات کے بعض نکات و مباحث توضیح طلب تھے۔ بعض اصحاب اس ترجمے سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔<sup>۱۶</sup> استاد محترم پروفیسر سید وقار عظیم نے ۱۹۷۳ء کی ایک گفتگو میں بتایا تھا کہ مجلس ترقی ادب نے پروفیسر حمید احمد خاں کے زمانہ نظامت میں خطبات کے ایک نئے ترجمے کا منصوبہ تیار کیا، جس میں ہر خطبے کا ترجمہ الگ الگ مترجمین سے کرانے کا ارادہ تھا۔ (افسوس ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں کی ناگہاں رحلت کے سبب یہ منصوبہ بروے کار نہ آسکا)۔ نذیر نیازی کے ترجمے پر عدم اطمینان کے سبب ہی خطبات کے مزید اردو تراجم کی کاوشیں ہوئیں۔<sup>۱۷</sup>

ذکر تھا خطبات کی مشکلات کا، اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

یہ کتاب جتنی مقبول ہے، اتنی ہی مشکل اور دقیق بھی ہے۔ اس کتاب کی مشکلات کئی طرح کی ہیں۔ اول یہ کہ اس کی زبان حکیمانہ ہے، جو اس لیے ناگزیر تھی کہ حضرت علامہ نے جو مطالب اپنے خطبات میں پیش کیے ہیں، وہ قدیم و جدید حکمت سے متعلق ہیں، لہذا قدرتی طور سے ان میں قدیم و جدید مصطلحات علمی کے علاوہ، قدیم و جدید نظریات و تصورات سے متعلق اصطلاحیں، اس کثرت سے موجود ہیں کہ خاص اہل علم کے سوا بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ قدیم

## خطباتِ اقبال

حکمت کی اصطلاحات و مطالب تو جدید دور کے قارئین میں سے، محدودے چند افراد کی دسترس میں ہیں، لیکن جدید حکمت کے الفاظ و اشارے بھی صرف صاحبِ اختصاص فلسفیوں کے بس کی بات ہے، ہر کوئی ان پر قادر نہیں۔

ان لیکچروں میں مذہب، فلسفہ، اور سائنس، تینوں ہی، کبھی ایک دوسرے کے مقابل، کبھی ایک دوسرے کے متوازی، اور کبھی ایک امتزاجی رنگ میں، ہمارے سامنے زبان و بیان کا ایک ایسا اسلوب رکھ رہے ہیں، جس سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لیے، اور جس کی اندرونی تہوں اور گریہوں کو کھولنے کے لیے با استعداد اور ذی علم قارئین کی ضرورت ہے، اور چونکہ اس خاص منطق میں با استعداد اور ذی علم قارئین قدرتی طور سے کچھ زیادہ نہیں، اس لیے عام افہام کے لیے ان خطبات کو اطمینان بخش شرحوں اور قطعی و صحیح حواشی کے بغیر زیر مطالعہ نہیں لایا جاسکتا۔<sup>۱۸</sup>

اس اقتباس کی ابتدائی سطور میں سید صاحب نے خطبات کی جس 'مقبولیت' کا ذکر کیا ہے، وہ تو محض نظر ہے (اقبال کے شعری مجموعوں کی سیکڑوں اشاعتوں کے مقابلے میں خطبات کے چھپنے کی نوبت دس بارہ مرتبہ ہی آئی ہے)، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مشکل اور دقیق ہے۔ اس سلسلے میں خود علامہ اقبال کو اس کا احساس تھا۔ جناب عباس آرام کے نام ایک خط (۲۰ جون ۱۹۳۲ء) میں لکھتے ہیں:

*Six Lectures is highly technical work and it requires a good acquaintance with the recent development in modern science and philosophy. Since you are well versed in Sufism and religious philosophy, I hope you would not find it difficult.*<sup>۱۹</sup>

انہی مشکلات اور دقتوں کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۷۷ء میں متعلقاتِ خطباتِ اقبال کے عنوان سے ایک قابلِ قدر کتاب شائع کی، جو خطبات کے اعلام، موضوعات، مباحث اور مسائل کی تشریح اور تنقید و تجزیے پر مختلف اہل علم اور صاحبانِ فکر و نظر کے مقالات پر مشتمل ہے۔ بیشتر مقالات خود سید موصوف کی تحریک پر تحریر کیے گئے، لیکن اس کے بعد برسوں تک، مطالعہ خطبات کے سلسلے میں کوئی سنجیدہ کاوش سامنے نہیں آسکی۔

۲

اب گذشتہ دو عشروں میں خطباتِ اقبال کے مطالعے، ان کی تفہیم اور فکرِ اقبال میں ان کی قدر و قیمت اور اہمیت اجاگر کرنے کا رجحان نمایاں ہوا ہے، اور سال بہ سال یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔

خطبات کا اطمینان بخش پہلو تو یہ ہے کہ اس کے متن پر خاطر خواہ تحقیق ہو چکی ہے۔ پروفیسر محمد سعید شیخ (م: ۱۵ مئی ۲۰۰۰ء) نے برسوں کی جانہ محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کے بعد ۱۹۸۶ء میں خطبات کا تحقیقی اور محشی اڈیشن تیار کیا۔ یہ درجہ اول کا کام ہے اور اقبالیات کی تاریخ میں اسے بلا تامل ایک کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی نظم و نثر کی کسی اور کتاب پر تاحال، اس درجے کی معیاری تحقیق نہیں ہو سکی۔<sup>۱</sup>

دل چسپ بات یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں خطبات کے مطالعے، تفہیم اور تعبیر و تشریح کا رجحان، اقبال کے آبائی وطن کشمیر سے شروع ہوا۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے اقبال انسٹیٹیوٹ نے ۱۹۸۲ء میں خطبات کے موضوع پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے توسیعی لیکچروں کا اہتمام کیا تھا۔ یہ لیکچر خطباتِ اقبال پر ایک نظر کے نام سے کتابی صورت میں بھارت کے بعد، پاکستان سے بھی چھپ چکے ہیں۔<sup>۲</sup> مولانا کے خیال میں علامہ کی کئی بحثیں تشنہ اور بعض آرا محل نظر ہیں۔ مولانا نے خطبات کے بعض کمزور پہلوؤں کی تاویل کی ہے اور بعض معاملات میں علامہ کی فروگزاشتوں کا اعتراف کیا ہے، تاہم ان کے خیال میں ان فروگزاشتوں سے اقبال کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

۱۹۸۵ء میں فکرِ اسلامی کی تشکیل نو کے نام سے خطبات کی تشریح کی ایک کاوش پروفیسر محمد عثمان نے کی۔<sup>۳</sup> دل نشین اسلوب اور عام فہم انداز میں خطبات کی یہ خلاصہ نمائندگی، ایک کارآمد کوشش ہے۔ اسی برس ڈاکٹر خالد مسعود کی کتاب اقبال کا تصورِ اجتہاد<sup>۴</sup> شائع ہوئی، جو چھٹے خطبے (الاجتہاد فی الاسلام) کا مفصل مطالعہ و تجزیہ ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اسی موضوع پر مزید مطالعے اور تحقیق کے نتائج، انھوں نے اپنی انگریزی



کتاب *Iqbal's Reconstruction of Ijtihad* میں پیش کیے ہیں۔<sup>۲۴</sup>

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد نے سات خطبوں پر سات اہل علم سے مضامین لکھوا کر تسہیل خطبات اقبال شائع کی۔<sup>۲۵</sup> ڈاکٹر ابصار احمد، ڈاکٹر محمد ریاض اور پروفیسر رحیم بخش شاہین کے مضامین میں، توضیح مطالب کے لیے، اقبال کی شاعری سے مدد لینے کی کوشش نظر آتی ہے۔

تفہیم خطبات کی کوششیں بھارت میں بھی جاری رہیں۔ اس ضمن میں دو کتابیں شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کے استاد پروفیسر وحید الدین نے تیار کیں۔ اول: فلسفہ اقبال خطبات کی روشنی میں<sup>۲۶</sup> جس میں وہ کہیں کہیں علامہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک: ”اقبال، فلسفے کی عالمی تاریخ میں کوئی تاریخ ساز شخصیت تو نہیں کہے جا سکتے“۔ مگر پروفیسر موصوف، اقبال کے فلسفیانہ فکر کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مقلد اسلام اقبال نے اسلامی فکر اور جدید فکر کے پس منظر میں مغربی فکر کے طریقہ اظہار کو اپناتے ہوئے اسلامی الہیات کا جو تصور پیش کیا، اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ دوسری کتاب تفکر اقبال<sup>۲۷</sup> موصوف کے تین لیکچروں پر مشتمل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے پہلے چار خطبوں کے الہیاتی مسائل (زمان و مکاں، وجود باری تعالیٰ، بقاے انسانی وغیرہ) ایسے ہیں، جن میں قطعیت کبھی نہیں آ سکتی، اس لیے ان خطبوں میں علامہ سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے کوئی انقلابی قدم اٹھایا ہے، لیکن: ”ان کا امتیاز یہ ہے کہ پہلی بار بحیثیت ایک اسلامی مقلد، انھوں نے اسلامی فکر کو جھنجھوڑا اور سوچنے پر مجبور کیا، اور ایسی زبان میں ادا کیا، جس کو غیر بھی سمجھ سکیں“۔ پروفیسر وحید الدین کے دیگر توسیعی لیکچروں میں بھی، خطبات کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔<sup>۲۸</sup>

جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈی سنٹر نے ۱۹۸۷ء میں ایک سہ روزہ مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا، اس سے بھی مطالعہ خطبات کے رجحان کو تقویت ملی۔ اقبالیات کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا کہ خاص خطبات کے موضوع پر ایک سیمی نار منعقد ہوا۔ اس کے مقالات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔<sup>۲۹</sup> بعض مقالات بہت عالمانہ اور متوازن نقطہ نظر

کے حامل ہیں اور بعض سے، شاعری پر خطبات کی ترجیح کا رجحان جھلکتا ہے۔

مکتبہ جامعہ، دہلی کی شائع کردہ ڈاکٹر عبدالمنعمی کی تصنیف اقبال کا نظریہ خودی (۱۹۹۰ء) میں بھی خطبات کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے، جو ایک پوری کتاب کے بقدر ہے۔ پروفیسر عبدالمنعمی صاحب نے ہر خطبے کی علاحدہ تشریح و توضیح اور تعبیر کی ہے اور آخر میں کہا ہے کہ اگرچہ اقبال کے یہ فلسفیانہ خیالات، قرآن پر مبنی ہیں مگر ان کا اظہار عصر حاضر کی ان اصطلاحات اور محاورات میں ہوا ہے، جو جدید ترین علوم و فنون کے مباحث میں مروج ہیں۔ ان کے خیال میں اقبال کی ان فلسفیانہ تحریروں کی حیثیت، ان کے افکار کے مآخذ کی ہے اور یہ مآخذ، اقبال کے شاعرانہ خیال کے حوالوں کا مرکز ہیں، چنانچہ اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں خودی کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے، اسے مذکورہ خطبات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

۱۹۸۷ء اور مابعد دو ایک برسوں میں خطبات پر بحث مباحثے<sup>۳۲</sup> میں ڈاکٹر محمد یوسف گوریہ نے پُر جوش انداز میں حصہ لیا۔ وہ خطبات کو اقبال کی نمائندہ کتاب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خطبات کے مقابلے میں، اقبال کی اردو اور فارسی شاعری ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں اور کتاچے جزوی طور پر اور بالواسطہ خطبات کے بعض موضوعات سے متعلق ہیں، مثلاً:

1- *Allama Iqbal and the Authority to Interpret Shariah in a*

*Modern Islamic State*: شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۔

۲- اقبال اور اجتہاد: فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۷۸۔

۳- اسلامی تصورات، اقبال اور عصر حاضر: بزم اقبال لاہور،

۱۹۸۹ء۔ ص ۶۳۔

۴- علامہ اقبال اور اصول اجتہاد: بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۶۳۔

کتابوں کے علاوہ تفہیم خطبات کے سلسلے میں حالیہ برسوں میں متعدد تنقیدی، سنجیدہ اور عالمانہ مضامین بھی لکھے گئے۔<sup>۳۳</sup> خطبات کی جانب اعتنا کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اب یہ

خطبات، یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کا موضوع بن رہے ہیں، مثلاً: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایم فل اقبالیات کے دو مقالے، اول: اقبال اور امکاناتِ مذہب (آخری خطبے کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ) از غلام رسول محمد، ۱۹۹۲ء۔ دوم: خطباتِ اقبال، نئے تناظر میں از محمد سہیل عمر، ۱۹۹۴ء۔ نیز: اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کا ایک مقالہ: تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ کے مسلم اعلام از مشتاق احمد گنائی، ۱۹۹۸ء (مطبوعہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر، ۲۰۰۰ء)۔ اسی طرح ایم اے کا ایک مقالہ: اقبال کا تصورِ آخرت از گلشن پروین، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، ۱۹۸۹ء، بیشتر خطبات کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اقبال پریڈیو اور ٹیلی وژن کے متعدد نشریوں میں بھی خطبات پر وقتاً فوقتاً بحثیں ہوتی رہیں۔<sup>۳۲</sup>

خطبات کی جانب توجہ مبذول ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ تنقیدِ اقبال میں خطبات سے استشہاد اور اس کے حوالوں کا رجحان بڑھ رہا ہے، مثلاً، دیکھیے: ڈاکٹر غلام رسول ملک کا مجموعہ مضامین سرودِ سحر آفرین<sup>۳۳</sup>، اسی طرح ایس ایم عمر فاروق کا مجموعہ طواسین اقبال دوم، سوم۔<sup>۳۴</sup> علاوہ ازیں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر مباحث میں بکثرت، خطبات کے حوالے دیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اپنے مضمون Testing Iqbal's Philosophical

Test of the Revelations of the Religious Experience میں علامہ کے بعض تناقضات کا ذکر کیا ہے۔<sup>۳۵</sup> اس پر ایک تردیدی مضمون خضریا سین نے تحریر کیا۔ (مجلد اقبالیات لاہور، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۵ء) اور دوسری تنقید محمد سہیل عمر نے کی۔ یہ تنقید بھی ان کے متذکرہ بالا تحقیقی مقالے کی کتابی اشاعت (خطباتِ اقبال، نئے تناظر میں، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۶ء کے ضمیمہ ۲ میں، بہ عنوان: ”مدعا مختلف ہے“ شامل ہے۔ دوسرے: Iqbal Review کا ایک خاص شمارہ برائے مطالعاتِ خطبات) (اقبال اکادمی، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۶ء) ہے۔

مطالعہ خطباتِ اقبال کی متذکرہ بالا کاوشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی کسی اور شعری یا نثری تصنیف کو اس بڑے پیمانے پر موضوع بحث نہیں بنایا گیا۔ اس کے مطالب پر اس طرح مذاکرے ہوئے، نہ اس کی تفہیم کے لیے اتنی شرحیں لکھی گئیں، اس کے باوجود خطبات سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اہل علم کا یہ احساس قابل توجہ ہے کہ خطبات کے فلسفیانہ مباحث کو بار بار سمجھنے سمجھانے اور اس کے مزید گہرے مطالعے کی ضرورت ہے، اس لیے بھی کہ ان خطبات میں ایک طرح کا ابہام موجود ہے۔ علامہ اقبال کو اپنی بعض آرا پر شرح صدر نہ تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ خطبات کے بعض اجزا علما کی نظر سے گزر جائیں تو اچھا ہے۔<sup>۱</sup> نذیر نیازی بتاتے ہیں کہ ان کا ارادہ ان مطالب کو، جو خطبات میں ادا کیے گئے، اور زیادہ وضاحت، بلکہ ایک حد تک نئے انداز میں پیش کرنے کا تھا۔<sup>۲</sup> برسبیل تذکرہ، یہاں ایک اقتباس پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پروفیسر اسرار احمد سہاوری (سابق استاذ فارسی اور اردو، اسلامیہ کالج گوجرانوالہ) اپنی خودنوشت سرمایہ حیات (گوجرانوالہ، ۱۹۹۶ء) میں لکھتے ہیں:

نذیر نیازی صاحب، میرے ایم اے اسلامیات کے دور میں، کلاس کو خطباتِ مدراس پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ کلاس میں ان کا پہلا لیکچر ہی بہت دل چسپ اور عبرت آموز تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے خطبات کے بیشتر مشکل مقامات کو خود علامہ اقبال سے سمجھا ہے۔ انھوں نے ان خطبات کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا ہے، جو کافی معتبر بھی ہے اور مشہور بھی۔ اپنے پہلے لیکچر کی تمہید میں ہی انھوں نے ان خطبات کے متعلق ایک عجیب بات کہی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ خطبات، علامہ کی مشکل ترین کاوش ہیں۔ آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں ان کے تمام مشکل مقامات کو آپ کے لیے حل کروں گا، کیونکہ بعض مشکل مقامات کے بارے میں میرا ذہن خود صاف نہیں، حالانکہ بیس سال سے میں ان پر تفکر کر رہا ہوں۔ ان میں بہت ابہام ہے۔ میں نے خود ان مقامات کو علامہ مرحوم کے سامنے افہام و تفہیم کے لیے پیش کیا

## خطباتِ اقبال

تھا، لیکن علامہ نے مسکرا کر فرمایا کہ نذیر! یہ وہ مقامات ہیں جن پر میں خود غور کرتا ہوں تو ذہن پر واضح نہیں ہوتے۔ نامعلوم کیسی وجدانہ کیفیت میں، میں نے یہ باتیں لکھیں۔ یہ تمام مقامات وجدانی ہیں، فکری نہیں۔ وجدان کے ذریعے سے ہی یہ گرفت میں آسکتے ہیں۔ انھیں پڑھتے رہو، کبھی تم پر اگر میری جیسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی تو کشف کے طور پر ظاہر ہو جائیں گے، لیکن تم محسوس کر سکو گے، ان کا اظہار یا ابلاغ نہیں کر سکو گے۔ یہ بالکل معرفت کا سا معاملہ ہے، تو حضرات! وہ وجدان مجھے ابھی تک حاصل نہیں ہوا۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ان خطبات میں خامیاں، کوتاہیاں اور فرگند اشتیاق موجود ہیں، چنانچہ کچھ علمائے علامہ کے بعض بیانات کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے انھیں غلط قرار دیا، مثلاً: ان کے خیال میں جنت، دوزخ کے بارے میں اقبال کے تصورات، قرآنی آیات اور اس کے نصوص کے صریحاً خلاف ہیں۔ چند برس پہلے جامعہ أم القری مکہ کے ڈاکٹریٹ کے ایک مقالے<sup>۳۸</sup> میں یہی رائے ظاہر کی گئی، جو ایک طرح سے بہت سے عرب علما کی نمائندگی کرتی ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس ضمن میں مصری مصنف ڈاکٹر الہی کے اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بعض امور میں علامہ کی فرگند اشتیاق کا اعتراف کیا ہے، اور خطبات کے بعض کمزور پہلوؤں کی تاویل بھی کی ہے۔  
مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

خطبات میں بہت سے ایسے افکار و خیالات ملتے ہیں، جن کی تاویل، توجیہ، اور اہل سنت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت، مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ یہی احساسِ استادِ محترم مولانا سید سلیمان ندوی کا تھا۔ ان کی تمنا تھی کہ: 'یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا تھا'۔<sup>۳۹</sup>

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں خطبات میں: 'وقت کے حالات کا اثر بھی پایا جاتا ہے اور بعض مسائل کے بیان میں بھی خامیاں ہیں'۔<sup>۴۰</sup> ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے بھی خطبات کے بعض تسامحات کی طرف اشارے کیے ہیں۔<sup>۴۱</sup> محمد سہیل عمر کا خیال ہے کہ خطبات کی تحریر کے وقت جو مسائل سامنے آ رہے تھے، خطبات میں ان کے جوابات

قیاسی تھے، اور شاعری کی طرح خطبات میں بھی 'نئے شوالے' موجود ہیں۔<sup>۴۲</sup>  
خیال رہے کہ یہ سب علما اور دانش ور، اقبال کے مدّاح ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی اقبال مخالف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

علامہ کے تصورِ اجتہاد کے سلسلے میں پروفیسر محمد متور کا خیال ہے کہ ان کے خیالات مسلسل ارتقا پذیر رہے ہیں، لہذا یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ ۱۹۲۸ء-۱۹۲۹ء میں انہوں نے جو کچھ کہا، اور ان کی سوچ کا جو رخ وفات سے آٹھ نو برس پہلے ان کے خطبات میں نظر آتا ہے، وہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۸ء تک کے عرصے میں جوں کا توں برقرار رہا۔<sup>۴۳</sup> پروفیسر متور صاحب کی اس رائے کی تائید، خود علامہ اقبال کے اس خیال سے بھی ہوتی ہے کہ ان مطالب کو، جو خطبات میں ادا کیے گئے، اور زیادہ وضاحت، بلکہ ایک حد تک نئے انداز میں پیش کیا جائے (روایت نذیر نیازی)۔<sup>۴۴</sup> اگر اس روایت کو علامہ اقبال کے حسبِ ذیل بیان سے ملا کر دیکھا جائے:

There is no such thing as finality in philosophical thinking.  
As knowledge advances and fresh avenues of thought are opened, other views, and probably sounder views than those set forth in these lectures, are possible. Our duty is carefully to watch the progress of human thought, and to maintain an independent critical attitude.<sup>۴۵</sup>

تو خطبات پر نقد و انتقاد اور "زیادہ بہتر" کی تلاش، خود اقبال کا منشا پورا کرنے کے مترادف ہوگی۔

خطبات پر بحث مباحثے میں شاعری کے مقابلے میں خطبات کو ترجیح دینے یا "اقبال کا اصل کارنامہ خطبات ہیں نہ کہ شاعری"، قرار دینے کا رجحان بھی ملتا ہے، مثلاً:  
○ فکر اقبال، جس طرح ان کے خطبات میں روشن ہے، اس طرح ان کی شاعری میں نہیں۔ (پروفیسر آل احمد سرور)<sup>۴۶</sup>

- کچھ عجب نہیں کہ آئندہ چل کر یہی کارنامہ، اقبال کا عظیم ترین کارنامہ تسلیم کیا جائے۔ (پروفیسر محمد عثمان) ۴۷
- فکرِ اقبال کی تلاش میں بھی اب تک ان کی شاعری ہی پر زیادہ توجہ ہوئی ہے، حالانکہ اقبال کی اصل فکر مربوط طور پر ان کے خطبات میں ملتی ہے۔ (ضیاء الحسن فاروقی) ۴۸
- علامہ کی شاعری میں بیان کردہ افکار کو علامہ کے وسیع مطالعے، گہری فکر، منظم، منضبط اور مربوط تعلیمات پر مبنی اس 'کلیدِ اقبال'، (خطبات) کی رہنمائی اور روشنی میں سمجھا جائے، جو ان کے 'مستقل اور پابدار افکار کا مجموعہ ہے'۔ (ڈاکٹر محمد یوسف گوریہ) ۴۹
- اقبال کی اصل فکر مربوط طور پر، ان کے خطبات میں ملتی ہے۔ (ص ۱۸) اور اقبال ان خطبات کو حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ (ص ۴۹) اور اقبال کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے اشعار کی بھول بھلیوں سے باہر نکل کر یا تو ان خطوط میں تلاش کرنا چاہیے، جو انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے جانے والوں کو لکھے تھے، یا پھر ان کے خطبات میں دیکھنا چاہیے، جسے ایک طرح سے ان کے مذہبی خیالات کا متن کہا جاسکتا ہے۔ (ص ۴۲، ڈاکٹر مشیر الحق) ۵۰

## ۴

راقم کے خیال میں جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اقبال نر شاعر تھا، یا اول و آخر فقط ایک شاعر تھا، یا یہ کہ اقبال یہ خطبات نہ لکھتے تو بہتر ہوتا، اسی طرح Reconstruction کو اقبال کے فکر کی نمائندہ کتاب سمجھ لینا بھی درست نہیں۔ یہ سب رویے انتہا پسندانہ ہیں اور ادھورے اقبال کو پیش کرتے ہیں۔ خطبات کو حرفِ آخر سمجھ کر اور ان پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہنا، اسی فکری و ذہنی جمود کی علامت ہوگا، جسے توڑنے کی کوشش، اقبال نے ان خطبات میں کی ہے۔

خطباتِ اقبال پر ایک متوازن رائے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ خطبات ایک ایسے زمانے میں تحریر کیے گئے تھے، جب کہ اسلامی فکر و نظر اور دستورِ حیات پر مغرب کی یلغار نے دنیاے اسلام میں بڑی انقلاب انگیز شکل اختیار کر لی تھی اور اس پر ایک

پہلے برپا تھی۔ اس وقت جو ابتدائی کوششیں، اسلامی عقیدے اور نظامِ فکر و عمل کو از سر نو مرتب کرنے کے لیے کی گئیں، ان میں علامہ مرحوم کے ان خطبات کا بڑا اہم مقام ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ ترتیب جدید بالکلیہ درست تھی۔ اس میں وقت کے حالات کا اثر بھی پایا جاتا ہے اور بعض مسائل کے بیان میں بھی خامیاں ہیں، اس لیے اگر کوئی اسے فکرِ اسلامی کی ترتیب نو کے معاملے میں حرفِ آخر کہے تو غلط ہوگا، البتہ اس طرزِ خاص کے لٹریچر میں مقدمتہً الجیش کی حیثیت سے اس کی قدرنا قابلِ انکار ہے۔<sup>۵۱</sup>

یہ وہی بات ہے جو خود علامہ اقبال نے اپنے خطبات کے بارے میں یوسف سلیم چشتی سے کہی تھی۔ چشتی کے بقول علامہ نے فرمایا: ”دراصل میری یہ کتاب آئندہ فلسفہٴ اسلام پر قلم اُٹھانے والوں کے لیے ایک مقدمے کا کام دے گی۔“<sup>۵۲</sup>

مطالعہٴ خطبات کے سلسلے میں انتہا پسندی کے بجائے ہمیں اعتدال و توازن کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اقبال کی شاعری کو بھول بھلیاں سمجھنا (اور اس لیے) اسے نظر انداز کر کے خطبات کو ”متن“ اور اقبال کا ”حاصلِ حیات“ قرار دینا: ”کیس رہ کہ تومی روی بہ ترکستان است“ کے مترادف ہے۔ خطبات کی اہمیت مسلمہ اور فکرِ اقبال میں ان کی ناگزیر حیثیت بھی بجا، مگر یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ اقبال کا فکر، تمام و کمال انھی خطبوں پر منحصر و محیط ہے۔ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اقبال کی بنیادی حیثیت ایک شاعر کی ہے مگر یہ شاعر، اپنی ہزار شیوہ شاعری کے ذریعے قارئین کو فکر و نظر کے نئے نئے آفاق سے روشناس کراتا، اور ان پر حکمت و بصیرت کے نو بہ نو اعماق آشکار کرتا ہے۔ اقبال کی عظمت ان کی نظم و نثر کے مجموعی مطالعے ہی سے واضح ہوتی ہے۔ (ان کی نثر میں خطبات کے علاوہ دیگر اردو اور انگریزی تحریریں اور خطوط شامل ہیں۔) اقبال نے، بقول پروفیسر سید وحید الدین:

مغرب کے فلسفے کا بغاوت مطالعہ کیا اور اپنے خطبات میں اپنی فلسفیانہ صلاحیت کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا، اور اپنی شاعری میں بھی حکیمانہ خیالات کو بہت ہی کامیابی کے ساتھ شاعری کا جامہ پہنایا، جس کا سب سے مکمل اظہار جاوید نامہ میں ملتا ہے۔<sup>۵۳</sup>

پس یہ اصرار بے جا ہے کہ اقبال کا اصل فکر ان کے خطبات میں ملتا ہے اور اسی طرح



یہ سوال بھی بے محل اور بے معنی ٹھہرتا ہے کہ اقبال کا اصل کارنامہ ان کی شاعری ہے یا خطبات؟ اقبال کے کارنامہ علمی و فکری اور شعری و ادبی کی دریافت، شاعری اور خطبات، شاعری اور نثر، دونوں کے مطالعے اور ربط و ارتباط ہی سے ممکن ہے۔ ترجیح کی بات تو الگ ہے، مگر اقبال عقل و عشق، دونوں کو اہم سمجھتے ہیں اور تکمیل حیات کے لیے دونوں کو ناگزیر قرار دیتے ہیں:

زیر کی از عشق گردد حق شناس  
کار عشق از زیر کی محکم اساس  
عشق چوں با زیر کی ہم بر شود  
نقش بند عالم دیگر شود  
خیز و نقش عالم دیگر بنہ  
عشق را با زیر کی آمیز ده ۵۴

## حوالے اور حواشی

- ۱- خطبات کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن نے ۱۹۳۴ء میں طبع کیا۔
- خطبات کے پس منظر، ترتیب و تیاری اور تحریر و پیش کش کی تفصیل: اقبال کے خطوط اور اقبالیات کی مختلف کتابوں میں ملتی ہے۔ مختصر روداد، نیز مختلف حوالوں کے لیے دیکھیے: تصانیف اقبال ص ۳۱۳ تا ۳۲۶، وما بعد۔
- ۲- متعلقات خطبات اقبال، مرتب: ڈاکٹر سید عبداللہ۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۷۔
- ۳- Articles on Iqbal، بشیر احمد ڈار۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۲۷ تا ۲۶۸۔
- ۴- بحوالہ: محمد سہیل عمر، خطبات اقبال، نئے تناظر میں۔ اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۳۰۔
- ۵- ناشر: شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۴۴ء وما بعد۔ اردو ترجمہ بہ عنوان: اقبال کی مابعد الطبیعیات از ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء۔

- ۶- محمد سہیل عمر، کتاب مذکور، ص ۵۰۔
- ۷- اس عرصے میں تسہیل خطبات کی اگاڑا کا کوششیں ضرور ہوئیں، مثلاً: خطبات کی تلخیص از خلیفہ عبدالکامیم در: فکر اقبال، بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۷ء وما بعد، یا ایک ترجمہ نما تشریح بہ عنوان: خطبات اقبال پر ایک نظر از محمد شریف بقاء، لاہور، ۱۹۷۴ء، یا پہلے خطبے کی تلخیص از شاہ محمد عبدالغنی نیازی، در: اقبال لاہور، اپریل ۱۹۵۵ء، وغیرہ۔
- ۸- انقلاب لاہور، ۱۵ مئی ۱۹۳۰ء، بحوالہ: حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، مرتبہ: محمد حمزہ فاروقی۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۷۱، ۷۲۔
- ۹- نیرنگ خیال: اقبال نمبر، تمبرا کتوبر ۱۹۳۲ء، ص ۳۶۲۔
- ۱۰- اردو ترجمے کی ایک کاوش ڈاکٹر محمد سیح الحق (بھارت) نے بھی کی۔ انھیں نذیر نیازی کے ترجمے کا علم نہ تھا، چنانچہ انھوں نے ۱۹۵۶ء میں خطبات کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا، ۱۹۶۲ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۹۳ء میں طبع ہو کر سامنے آیا، بہ عنوان: تفکر دینی پر تجدید نظر: ایجوکیشنل پبلسٹنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۷ ص۔
- ۱۱- خدا بخش لائبریری جرنل: پینڈ، شمارہ ۹۹: ۱۹۹۵ء، ص ۲۸۹۔
- ۱۲- زندہ رود، سوم: شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۷۰۔
- ۱۳، ۱۴- تشکیلی جدید: ص ”ب“۔
- ۱۵- مثلاً: (۱) ’سید نذیر نیازی مرحوم، جو علامہ اقبال کے بڑے معتمد علیہ تھے، اور جنہوں نے علامہ کے حکم سے، اور ان کی نگرانی میں، خطبات کا اردو ترجمہ مع تشریحات و تعلیقات کے، بڑی خوبی اور تحقیق و تدقیق سے کیا ہے۔ (مولانا سعید احمد اکبر آبادی: خطبات اقبال پر ایک نظر، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸)۔
- (۲) ’سید نذیر نیازی نے عمدہ ترجمہ ہمیں دیا ہے۔ (ڈاکٹر سید عبداللہ، دیباچہ، خطبات اقبال پر ایک نظر: از محمد شریف بقاء، لاہور [۱۹۷۴ء] ص ۴۔
- (۳) ’نذیر نیازی نے ترجمہ بہت اچھا کیا ہے۔ (آل احمد سرور، دیباچہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادی، کتاب مذکور، ص ۶)۔
- (۴) ’سید نذیر نیازی نے یہ کام جو بڑا مشکل تھا، بسہولت انجام دیا اور یہ کام ہی ان کی علمی فضیلت، ذرا کی اور فلسفہ فنی کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ (پروفیسر محمد منور، در: سید نذیر نیازی (حیات اور تصانیف): نسیم اختر، تحقیقی مقالہ ایم اے اردو، جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۷۰)۔
- (۵) ’انہوں نے انگریزی خطبات کا جو ترجمہ کیا، وہ چھوٹا کام نہیں ہے۔ جہاں تک اس ترجمے کی

## خطباتِ اقبال

صحت کا تعلق ہے، اس بارے میں تو شبہہ نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس کے بعض حصے علامہ اقبال نے دیکھے اور بعض ڈاکٹر عابد حسین نے۔ (پروفیسر جگن ناتھ آزاد، بحوالہ: نسیم اختر، مقالہ مذکور، ص ۱۷۲)۔

۱۶- اس کی ایک ترجمانی محترمہ کنیر فاطمہ یوسف کے حسب ذیل شدید ردِ عمل سے ہوتی ہے: ”وہ ایسی جتناقی زبان میں تھا، جس کے مقابلے میں انگریزی کہیں زیادہ سہل اور موثر نظر آتی ہے، اس پر طرہ یہ ہے کہ مترجم نے، اقبال کے انقلابی تصورات میں کانٹ چھانٹ اور تروید و تاویل کا حق بھی، خدا جانے، کہاں سے حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت اردو میں ان خطبات کا جو ترجمہ دستیاب ہے، وہ نہ صرف پیچیدہ اور مبہم ہے، بلکہ گمراہ کن حد تک اصل سے مختلف بھی ہے۔“ (مجلد فنون، لاہور، ستمبر اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۳۹)۔ مگر محترمہ نے اپنی انتہا پسندانہ رائے کی تائید میں کوئی مثال نہیں دی، جس سے اندازہ ہو سکے کہ نیازی صاحب نے یہ ترجمہ کرتے ہوئے اصل سے کہاں انحراف کیا اور قارئین اقبال کو کس نوعیت کی ”گمراہی“ میں مبتلا کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد سمیع الحق نے بھی اس ترجمے کی بوجھل زبان اور عربیت کا شکوہ کیا ہے (دیباچہ: کتاب مذکور، حوالہ ۱۰، ص ۵)۔ ڈاکٹر محمد افضل سابق ریکٹر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے نزدیک یہ ترجمہ: ”عربی و فارسی تراکیب سے گراں بار ہونے کے باعث عام قاری کے لیے وچر کشش نہیں رہا۔ اس لیے انھوں نے خطباتِ اقبال کے پنجابی مترجم جناب شریف کنجاہی کو، اس کے ایک نئے اردو ترجمے پر آمادہ کیا۔ کنجاہی صاحب کا ترجمہ: مذہبی افکار کی تعمیر نو کے نام سے بزمِ اقبال، لاہور نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔“

۱۷- حال ہی میں ایک ترجمہ ڈاکٹر وحید عشرت نے تجدیدِ فکریاتِ اسلام کے نام سے شائع کیا ہے۔ (اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۳ء)۔ ایک اور ترجمہ جناب شہزاد احمد نے بھی کیا ہے، یہ عنوان: اسلامی فکر کی تشکیلی نو، مکتبہ خلیل لاہور، [۲۰۰۰ء] ص ۲۳۱۔ اکاڈمک خطبوں کے تراجم:

(۱) روحِ تمدنِ اسلامی (خطبہ ۵)، حافظ ضمیر الدین۔ جوہر، دہلی، اقبال نمبر، ۱۹۳۸ء۔

(۲) قانونِ اسلامی (خطبہ ۶) از پروفیسر خورشید احمد۔ چواغ راہ، کراچی، اسلامی قانون نمبر۔

(۳) کیا مذہب کا امکان ہے (خطبہ ۷)، اختر مسعود۔ نقوش، لاہور، شمارہ ۱۳۔

۱۸- متعلقاتِ خطباتِ اقبال، مرتب: ڈاکٹر سید عبداللہ۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ”ز“، ”دش“۔

۱۹- مشمولہ: Iqbal and Tagore، محمد اکرام چغتائی۔ سنگ میل لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۷۳-۷۵۔

۲۰- اس کا مفصل تعارف اور جائزہ، دیکھیے: ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب، رفیع الدین ہاشمی۔ اقبال

- ۲۱- اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سری نگر، ۱۹۸۳ء، نیز: اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۷ء۔
- ۲۲- سنگ میل پبلی کیشنز: لاہور، ۱۹۸۵ء۔
- ۲۳- مکتبہ حرمت راولپنڈی، ۱۹۸۵ء۔
- ۲۴- اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۵ء۔
- ۲۵- شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔
- ۲۶- ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، نیز: نذیر سنز لاہور، ۱۹۸۹ء۔
- ۲۷- اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۷ء۔
- ۲۸- اقبال اور مغربی فکر: سری نگر، ۱۹۸۱ء اور حکمت گونٹے اور فکر اقبال: سری نگر، ۱۹۸۴ء۔
- ۲۹- اقبال، فکر اسلامی کی تشکیل نو، مرتب: حسین محمد جعفری۔ پاکستان اسٹڈی سنٹر کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء۔
- ۳۰- ان بحثوں کا ذکر، دیکھیے، اقبالیات کے تین سال: رفیع الدین ہاشمی۔ حرا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، باب ۷
- ۳۱- مثلاً: (۱) علم اور واردات روحانی پر اقبال کا خطبہ: مختار صدیقی آپہنگ، کراچی، ۷ اپریل ۱۹۷۰ء۔ (۲) اپنے خطبات پر اقبال کا دیباچہ: پروفیسر سی اے قادر، مشمولہ: *Iqbal Centenary Papers* دوم۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۷ء (۳) *Iqbal's Reconstruction of Islamic Ideas*: ایم عبدالحق انصاری، مشمولہ: *Iqbal: Essays and Studies*، مرتب: اسلوب احمد انصاری، غالب اکیڈمی دہلی، ۱۹۷۸ء۔ (۴) *Iqbal's Analysis of Muslim Culture: A Critical Study*، شہزاد قیصر، *Iqbal Review*، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۴ء۔ (۵) اسلامی ثقافت کی روح: رحیم بخش شاہین، اقبالیات، لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء۔ (۶) خطبات اقبال، چند بنیادی سوالات: محمد سہیل عمر، اقبالیات، لاہور، جولائی ۱۹۸۷ء۔ (۷) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، اسلامی افکار کے تناظر میں: پروفیسر اسلم انصاری، مشمولہ: اقبال عہد آفرین، ملتان، ۱۹۸۷ء۔ (۸) علم اور مذہبی واردات: ڈاکٹر محمد اجمل، مشمولہ: مقالات اجمل: ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۷ء۔ (۹) اقبال کی شاعری کا ایک بنیادی گوشہ، شمیم احمد: بوگ گل، اقبال نمبر، سمندری، ۱۹۸۷ء۔ (۱۰) اقبال کا تصور جنت و دوزخ: محمد رفیق چودھری، تو حمان القرآن، لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء۔ (۱۱) خطبات کے متعدد مباحث پر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے مضامین، ان کی تصنیف قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، (لاہور، ۱۹۸۹ء) میں شامل ہیں۔ (۱۲) سائنس اور

## خطباتِ اقبال

اقبال: مظفر حسین، اقبال، لاہور، اپریل ۱۹۸۹ء۔ (۱۳) اقبال کا انقلابی تصور اور اقبال از: زاہد منیر عامر، ماہ نامہ اشراق لاہور، اگست ۱۹۹۲ء۔ (۱۴) علامہ اقبال اور پارلیمان کا حق اجتہاد: ڈاکٹر تحسین فراتی، اقبالیات، لاہور، جولائی ۱۹۹۵ء۔ نیز: تصور الہ اور عبادت کا مفہوم، جہاتِ اقبال، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۳ء، علاوہ ازیں ’’علامہ اقبال اور مسلم ثقافت کی خصوصیات‘‘، مشمولہ: علامہ اقبال اور جہانِ اسلام، شائع کردہ: خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، لاہور، ۱۹۹۵ء۔۔۔ کچھ تازہ مباحث کے لیے دیکھیے: منظور احمد، اقبال شناسی: ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۲ء، نیز: نعیم احمد (مرتب) خطباتِ بیادِ اقبال، شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۳۲۔ مثلاً: (۱) خطباتِ اقبال کی روشنی میں اردو تقاریر کا ایک سلسلہ، آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد سے، بہ تفصیل ذیل، نشر ہوا:

(الف) خودی، جبر و قدر: پروفیسر بشیر احمد قریشی، ۲۳ جولائی ۱۹۷۳ء۔

(ب) علم اور مذہبی مشاہدات: پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ، ۲۴ جولائی ۱۹۷۳ء۔

(ج) تصور و طینت: خواجہ غلام احمد پنڈت، ۲۵ جولائی ۱۹۷۳ء۔

(د) اسلامی ثقافت کی روح: مولوی محمد سعید، ۲۶ جولائی ۱۹۷۳ء۔

(ه) ذاتِ الہیہ: عبدالمجید سلہریا، ۲۷ جولائی ۱۹۷۳ء۔

(جو مالہ کتابچہ: ہفتہ جشنِ اقبال، آزاد کشمیر ریڈیو، مظفر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۹)۔

(۲) ریڈیو پاکستان لاہور نے اپنے یونیورسٹی طلبہ پروگرام میں، خطبات کے تعارف اور توثیح و تجزیے پر ڈاکٹر تحسین فراتی، راقم الحروف اور دیگر اساتذہ کے آٹھ ٹیکچر اور ان کے آخر میں سوال جواب نشر کیے۔

(۳) نومبر ۱۹۹۲ء میں پاکستان ٹیلی وژن لاہور نے خطبات پر ایک مذاکرہ نشر کیا، جس میں ڈاکٹر تحسین فراتی، محمد سہیل عمراور ڈاکٹر وحید عشرت شامل بحث تھے۔

(۴) ایس ایم عمر فاروق کے مضامین طواسین اقبال: دوم (اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۰ء) زیادہ تر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئے۔

۳۳۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سری نگر، ۱۹۹۲ء، ۱۶۲ص۔

۳۴۔ دیکھیے: حاشیہ ۳۱ (۴)۔

۳۵۔ مجلہ اقبال، لاہور، جولائی ۱۹۹۴ء۔

۳۶۔ تشکیل جدید: ص ’’ب‘‘۔

۳۷۔ کتاب مذکورہ، ص ’’و‘‘۔

- ۳۸ - محمّد اقبال و موقفه من الحضارة الغربية: ڈاکٹر خلیل الرحمن عبدالرحمن۔ دارحرا مکہ، ۱۹۸۸ء۔
- ۳۹ - نقوش اقبال: مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۷۲ء، ص ۴۰۔
- ۴۰ - اقبال اور مودودی، مرتب: ابوراشد فاروقی۔ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۷۲-۷۳۔
- ۴۱ - قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۱ء۔
- ۴۲ - مجلہ اقبالیات، لاہور، جولائی ۱۹۸۷ء۔
- ۴۳ - حسین محمد جعفری کا مرتبہ مجموعہ مذکور۔
- ۴۴ - دیکھیے: تشکیل جدید، ص ۷۔
- ۴۵ - دیباچہ Reconstruction، ص xxii۔
- ۴۶ - دیباچہ: خطبات اقبال پر ایک نظر، سعید احمد کبر آبادی۔
- ۴۷ - اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیل نو، ص ۱۹۔
- ۴۸ - ابتدائی فلسفہ اقبال، خطبات کی روشنی میں۔
- ۴۹ - نوائے وقت، لاہور، ۲۳ اگست ۱۹۸۷ء۔
- ۵۰ - اقبال: ایک مسلم سیاسی مفکر، مرتبہ: ماہ طلعت علوی، دہلی، ۱۹۹۶ء۔
- ۵۱ - مکتوب بنام شورش کاشمیری، بشمولہ: اقبال اور مودودی، ص ۷۲-۷۳۔
- ۵۲ - اقبال ریویو لاہور، جولائی ۱۹۶۳ء، ص؟؟
- ۵۳ - حکمت گوٹھے اور فکرِ اقبال: اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر، ۱۹۸۴ء، ص ۷۔
- ۵۴ - پیام مشرق، ص ۶۵۔
- (مشمولہ: اقبال کی شعری و فکری جہات، مرتب: پروفیسر عبدالحق، شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۹۸ء۔ تجدید نظر: فروری ۲۰۰۳ء)

## فکرِ اقبال اور مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار

علامہ محمد اقبال نے شعور کی آنکھ کھولی تو ”مغرب“ ان کے وطن ہندستان میں، حاکم و حکمران کی حیثیت سے موجود و مسلط تھا۔ برطانیہ، جو مغربی غلبہ و استیلا کی علامت تھا، اپنی پوری سیاسی و تہذیبی، علمی و فکری اور فوجی قوت کے ساتھ برِ عظیم پر قابض و متصرف تھا۔ اقبال کی تعلیم، اول تا آخر، انگریزوں کے قائم کردہ اداروں میں ہوئی۔ یوں تو اقبال کے ایک استاد پروفیسر آرنلڈ کا تعلق بھی انگریزوں ہی کے قائم کردہ ایک ادارے سے تھا، مگر آرنلڈ نے اقبال میں مزید علم حاصل کرنے کی جوت جگائی اور یہی سوداے علم اور اسی شرابِ علم کی لذت، انہیں کشاں کشاں یورپ لے گئی۔ اگرچہ انھوں نے پیرسٹریٹ لا اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مغربی مراکزِ علوم و فنون سے حاصل کیں، مگر یہ بالکل واضح ہے کہ یورپ کے مقاصدِ تعلیم اور اقبال کے مقاصدِ حیات میں ایک واضح تضاد اور حد درجہ مُغارت تھی۔

قیامِ یورپ میں مغربی علوم اور جدید فلسفہ و ادب کے مطالعے، عقلی، فکری اور سیاسی تحریکوں سے واقفیت، یورپی حکما و شعرا سے اخذ و اکتساب اور ”درسِ حکیمانہ فرنگ“ نے اقبال کی عقلی و ذہنی استعداد کو تو ضرور بڑھایا، لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں مغربی علم و دانش کی کم بصری اور نارسانائی کا بھی شدید احساس ہونے لگا۔ انھوں نے یورپ کی ”کان نمک“ میں اپنی شخصی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ یقیناً یہ ”صحبتِ صاحبِ نظراں“ کا اثر تھا۔ اقبال کی زندگی میں سب سے پہلے صاحبِ نظر خود اُن کے والد ماجد شیخ نور محمد تھے، اور دوسرے:

مولوی میر حسن] گو، اقبال تین برس تک یورپ کے بعض ملحد فلسفیوں سے بھی درس لیتے رہے (مے از میخانہ مغرب چشیدم --- اور --- نشستم بانکویان فرنگی)، مگر ان پر مغربیت کا رنگ نہ چڑھ سکا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہء دانش فرنگ  
سر مہ ہے میری آنکھ کا، خاکِ مدینہ و نجف<sup>۱</sup>  
اقبال ابھی یورپ ہی میں تھے کہ ”مغرب“ سے منحرف ہو گئے۔

اقبال کی شخصیت داخلی طور پر تربیت و تہذیب یافتہ، منظم اور توانا تھی۔ انھیں یورپی تمدن کا ظاہری طمطراق، ماڈی آسائشیں اور چمک دمک متاثر نہ کر سکی۔ شخصی حیثیت میں وہ مغرب کے جس قدر قریب ہوئے، ان کے ذہن میں اس کے خلاف ایک ناقدانہ ردِ عمل پیدا ہوتا گیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس صورتِ حال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے ہوئے وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجھدار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا، اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔<sup>۲</sup>

اقبال کا یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا۔ وہ ایک ایسے مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے، جو اسلام کی بہترین روایات و اقدار کا امین تھا۔ کہنا چاہیے کہ وہ فطرتاً، طبعاً، افتاداً، ذہناً اور تربیتاً، مشرقی اور اسلامی تھے۔ قیامِ یورپ کے مشاہدات نے علامہ کو ۱۹۰۷ء ہی میں یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

تمھاری تہذیب، اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی  
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا<sup>۳</sup>  
[خیال رہے کہ شہنشاہِ کوزال مغرب کی پیش گوئی بہت بعد میں سامنے آئی۔]

آئندہ تیس برسوں میں بھی اقبال نے اپنے نتائج میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی:



جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم پیر مر رہا ہے  
جسے فرنگی مفاہروں نے بنا دیا ہے قمارخانہ ۴

خبر ملی ہے، خدایانِ بحر و بر سے، مجھے  
فرنگ، رہ گذرِ سیل بے پناہ میں ہے ۵  
ناقدانہ ردِ عمل کے سلسلے میں علامہ اقبال کے ایک خط کا ذکر ضروری ہے۔ وحید احمد  
کے نام کے ستمبر ۱۹۲۱ء کو لکھتے ہیں:

اس زمانے میں سب سے زیادہ بڑا دشمن، اسلام اور اسلامیوں کا، نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال  
ہے۔ پندرہ برس ہوئے، جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا  
اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی  
آب دہوانے مجھے مسلمان کر دیا۔ ۶

اس اعتبار سے وہ یورپ اور وہاں کے صاحبانِ حکمت و دانش کے بھی ممنون ہیں۔  
اقبال کی اس حکیمانہ بصیرت میں، جس نے انھیں فکری و ذہنی توازن عطا کیا، مغربی علوم  
حکمت کے سرچشموں کا بھی دخل ضرور ہے۔  
درج بالا اقتباس میں، اقبال نے نسلی و وطنی قومیت کو دشمنانِ اسلام و ملتِ اسلامیہ  
میں سرفہرست قرار دیا ہے۔ فی الحقیقت اقبال کی ذہنی تبدیلی میں تین عناصر کا رفرما تھے:

- ۱- مغرب کی لحدانہ مادہ پرستی
- ۲- علاقائی اور وطنی قومیت کا تصور

۳- لادین سیاست

اگرچہ اقبال، مغرب کی تمدنی اور معاشرتی خوبیوں، جیسے: وقت کی پابندی، صفائی،  
کاروباری دیانت، محنتِ پیہم اور سلیقہ شعاری وغیرہ کے قائل ہیں اور اس کی صنعتی ترقی، سائنسی  
ایجادات، روشنی علم و ہنر اور اختراعی و تخلیقی کاوشوں کے بھی مددِ اح ہیں، مگر انھیں اندیشہ تھا کہ ہم

مشینی ترقی کے ظاہری طعناقیق ہی میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں۔ Reconstruction کے پہلے خطبے میں ایک جگہ کہتے ہیں:

..... the world of Islam is spiritually moving towards the West. There is nothing wrong in this movement, for European culture, on its intellectual side, is only a further development of some of the most important phase of the culture of Islam. Our only fear is that the dazzling exterior of European culture may arrest our movement and we may fail to reach the true inwardness of that culture. ۷

علامہ اقبال نے ہمیں متوجہ کیا کہ:

فسادِ قلب و نظر ہے، فرنگ کی تہذیب  
کہ روح، اس مدنیت کی، رہ سکی نہ عقیف  
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید  
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف ۸

اقبال نے تہذیبِ حاضر کو اس کے باطن میں اتر کر اور گہرائی میں جا کر دیکھا تو ان پر اس کی اصلیت ظاہر ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی خیرہ کن چمک دمک اور صناعی، فقط چند جھوٹے ٹنگوں کی ریزہ کاری ہے:

نہ کر، افرنگ کا اندازہ، اس کی تابناکی سے  
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے، اس جوہر کی، بڑاقتی ۹

اس سلسلے میں بالِ جبریل کی نظم ”لینن“ میں ہمیں ایک نہایت جامع تبصرہ ملتا ہے:

یورپ میں بہت، روشنی علم و ہنر ہے      حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں، ہے یہ ظلمات  
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں      گرجوں سے کہیں بڑھ کے، ہیں بنگلوں کی عمارات  
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جو ہے      سود ایک کا، لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

فکرِ اقبال اور مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات  
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس کیا، کم ہیں، فرنگی مدیت کے فتوحات؟  
وہ قوم، کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات  
ہے دل کے لیے موت، مشینوں کی حکومت احساسِ مرّت کو کچل دیتے ہیں، آلات

بنیادی بات یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب کی بنیاد الحاد و لادینیت پر ہے: ع

لبالب، شیشہ تہذیب حاضر ہے، مے لاسے

اقبال کے نزدیک الحاد جملہ برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کے منطقی نتائج بہت دور رس  
ہیں۔ نہ معاد کا تصور، نہ فکرِ آخرت، بس دو دن کی زندگی ہے: ”باہر بہ عیش کوش کہ عالم  
دوبارہ نیست“۔۔۔ اور: ”چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی“۔۔۔ لادینی طرزِ فکر و عمل کا نتیجہ  
اہل یورپ کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا:

یورپ از شمشیر خود، بسمل فقاد زیرِ گردوں، رسمِ لادینی نہاد ل

عہدِ جدید کا متمدن اور مہذب انسان ہر قدم پر منفعیتِ مادی کا طلب گار ہے۔  
زراندوزی کے لیے طرح طرح کی مالیاتی اسکیمیں، سود، بیمہ، لائری، پرائز بانڈ اور  
اشتہار بازی کے ذریعے مضر صحت اور مخرب اخلاق اشیا کی مصنوعی طلب آفرینی ہے خدا،  
مذہب، اخلاق، رواداری، روحانیت، انسانیت، سب کچھ پس پشت۔ خدا فراموشی، لادینی  
ماڈہ پرستی کا سبب بھی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ بھی۔۔۔ گویا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ساری تگ  
و تاز کا منتہا و مقصود درخشندہ فلزات کا حصول ہے۔ پھر اس ماڈہ پرستانہ ہوس نے سرمایہ داری  
کے اس مکروہ نظام کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں یورپ کی بڑی بڑی وطن پرست قوموں کے  
درمیان (جو سب دینِ مسیحی کی پیروکار تھیں اور تہذیبِ نو کی علم بردار بھی) معاشی مفادات،  
کاروباری اغراض اور نوآبادیاتی رقابتیں رنگ لائیں۔ باہمی عداوتیں، نفرتیں، سازشیں،  
سیاسی ہلاک، منافقانہ معاہدے مگر نام: مجلسِ اقوام (League of Nations)۔۔۔

فی الحقیقت برطانیہ، فرانس، اٹلی اور روس آپس میں سخت دشمن تھے، مگر سامراجی اور  
مادی مفادات نے انھیں متحد کر دیا، اور یہ اپنے ہم مذہب جرمنی اور آسٹریا کے خلاف صف آرا

ہو گئے۔ ہر فریق کا ایک ہی مسئلہ تھا کہ وہ اپنے حق سے زیادہ ماڈی فوائد کے حصول، اپنی سلطنت کی وسعت اور دوسروں پر غلبہ پانے کا خواہش مند تھا۔ جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) نے اقبال کے خدشوں کی تصدیق کر دی۔ بے شک تہذیبِ مغرب کے علم برداروں نے امن و انصاف اور ترقی و خوش حالی کے لیے ”مجلسِ اقوام“ قائم کر لی تھی، مگر اقبال کی بصیرت نے بجا طور پر، اسے ”کفنِ چوروں“ کی ایک جماعت قرار دیا۔ مغربی استعمار کی شاطرانہ سیاست میا کاولی [”مرسلے از حضرت شیطان“] کے فلسفے پر قائم تھی۔ اس ”باطل پرست“ نے سیاست کاری اور استعمارانہ مار دھاڑ کے لیے مکاڑی، حیلہ بازی، دروغ گوئی اور عہد شکنی کو عین جائز، بلکہ ضروری قرار دیا تھا۔ اس ابلیسی نظام کی تمدنی یلغار، ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں کو مغلوب کرنے کے لیے، اب بھی جاری ہے۔ کہیں یہ ملوکیت کی شکل میں ہے، کہیں اشتراکیت کے بھیس میں اور کہیں جمہوریت کے لباس میں، مگر اقبال کہتے ہیں:

”ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس“۔

در اصل علامہ اقبال ”جمہوری تماشے“ کے کچھ زیادہ قائل نظر نہیں آتے اور رائج الوقت تصورِ جمہوریت، ان کے حلق سے نہیں اترتا۔<sup>۱۴</sup> اقبال کے زمانے میں برطانوی نظم حکومت، دنیا کا سب سے بڑا اور عمدہ نمونہ جمہوریت خیال کیا جاتا تھا، مگر دنیا کا سب سے بڑا استعمار بھی یہی برطانیہ تھا، ع

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

مغرب نے تہذیب، تمدن، ثقافت، کلچر، آزاد خیالی، لبرل ازم، انسانی حقوق<sup>۱۵</sup> تحریکِ آزادی نسواں، جمہوریت، اشتراکیت، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، جدید ذرائع ابلاغ، نیا عالمی نظام، عالم گیریت، تعمیر نو، کوا کولا، میک ڈونلڈ، کے ایف سی اور کرکٹ اور اسی طرح کے دسیوں مختلف ناموں، طرح طرح کے حیلوں بہانوں اور لبھانے والے منصوبوں کے ذریعے، اہل مشرق پر جو استعماری یلغار<sup>۱۶</sup> کی ہے، اس نے ہمیں کیا دیا ہے؟ اور کیا سکھایا ہے؟ ع

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس

ایک روز افزوں ہوسِ زر، اخلاقی اقدار کی نفی، سنگ دلی، عقل کی تیزی مگر دل کی خرابی،

دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک ---

خود مغرب کا اپنا کیا حال ہے؟ قمار بازی، سے خواری، بے حجابی اور زن تہی آغوش۔ مغرب میں مردوں نے اپنی عیش پرستی اور جنسی بے راہ روی کی تسکین کے لیے عورت کو گھر سے باہر نکالا، اور نام دیا اسے ”آزادی نسواں“ کا۔ پھر امومت پر جو کاری ضرب لگائی گئی اس نے مغرب میں خاندانی نظام کی چولیس ہلا دی ہیں۔ اولڈ پیپلز ہوم، بن بیاہی مائیں اور مجہول النسب بچے لے۔

Time کی ایک سروے رپورٹ (جنوری ۱۹۹۵ء) کے مطابق امریکا میں ہر اکیسویں منٹ میں ایک قتل ہوتا ہے۔ ہر ۲۰ سیکنڈ میں ایک موٹر چوری ہو جاتی ہے۔ بے حد حساب ایجادات اور اُن کی مدد سے آسائشوں بھری زندگی بجا اور چاند تارے بھی مسخر، مگر تسکین جسم کے باوجود، روح تشنہ اور تہائی اس سے سوا کچھ ستاروں کی گزرگا ہوں کا تو پتا چل گیا، مگر دل کی دنیا بدستور تارک ہے۔ بیسیوں مغربی مفکر اور فلسفی اس لادین تمدن کی ناکامی کی گواہی دے رہے ہیں۔ مگر مغرب اپنی پوری استعماری قوت اور وسائل کو بروے کار لاتے ہوئے ہمیں بھی اسی تہذیبی بربادی، خاندانی تباہی اور روحانی و اخلاقی دیوالیے پن سے دوچار کرنے میں لگا ہوا ہے۔

علامہ اقبال کے زمانے میں مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار کا بڑا مظہر اس کا نوآبادیاتی نظام تھا۔ استعمار نے ایشیا اور افریقہ کی بیشتر اقوام کو اپنی ہوس کے پنجے خونیں میں جکڑ رکھا تھا۔ جن قوموں پر سامراجی براہ راست غلبہ نہ پاسکے، انھیں بھی شاطرانہ سیاست، عیاری و مکاری اور فریب کاری کے مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے اپنا ذہنی اور ثقافتی غلام بنا رکھا تھا۔ عالم انسانی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اقبال نے پس چہ باید کہو د میں بڑی درد مندی سے اقوام شرق کو اس طرف متوجہ کیا ہے:

آدمیت زار نالید از فرنگ	زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد	زیر گردوں رسم لادینی نہاد
گرگے اندر پوتین برہ	ہر زماں اندر کمین برہ

مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست آدمیت را غمِ پنہاں ازوست  
درنگاہش آدمی آب و گل است  
کاروانِ زندگی بے منزل است ۱۸

مغرب پر یہ تنقید اقبال نے اس زمانے میں کی جب پورا مشرق اور عالم اسلام، مغرب کے سامراجی تسلط میں جکڑا ہوا تھا اور اُسے مغرب کی تہذیبی اور تمدنی یلغار کا سامنا تھا۔ اقبال کی تنقید بے حد جرأت مندانہ تھی۔ ہماری فکری اور شعری وادبی تاریخ میں مغرب سے مرعوبیت کے خلاف ایسی بھرپور آواز اٹھانا، اقبال کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:

سب سے اہم کام جو اقبال نے انجام دیا، یہ تھا کہ انھوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی۔ [اس سے] مسلمانوں پر مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی، وہ کافور ہونے لگی، اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبال کا کارنامہ، سب سے بڑھ کر ہے۔ ۱۹

علامہ اقبال ۱۹۳۸ء میں دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ زوال پذیر مغرب میں اب بھی خاصا دم خُم باقی تھا، چنانچہ کمزور قوموں پر اس کی مجرمانہ یلغار برابر جاری رہی۔ دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۴ء) میں اس کے جرائمِ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم باری کا سیاہ داغ امریکا کی پیشانی پر ثبت ہے اور ہمیشہ اس کی سفاکی کی یاد دلاتا رہے گا مگر وہ اپنی داغ دار پیشانی کے باوجود شرمندہ نہیں اور عالمِ انسانیت کے خلاف اس کی سازشیں آج بھی جاری ہیں:

درجنیوا، چیت غیر از مکرو فن صید تو، ایس میش و آں نچخر من  
نکتہ ہا کو می نہ گنجد درخن یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن ۲۰  
خاص بات یہ ہے کہ اب استعماریوں کی مجرمانہ یلغار کا نشانہ اسلامی اقوام ہیں۔ انھوں نے شرقِ اوسط کے مسلمانوں پر خلیج کی جنگ مسلط کی، اور ان کے پاس دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی، وہ ”کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی“۔۔۔ پھر ”شیوہ تہذیب نو، آدم

فکرِ اقبال اور مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار

دری ست، کا ایک مظاہرہ بوسنیا میں کیا گیا۔ پھر روس کے ذریعے افغانستان میں یہی عمل دہرایا گیا، اور آج بھی نہ صرف افغانستان بلکہ عراق، کشمیر، فلسطین اور شیشان میں درندگی و آدم دری کا یہی کھیل کسی نہ کسی شکل میں، براہ راست یا بالواسطہ جاری ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بیشتر مسلم حکمران مغرب کی ان مجرمانہ سرگرمیوں پر مہربلب ہیں اور مغرب کی خوشامد اور چالپوسی میں لگے ہوئے ہیں۔ اقبال اُن سے سوال کرتے ہیں:

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ      تا کجا در قیدِ زتارِ فرنگ؟ ۷۱

اور: ع

از کفن دُرداں ، چه امیدِ کشاد؟ ۷۲

اس مایوسانہ صورتِ حال میں فکرِ اقبال آج بھی ہماری راہ نما ہے۔ وہ افراد، ادارے، تحریکیں اور ممالک قابلِ تحسین ہیں، جو اقبال کے ہم آواز ہو کر مغرب کی اس یلغار کے خلاف مدافعت کر رہے ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس ضمن میں ماضی قریب میں ایران اور سوڈان کا رویہ جرأت مندانہ رہا۔ ترکی میں وزیر اعظم نجم الدین اربکان بھی اپنے مختصر عرصہ اقتدار میں مغرب کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے مگر لادینی قوتوں نے، جنہیں استعماریوں کی پشت پناہی حاصل تھی، انہیں رخصت ہونے پر مجبور کر دیا۔

بیسویں صدی کے ان آخری سالوں میں فکرِ اقبال، مغرب کی استعماری یلغار سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمیں، یعنی ”دعیرِ اُمت“ کو، تنظیم نو اور صف بندی کی تلقین کر رہی ہے:

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں      آں یڈ بیضا برآر از آستیں  
خیز و از کارِ امم بکشَا گرہ      نشہ افرنگ را از سر بنہ  
نقشے از جمعیتِ خاورِ فگن

وا ستاں خود را زدستِ اہرمن ۷۳

(یہ مقالہ، خانہ فرہنگِ جمہوری اسلامی ایران لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ ”بین الاقوامی فکرِ اقبال سیمی ناز“

۸، نومبر ۱۹۹۶ء میں پڑھا گیا۔ مطبوعہ: ماہ نامہ علامت لاہور، نومبر ۱۹۹۶ء۔۔۔ تجدید نظر: اکتوبر ۲۰۰۳ء)

## حوالے اور حواشی

- ۱- بالِ جبریل: ص ۴۰۔
- ۲- ”حیاتِ اقبال کا سبق“، مشمولہ: جواہر، اقبال نمبر، مکتبہ جامعہ دہلی، طبع دوم ۱۹۴۰ء، ص ۶۵-۶۶۔
- ۳- بانگِ درا:، ص ۱۴۱۔
- ۴- بالِ جبریل: ص ۱۳۰۔
- ۵- ایضاً، ص ۶۹۔
- ۶- انوارِ اقبال، ص ۱۷۶۔
- ۷- Reconstruction، ص ۶۔
- ۸- ضربِ کلیم: ص ۷۱۔
- ۹- بالِ جبریل: ص ۵۸۔
- ۱۰- ایضاً، ص ۱۰۷-۱۰۸۔
- ۱۱- پس چہ باید کرد: ص ۴۳۔
- ۱۲- جدید معاشیات کا باوا آدم ایڈم سمٹھ (Adam Smith)، سرمایہ داروں کی زر پرستانہ ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے، ایک جگہ لکھتا ہے: کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہوں اور ان کی صحبت، پبلک کے خلاف کسی سازش اور قیمتیں چڑھانے کے لیے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ تقریبات تک میں مل بیٹھنے کا جو موقع مل جاتا ہے، اس کو بھی یہ حضرات اس جرم سے خالی نہیں جانے دیتے۔ (بحوالہ: اسلام اور جدید معاشی نظریات: سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۹)۔ سرمایہ داری کے علاوہ، خدا فراموشی اور لادینی مادہ پرستی کی ایک دوسری شکل اشتراکیت کی ہے، جس کا پہلا نمونہ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے خون آشام ”سرخ سویرے“ کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ روس کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار سولزے نٹسن نے جنہیں منحرف قرار دے کر روس سے جلا وطن کر دیا گیا تھا، ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ آخر وہی انقلاب نے جو چھ کر ڈ انسانوں کو نگل لیا، تو اس کی بنیادی وجہ کیا تھی، تو اس کا صحیح ترین اور مختصر جواب یہ ہے کہ ”لوگ خدا کو بھول گئے“۔
- ۱۳- ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو طلبہ یونین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سپاس نامے کے جواب میں علامہ اقبال نے کہا: ”تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے، وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ ڈیما کریسی



فکرِ اقبال اور مغرب کی تمدنی اور استعماری یلغار

ہے، اور جو بمقدار کثیر، آئندہ آنے والی ہے، وہ، افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھائی۔ ذاتی طور پر میں اس ڈیما کریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے۔۔۔“ (گفتارِ اقبال، ص ۱۰۳-۱۰۴)

۱۴- ”حقوق انسانی“ کی اصطلاح کو بھی استعماری طاقتوں، خصوصاً امریکانے، کمزور اور معتبوب قوموں کے استحصال کا ذریعہ بنادیا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ، ڈاکٹر صفدر محمود نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”جون ۱۹۹۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمی نار کے ضمن میں مجھے سان فرانسسکو جانے کا موقع ملا۔ اس سیمی نار میں ایشیائی ممالک کے اسکالرز کے علاوہ مختلف امریکی یونیورسٹیوں سے بھی ممتاز پروفیسر صاحبان بلائے گئے تھے۔ سیمی نار کے آغاز سے ایک روز قبل میں نے ٹیلی وژن آن کیا تو ایک دلچسپ خبر مع تبصرہ سننے کو ملی۔ کیلی فورنیا کی ریاست میں جنگلات کے وسیع ذخیرے پائے جاتے ہیں، کیونکہ وہاں عمارت کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ خبر یہ تھی کہ کٹائی کے دوران ماہرین جنگلات کو اچانک پتا چلا کہ اس جنگل میں ایک اٹو صاحب نے اپنا مستقل ”گھر“ بنا رکھا ہے اور جب سے درختوں کی کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اٹو صاحب اُداس رہنے لگے ہیں۔ اٹو کی اداسی کی خبر سے اس علاقے میں احتجاج ہوا اور کیلی فورنیا کی حکومت نے جنگل کی کٹائی روک دی، جس سے لکڑی کی قیمت میں اضافہ ہو گیا اور گھروں کی تعمیر قدرے مہنگی ہو گئی۔ میں نے یہ ساری خبر اور اس پر تبصرہ ٹیلی وژن پر سنا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اگلے دن سیمی نار کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے ممتاز امریکی پروفیسر صاحبان سے اس خبر کا تذکرہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس سے آگاہ تھے، لیکن جب میں نے ان سے ذکر کیا تو ان کے چہرے خوشی سے، گلاب کی مانند کھل گئے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے یہ سوال داغ دیا: آپ نے ایک پرندے کی اداسی کی خاطر جنگل کی کٹائی روک کر لکڑی کی قیمت میں اضافہ برداشت کر لیا، لیکن چار پانچ ماہ قبل عراق کے معصوم شہریوں پر بموں کی بارش کی جارہی تھی، تو آپ کیوں خاموش رہے؟ کیا آپ کو ایک جانور، مسلمان کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے؟ میرے اس سوال سے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ اس ایک واقعے سے آپ امریکا کی، انسانی حقوق سے کٹ منٹ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ (روزنامہ جنگ لاہور، ۲۲ جنوری ۱۹۹۳ء)

۱۵- استعمار، سرمایہ دارانہ ہوا اشتراکی، اس کی یلغار، اس کی چالیں، چالبازیاں اور مکاریاں کم و بیش ایک جیسی رہی ہیں۔ معروف اردو شاعر منیر نیازی کے تین شعر ملاحظہ کیجیے:

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبارِ زرگری

سب کی دہشت ایک جیسی، سب کی گھاتیں ایک سی

سارے منظر ایک جیسے، ساری باتیں ایک سی  
سارے دن اب ایک سے ہیں، ساری راتیں ایک سی  
اب کسی میں اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں  
سب قبیلے ایک ہیں، اب ساری ذاتیں ایک سی

۱۶- نیوزویک نے جنوری ۱۹۹۷ء میں Wedding Bells are not ringing کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع کی، جس کے مطابق پورے یورپ میں باقاعدہ شادی کا رجحان بتدریج کم ہو رہا ہے۔ یونان میں ۳۳ فی صد، اٹلی میں ۷۰ فی صد اور اسپین میں ۱۰ فی صد لوگ شادی نہیں کرتے۔ جرمنی ۱۵ فی صد، پرتگال ۱۷ فی صد، آسٹریا ۲۶ فی صد، فن لینڈ ۳۱ فی صد اور برطانیہ کے ۳۲ فی صد لوگ شادی کیے بغیر کام چلاتے ہیں۔ شادی نہ کرنے کا سب سے زیادہ رجحان، یورپ کے تین خوش حال ترین ممالک میں ہے، یعنی ناروے ۴۵ فی صد، ڈنمارک ۴۶ فی صد اور سویڈن ۵۰ فی صد۔ قدرتی طور پر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے حسب نسب کا علم نہیں ہوتا۔

پولینڈ میں مقیم ایک پاکستانی طالب علم نے اپنے ایک دوست کے حوالے سے ایک عبرت ناک مشاہدہ بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کھانے کے وقفے میں ایک ریستوران میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر میں نے ”ہوں، ہاں“ کر کے اسے ٹال دیا اور اوپر بار میں جا کر بیٹھ گیا۔ چائے کا آرڈر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی پھر آ کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اب میں نے سوچا کہ میں ذرا اس کی بات سنوں تو، یہ بہت پریشان لگتی ہے۔ شاید میں اس کی مدد کر سکوں۔ میں نے سوال کیا: آپ کچھ بات کرنا چاہتی ہیں؟ اس نے کہا: ہاں! میرا ایک بے وقوفانہ سوال ہے۔ بہت سارے افراد سے پوچھ لیا ہے، نفی میں جواب ملتا ہے، جب کہ میں اس کے مثبت جواب کی تلاش میں ہوں۔ میرا تجسس اور بڑھا اور میں نے اس سے کہا کہ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ اس دوران چائے پہنچ چکی تھی۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگی کہ میری ماں کا ایک بوائے فرینڈ تھا۔ اس کے لطف سے میں دنیا میں آ گئی۔ میں نے جب سے بات کرنی سیکھی ہے، میں اپنی والدہ سے یہی پوچھ رہی ہوں کہ میرا باپ کون تھا؟ اور کیسا تھا؟ اور اس نے بے شمار مرتبہ اس کا ذکر کچھ یوں کیا ہے کہ وہ ایک عرب طالب علم تھا۔ تقریباً چھ فٹ قد کا تھا، ابھرے نقش و نگار کا مالک، گندمی رنگ تھا اور لٹریچر میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میں اس کی تلاش میں ہوں۔ جب بھی اس طرح کا کوئی آدمی مل جاتا ہے، میں اس کے قریب چلی جاتی ہوں کہ شاید مجھے اپنی شناخت مل جائے۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا، مرد کو برا بھلا کہا۔ وہ چائے پی کر چلی گئی اور میں

دیر تک سوچوں میں گم رہا۔

راوی کہتے ہیں کہ جب میرے دوست نے یہ کہانی ختم کی تو میں نے پوچھا: ایسے کتنے لوگ ہوں گے، جو اپنی شناخت کی تلاش میں ہوں گے؟ اس نے جواب دیا: حکومت نے کام بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ اب پاسپورٹ میں باپ کے نام کی جگہ ماں کا نام لکھا جاتا ہے، کیونکہ ماں کا پتا چل جاتا ہے، باپ کا پتا لگانا بہت ہی مشکل ہے۔ (ماہنامہ افکارِ معلم، لاہور، مئی ۱۹۹۲ء)

۱۷- تنہائی کی بدترین صورت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ بوڑھے والدین، جو آخر عمر میں دیکھ بھال اور نگہداشت کے سب سے زیادہ مستحق ہوتے ہیں، نہ صرف اپنے بچوں کی توجہ سے محروم رہتے ہیں، بلکہ ان کا بڑھاپا، ’اولڈ ہاؤس‘ میں بے کسی اور بچوں اور پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کو دیکھنے کی حسرت میں گزرتا ہے۔۔۔ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ایامِ جوانی میں وہ بھی اولاد کی ذمے داریوں اور ان کے حقوق ادا کرنے کے بجائے اپنے عیش و عشرت، نفس پرستی اور ماڈی آسودگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ معروف عربی مجلے البحوث الاسلامیہ کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر محمد بن سعد اپنے سفرِ امریکا کا ایک مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ۱۹۸۰ء میں سردیوں کے موسم میں، اپنے دوستوں کے ہمراہ کلورڈا و سپرنگ میں مشرقی کھانوں کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ سردی بہت شدید تھی۔ ہم جلدی جلدی چل رہے تھے۔ راستے میں ہم نے ایک نوجوان لڑکی کو سڑک کے کنارے کھڑا سردی میں کانپتے دیکھا۔ وہ ہرگزرنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمارے ایک دوست کو تجسس ہوا، اُس نے امریکی معاشرت کی جھلک دیکھنے اور اس کے اصلی رنگ کو تک دیکھنے کے شوق میں ہمیں بھی روک لیا۔ قریب جا کر اُس لڑکی سے اُس کی اس قابلِ رحم حالت کا سبب دریافت کیا، تو پتا چلا کہ مجبوراً گھر سے نکلی ہے، کیونکہ اُس کا باپ اس سے مکان کا کرایہ اور ہفتہ وار مصارف کی رقم طلب کر رہا ہے۔ باپ اپنی نوجوان بیٹی کی رہائش اور خوراک کی ذمے داری اٹھانے کو تیار نہیں۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال ہے اور امریکی قانون کی رُو سے اس عمر کے ہر فرد کو اپنی کفالت کی ذمہ داری خود پوری کرنی چاہیے۔ (ہفت روزہ المسلمون، دسمبر ۱۹۸۵ء)

۱۸- مثنوی پس چہ باید کرد، ص ۴۳۔

۱۹- اقبال اور پاکستان: کنول آرٹ پریس لاہور، [۱۹۷۰ء] ص ۷، ۸۔

۲۰- پس چہ باید کرد، ص ۴۵۔

۲۱- ایضاً، ص ۴۶۔

۲۲- ایضاً، ص ۴۵۔

۲۳- ایضاً، ص ۴۶۔



## اقبال اور عالمی نظام کی تشکیلِ جدید

ادبیاتِ عالم کی تاریخ میں کم ہی ایسے شاعر ہوں گے، جو علامہ اقبال کی طرح یہ دعویٰ کر سکیں کہ: ع

من نوائے شاعر فردا ستم

اکیسویں صدی کے آغاز میں بساطِ عالم پر انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اقبال کا فکر آج بھی تروتازہ، عصرِ حاضر کے لیے زندہ و بامعنی اور دورِ نو کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبال نہ صرف اپنے دور کی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور انسانی صورتِ حال کا گہرا شعور اور ادراک رکھتے تھے، بلکہ انھیں مستقبل کے بارے میں بھی ایک حکیمانہ بصیرت عطا ہوئی تھی۔ انھیں بلا تامل آنے والے زمانوں کا شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اقبال کا عہدِ حیات، ایک نوآبادیاتی دور میں بسر ہوا۔ نہ صرف ان کا وطن ہندوستان، بلکہ پورا مشرق اور افریقہ، مغربی استعمار کے خونیں پنجوں میں جکڑا، کراہ رہا تھا۔ انگریزوں کے عہدِ تسلط میں، اقبال خود کو غلامانہ ماحول سے کبھی ہم آہنگ نہ کر پائے اور غلامانہ ذہنیت سے تو انھیں قطعی نفرت تھی۔ وہ ایک آزاد منش انسان تھے اور زندگی اور کائنات کے بارے میں ان کا اندازِ نظر، عام لوگوں سے مختلف، بلکہ منفرد تھا۔ اپنے ماحول

اور احوال و ظروف نے انہیں ہمیشہ بے چین و مضطرب رکھا، چنانچہ یہ بالکل فطری ہے کہ وہ اپنے معاشرے، اپنے وطن، اپنی ملت، عالم انسانیت اور نظام عالم سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ان کے ہاں ابتدا ہی سے تبدیلی کی ایک شدید خواہش نظر آتی ہے۔ غلام ہندستان میں اپنے ہم وطنوں کی حالتِ زار پر ان کی فکر مندری ملاحظہ ہو:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں  
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے  
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں  
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے، اے ہندوستان والو!  
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستاںوں میں<sup>۱</sup>

وہ ہندی مسلمانوں کی حالتِ زار پر بہت فکر مند تھے جو جدید تعلیم، ملازمتوں اور مادی وسائل کے لحاظ سے، ہندو اکثریت کے مقابلے میں کہیں پیچھے تھے۔ مسلم دنیا کی صورتِ حال اور بھی ابتر تھی۔

بیشتر مسلم علاقے برطانوی، فرانسیسی اور روسی استعمار کے غلام تھے۔ مسلم اُمّہ معاشی بد حالی و پس ماندگی اور ایک مجموعی زوال و انحطاط کا شکار تھی۔ بساطِ عالم پر خود غرضی، بے انصافی اور قوم پرستی کا دور دورہ تھا۔ مادہ پرست استعماری طاقتوں کی باہمی رقابتیں، پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) پر منتج ہوئیں، اور عالم انسانیت کو اپنی تاریخ کی بے مثال خون ریزی اور غارت گری سے دوچار ہونا پڑا۔ بقولِ اقبال: یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی، جس نے پرانی دنیا کے نظام کو، قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا۔<sup>۲</sup> مستقبل میں اس ہولناک صورتِ حال سے بچنے کے لیے مجلسِ اقوام (League of Nations) قائم ہوئی، تو اقبال نے نیٹو کا فتور بھانپ لیا۔ ان کی نگاہ میں یہ ادارہ استعماری طاقتوں کے لیے، تکمیلِ عزائم

کا ایک ادارہ تھا۔ سو، مجلسِ اقوام کو اقبال نے 'کفنِ چوروں کی جماعت' قرار دیا ہے:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند  
بہر تقسیم قبور، اچھنے ساختہ اند<sup>۳</sup>

اقبال کی یہ رائے غلط نہ تھی کیوں کہ مبینہ طور پر اصلاحِ احوال کے لیے مجلسِ اقوام کی تمام تر کوششوں کے باوجود، دنیا میں ظلم و زیادتی اور تشدد و عنارت گری کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ مذہبی و قومی تعصب اور لسانی و نسلی تفریق نے اقوام کی باہمی نفرتوں، دشمنیوں اور آویزشوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

اقبال کی نظر میں اس صورتِ حال کا ایک بنیادی سبب، مادیت پر مبنی قوم پرستی کا وہ نظریہ تھا جس پر یورپ کے سبھی سرمایہ دار ملک کاربند تھے، اور اسی قوم پرستانہ ہوس اور قومی استیلا و استکبار نے انھیں جوع الارض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اوائلِ عمر میں تو اقبال خود بھی بہت پرجوش قوم پرست (zealous nationalist) تھے، لیکن قیامِ یورپ (۱۹۰۵ء-۱۹۰۸ء) کے دوران میں ذہنی طور پر، وہ اپنے بقول ایک "انقلابِ عظیم" سے دوچار ہوئے۔ ایک خط میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا"۔<sup>۴</sup> چنانچہ انھوں نے اسی زمانے میں اپنے ایک مضمون Political Thought [خلافتِ اسلامیہ، ۱۹۰۸ء]<sup>۵</sup> میں نسلی اور جغرافیائی قوم پرستی کی تردید کی۔ ۱۹۱۱ء میں خطبہِ علی گڑھ (The Muslim Community)<sup>۶</sup> کے میں یورپ کی جدید قوم پرستی کو 'ڈپلومیٹک سازشوں' کا منبع قرار دیا۔ اس سلسلے میں ان کا (غالباً) آخری مضمون 'جغرافیائی حدود اور مسلمان'،<sup>۷</sup> تصورِ ملت اور قومیت کا فرق بخوبی واضح کرتا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کے ریڈیائی پیغام میں، وہ اسپین کی خانہ جنگی کے حوالے سے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اہل اسپین ایک ہی نسل، قومیت، زبان اور مذہب کے باوجود ایک دوسرے کا گلا کیوں کاٹ رہے ہیں؟ اور اپنی ہی ثقافت اور تمدن کو اپنے ہاتھوں برباد کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ علامہ اقبال اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد پر تشکیل پذیر اتحاد، کبھی ایک مضبوط قوت نہیں بن سکتا۔<sup>۹</sup>

اقبال کے زمانے میں، ایک نمایاں نظریاتی قوت کی حیثیت سے اشتراکیت کا بہت چرچا تھا۔ روس میں ’سرخ سویرا‘ (۱۹۱۷ء) اقبال کے سامنے ہی طلوع ہوا تھا۔ ’نصیر راہ‘ (۱۹۲۱ء) اور پیغام مشرق (۱۹۲۳ء) کی مختلف نظموں میں انقلاب اکتوبر کے لیے ایک خیر مقدمی انداز ملتا ہے۔ اسی زمانے کی نظم ’طلوع اسلام‘ (۱۹۲۳ء) میں انھوں نے سرمایہ داری پر شدید تنقید کی۔ وہ نظام سرمایہ داری کے استحصالی مزاج اور سامراجی کردار پر افسردہ ورنجیدہ تھے:

ابھی تک آدمی، صیدِ زبونِ شہریاری ہے  
 قیامت ہے کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری ہے  
 نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی  
 یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے  
 وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو  
 ہوس کے پتھرِ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے  
 تدبیر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا  
 جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے ۱

پیغام مشرق کے دیباچے میں اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں“۔<sup>۱</sup> بہر حال اشتراکیت سے اقبال کی امید بہت وقتی اور عارضی ثابت ہوئی۔ اشتراکی روس، بعد ازاں ایک عالمی طاقت ضرور بنا مگر افغانستان پر جارحیت (۱۹۷۹ء) کے نتیجے میں ہمارے سامنے رُسا ہو کر پسا ہوا (۱۹۸۹ء)۔ افسوس ہے کہ کمزور قوموں کے لیے اس کا رویہ دھونس اور جارحیت کا تھا، اشتراکیت کے دورِ عروج ہی میں، اقبال نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی تعمیر میں، خرابی کی ایک صورت مضمحل ہے۔ وہ انسانی مسائل میں اضافہ تو کر سکتا ہے مگر انھیں حل کرنے یا کم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اقبال نے ایڈیٹر زمیندار کے نام، ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے خط میں روسی بالٹوزم کو، یورپ کی عاقبت ناندیشی اور



اقبال اور عالمی نظام کی تشکیل جدید

خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک ردِ عمل قرار دیا۔ ان کے نزدیک سرمایہ داری اور اشتراکیت، دونوں 'افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں'۔<sup>۱۲</sup> جاوید نامہ میں جمال الدین افغانی کی زبانی وہ کہتے ہیں:۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناغلبیب      ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب  
زندگی این را خروج آں را خراج      درمیان این دو سنگ آدم زجاج  
این بہ علم و دین و فن آرد نکست      آں برد جاں رازتن، ناں راز دست  
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل      ہر دو را تن روشن و تاریک دل<sup>۱۳</sup>  
آگے چل کر 'ابلیس کی مجلسِ شوری' (۱۹۳۳ء) میں تو اقبال نے واضح طور پر قرار دیا کہ مستقبل کے نظامِ عالم میں، اشتراکیت کا کوئی رول نہیں۔ ابلیسی طاقتوں کے لیے اصل خطرہ اسلام ہے۔۔۔ ع: مزدکیت، فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے۔<sup>۱۴</sup>

علامہ اقبال آخری زمانے میں تو سیاستِ حاضرہ سے کچھ ایسی مایوسی اور بیزاری کا اظہار کرنے لگے تھے کہ انھوں نے وفات سے دو برس پہلے شائع ہونے والے اُردو نظموں کے مجموعے ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) کو 'دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ' قرار دیا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے بالِ جبریل میں وہ کہہ چکے تھے:۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم

گزر اس عہد میں، ممکن نہیں بے چوبِ کلیم<sup>۱۵</sup>

اور ع: عصانہ ہو تو کلیسی ہے کارِ بے بنیاد<sup>۱۶</sup>۔۔۔ ان کے نزدیک 'مذہب، بغیر قوت کے محض فلسفہ ہے'۔<sup>۱۷</sup>

ضربِ کلیم میں ایک نظم ہے: 'زمانہ حاضر کا انسان'۔ اس میں وہ کہتے ہیں:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگا ہوں کا      اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا      آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا      زندگی کی شہ تاریک، سحر کر نہ سکا<sup>۱۸</sup>

حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں انسان کے اخلاقی زوال، شرفِ انسانی کی

تذلیل اور فساد فی الارض پر اقبال کے ہاں رنج و تاسف کا احساس گہرا ہو گیا تھا۔ وفات سے چار ماہ پہلے، سال نو (۱۹۳۸ء) کے پیغام میں انھوں نے دنیا میں استعمار کے جبر و غلبے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا:

.... the tyranny of imperialism struts abroad covering its face in the masks of Democracy, Nationalism, Communism, Fascism and heaven knows what else besides. Under these masks, in every conner of earth, the spirit of freedom and the dignity of man are being trampled underfoot in a way of which not even the darkest period of human history presents a parallel.<sup>۱۹</sup>

امپریلزم کا استبداد اپنا چہرہ، جمہوریت، قوم پرستی، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے کن کن نقابوں کی آڑ میں چھپا کر، گھات لگائے بیٹھا ہے اور اس پردے میں دنیا کے ہر خطے میں، آزادی اور وقارِ آدمیت کو پاؤں کے نیچے اس بری طرح کچلا جا رہا ہے کہ انسانی تاریخ کا تاریک ترین دور بھی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اقبال عالمِ انسانیت کی اس پریشان کن صورت حال پر افسردہ و رنجیدہ رہتے۔ اگرچہ ان کی شخصیت باطنی اعتبار سے بہت توانا تھی اور بدترین حالات میں بھی وہ سپر انداز ہوئے، نہ کبھی مایوس، تاہم ایک شاعر کی طبعی رومانویّت بعض اوقات انھیں مغموم کر دیتی۔ بحیثیت مجموعی وہ بہت رجائیت پسند انسان تھے اور کائنات میں انسان کی حیثیت، اس کے مستقبل اور دنیا جہان کے بارے میں ہمیشہ پُر امید رہے۔ ان کا فلسفہ خودی اور تصوّرِ عشق، انسان کو اس کی خلیفۃ الارض کی حیثیت یاد دلا کر اسے حوصلہ عطا کرتا اور تگ و تازِ حیات میں جد و جہد پر ابھارتا ہے۔ ہم عصر سیاسی و تہذیبی اور تمدنی و معاشرتی صورتِ حالات کا وہ برابر مطالعہ کرتے رہے، سوچتے رہے اور غور و فکر کرتے ہوئے اپنے ذہن میں مستقبل کے نقشے بناتے رہے۔ ان کی سوچ کا محور و مرکز انسان تھا۔ وہ سوچتے تھے، انسانی فوز و فلاح

اقبال اور عالمی نظام کی تشکیل جدید

کے لیے، بہتر مستقبل کے لیے، انسانیت اور عالم انسانیت کی تعمیر نو کے لیے۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن تھا (اور ہے) جب نظام عالم کی تشکیل، نئی بنیادوں پر کی جائے۔ سنجیدہ علمی و فکری معاملات پر، علامہ اقبال اپنے بعض فاضل دوستوں سے تبادلہ خیالات بھی کیا کرتے تھے، کبھی بالمشافہہ اور کبھی بذریعہ خط کتابت۔ ان کے خطوں اور گفتگوؤں میں یہ موضوع بھی زیر بحث آیا ہے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا:

دنیا اس وقت عجیب کش مکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے، اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے، جرمنی میں ماڈی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے، سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالتِ نزاع میں ہے، غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں، آپ کے خیال میں اسلام، اس جدید تشکیل کا کہاں تک مدد ہو سکتا ہے؟ اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے۔<sup>۲۰</sup>

اسی تاریخ کو، قریب قریب ایسے ہی خیالات کا اظہار، راغب احسن کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے۔<sup>۲۱</sup>

خیال رہے کہ ایک سال پہلے وہ یورپ کے سفر سے لوٹے تھے (فروری ۱۹۳۳ء)۔ مشاہداتِ یورپ ان کے ذہن میں تازہ تھے۔ ان کی شہرہ آفاق نظم 'مسجدِ قرطبہ' میں، اس مشاہدے کے اثرات اور ردِ عمل کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں اندلس کے تاریخی شہر قرطبہ میں، جب وہ اپنے آدرشوں کو تازہ کر رہے تھے، تو ان کا ذہن جست لگا کر صدیوں پیچھے چلا گیا، مگر ان کی چشمِ بصیرت آگے دیکھ رہی تھی۔ ماضی کے تناظر میں مستقبل مرکزِ نگاہ تھا۔ وہ عالمِ بیداری میں کسی اور زمانے کا خواب دیکھنے لگے:

آبِ روانِ کبیر، تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب  
عالمِ نو ہے ابھی پردہٴ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب<sup>۲۲</sup>  
نظم کے سیاق و سباق کو دیکھیں تو بالکل واضح ہے کہ یہ خواب بہ یک وقت

اُمتِ مسلمہ کی بیداری، انسانیت کی فوز و فلاح اور نظامِ عالم کی تشکیلِ نو کا خواب تھا۔ اقبال کے نزدیک یہ تینوں چیزیں باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ماڈرن پرست سرمایہ داری اور لادین اشتراکیت کی ناکامی کے بعد، نظامِ عالم کی تشکیلِ نو اور انسانی عجز و شرف کی بحالی کے لیے مسلم اُمت ہی ایک فیصلہ کن اور کلیدی رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، کیونکہ اس کے پاس اخلاقی اصولوں پر مبنی ایک ایسا ضابطہ حیات موجود ہے، جو انسان کے اپنے وضع کردہ قیاس و گمان کے بجائے ہدایتِ ربّانی اور وحی پر استوار ہے۔

اقبال اپنے فلسفیانہ تفکر اور برسوں کی سوچ بچار کے نتیجے میں اسلام کی اس صلاحیت کے قائل تھے کہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے والے در ماندہ انسان کو اسلام ہی ساحلِ مراد تک پہنچا سکتا ہے۔ اب ان کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ مسلم اُمت دنیا کے بیشتر خطوں میں نوآبادیاتی طاقتوں کی غلام تھی۔ مزید برآں وہ ایک ہمہ پہلو انحطاط کا شکار تھی۔

نظامِ عالم کی تشکیلِ نو کے ضمن میں علامہ اقبال نے کوئی باقاعدہ اور مرتب نقشہ یا منصوبہ تو نہیں چھوڑا، مگر بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ایران، افغانستان، وسطی ایشیا، مشرقی یورپ اور بحیثیتِ مجموعی عالمی سطح پر جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں (اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے)، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بڑی حد تک ان میں، اقبال کی امیدوں اور خوابوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

اقبال اپنی پیامبرانہ شاعری کے ذریعے ملت کے اصلاحِ احوال کے لیے کوشاں رہے۔ پہلے مرحلے میں انھوں نے برعظیم ہند کے شمال مغرب میں ایک آزاد مملکت کا تصور پیش کیا، جہاں مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہو۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے نام خطوں میں وہ کہتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کے مسائل کا حل شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ میں مضمر ہے، جو ایک آزاد اسلامی ریاست ہی میں ممکن ہے۔<sup>۲۳</sup> ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے، الحمد للہ اقبال کا ایک خواب پورا ہوا۔ مگر ان کی نظر برعظیم تک محدود نہ تھی، شمال مغرب میں وہ افغانستان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہسپانیہ کے سفر سے واپسی کے اگلے ہی

اقبال اور عالمی نظام کی تشکیل جدید

برس انھیں آزاد افغانستان کی چند روزہ سیاحت کا موقع ملا۔<sup>۲۴</sup> یہاں انھیں ایک نئی بیداری کا احساس ہوا۔ ان کے لیے باعثِ مسرت و اطمینان تھا کہ افغان، 'طلسمِ فرنگ' سے آزاد تھے۔<sup>۲۵</sup> افغان ان کے نزدیک ایک بہادر اور شجاع قوم تھی، مگر بد نظمی اور بے مرکزیت کا شکار تھی۔<sup>۲۶</sup> ان کے نزدیک افغانستان ایشیا کا بلقان ہے، اور افغانستان کا استحکام، مسلمانانِ ہندوستان اور وسطی ایشیا کے لیے وجہِ جمعیت و تقویت ہے: <sup>۲۷</sup>

آسیا یک پیکرِ آب و گل است

ملتِ افغان در آں پیکرِ دل است

از فسادِ او، فسادِ آسیا

از کشادِ او، کشادِ آسیا <sup>۲۸</sup>

یہ اقبال کی نیک تمناؤں کا نتیجہ (اور ان کی توقعات کے عین مطابق) تھا کہ افغان قوم، روسی فوج کی جارحانہ مداخلت (دسمبر ۱۹۷۹ء) کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک تاریخ ساز اور بے مثال مزاحمت کے بعد، انھیں آمو کے اس پار رخصت ہونے پر مجبور کر دیا (فروری ۱۹۸۹ء)۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ روس میں اشتراکیت کی ناکامی، سوویت روس سے بالٹک ریاستوں کی علاحدگی، مشرقی یورپ کی خود مختاری و آزادی، دیوارِ برلن کا انہدام اور جرمنی کا اتحاد، نیز افغانستان سے روس کی ذلت آمیز اور عبرت ناک واپسی کے نتیجے میں رونما ہونے والی ایسی تبدیلیاں جن کی بنا پر امریکانے نیو ورلڈ آرڈر مرتب کیا، افغان جہاد ہی کا کرشمہ ہیں۔

افغانستان سے آگے علامہ اقبال کی نظریں وسطی ایشیا پر جمی ہوئی تھیں۔ اشتراکی غلبے کے بعد اہلِ سمرقند و بخارا، ایک عرصے تک کمیونسٹ استعمار کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔ انور پاشا ترکی سے چلے اور اس جہاد میں جا شریک ہوئے۔ اقبال نے اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی۔ خبر ملی (اگرچہ بعد ازاں یہ افواہ ثابت ہوئی) کہ انور پاشا بخارا پہنچ گئے ہیں اور ترکستان آزاد ہو گیا ہے، تو اقبال نے مسرت کا اظہار کیا اور آزادی ترکستان کی تاریخ نکالی: غیبِ یمنی انور (۱۳۴۱ھ) <sup>۲۹</sup> یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے

میں علامہ اقبال کا ذہن وسطی ایشیا میں مسلمانوں کی تحریک مزاحمت اور ترکوں کی بیداری کے تصورات ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ اکبر منیر کے نام ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھتے ہیں: 'ایشیا کی مسلم اقوام کی حرکت بھی کم حیرت انگیز نہیں'۔<sup>۳۱</sup> اسی زمانے میں وہ نئی بیداری کا مشاہدہ کرنے کے لیے ایران اور ترکی کا عزم سفر کرتے نظر آتے ہیں۔<sup>۳۲</sup> یہی زمانہ تھا جب انھوں نے معروف نظم 'نصیرِ راہ' لکھی، جس کا اختتام ان معنی خیز اشعار پر ہوتا ہے:۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خوابِ اسلام نے  
اے مسلمان! آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ!  
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود  
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا، یہ جہانِ پیر دیکھ!  
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں  
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!<sup>۳۳</sup>

ترک، وسطی ایشیا کی ایک جری اور بہادر قوم ہے۔ اس کا ایک شاندار ماضی ہے اور مستقبل میں وسطی ایشیا کی صورت گری میں بھی اس سے اہم کردار کی توقع کی جاسکتی تھی، مگر افسوس ہے کہ یہ ایران، ترکی، عراق اور وسطی ایشیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ علامہ اقبال کو رہ کر ان کے اتحاد کا خیال آتا تھا، اور ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا: 'وسطی ایشیا میں چار کروڑ ترک آباد ہیں، وہ متحد کیوں نہیں ہوتے،'۔<sup>۳۳</sup> انھوں نے ترکستان کو 'ایشیا کا دل' قرار دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ: 'دل آزاد ہو گیا تو باقی اعضاء و جوارح بھی اپنی زنجیریں آہستہ آہستہ اتار پھینکیں گے'۔<sup>۳۴</sup> اقبال کی ان امیدوں اور توقعات کو وسطی ایشیا کے موجودہ احوال و ظروف کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آج تاجکستان کے گلی کوچوں میں اقبال کے فارسی اشعار، نعروں کی صورت میں گونج رہے ہیں اور یہ ریاستیں، سوویت یونین کی غلامی کا قلاوہ گردن سے اتار پھینک کر آزاد و خود مختار ہو چکی ہیں۔

انقلابِ ایران (۱۹۷۹ء) افغانستان مزاحمت (۱۹۷۹ء-۱۹۸۹ء) اور وسطی ایشیا کی بیداری، امریکا کے زیرِ تشکیل نیو ورلڈ آرڈر کا ناگزیر پس منظر ہیں اور متذکرہ تینوں تبدیلیوں

اقبال اور عالمی نظام کی تشکیل جدید

میں علامہ اقبال کی شاعری ایک درجے میں اثر انداز ہو رہی ہے۔ شعرا اقبال کے اثرات نے کشمیر کی تحریک مزاحمت میں بھی اپنا رول ادا کیا ہے۔ یہاں بھی اقبال کی توقعات بر آنے کی صورت پیدا ہوگی۔ کشمیریوں کی مزاحمت کو اندھی فوجی قوت سے دبانے کی کوشش بالآخر ناکام ہوگی۔ افراد ہوں یا اقوام، افسوس ہے کہ تاریخ سے سبق سیکھنے کی دانائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ مس فارکوہرن کے نام ایک خط میں علامہ نے پتے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں: 'قوت کا حصول صرف حکمت و دانائی کے ذریعے ممکن ہے۔ جب قوت، حکمت و دانائی کا راستہ چھوڑ کر محض اپنے اوپر بھروسا کرنے لگتی ہے، اس کا انجام موت ہوتا ہے۔' ۳۵ ایٹمی ہتھیاروں، اسلحہ کے ذخائر اور مجموعی فوجی قوت کے لحاظ سے روس بہر حال ایک بڑی اور برتر طاقت (super power) تھی مگر اسے افغانستان میں اپنی فوجی برتری دکھانے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

ایشیا اور افریقہ سے استعماری طاقتوں کی رخصتی، مسلم افریقی اور ایشیائی ملکوں کی آزادی، روس میں کمیونزم کی ناکامی، مشرقی یورپ سے اشتراک جبر کا خاتمہ، عالم اسلام کی ذہنی بیداری اور دنیا کے مختلف خطوں میں حق و باطل اور ظالم و مظلوم کی ایک مسلسل اور مستقل آویزش و کش مکش، یہ سب حالات و واقعات اقبال کی رجائیت پسندی کی توثیق کرتے ہیں۔ ان کے مجوزہ نظام عالم کے لیے، ان کی وفات کے بعد کی نصف صدی میں، حالات کہیں زیادہ سازگار ہو چکے ہیں، تاہم ایک منصفانہ عالمی نظام کی تشکیل میں فلسطین کا قضیہ اور اس ضمن میں اسرائیل کا نامعقول رویہ اور سب سے بڑھ کر امریکا کا استعماری متکبرانہ اور یہودنواز طرز عمل ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اقبال کو فلسطین کے مسئلے سے بڑی دلچسپی رہی۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ قضیہ آسانی طے ہونے والا نہیں ہے، تاہم وہ اس بارے میں پُر امید ضرور تھے۔

مغرب کے بارے میں اقبال کا رویہ بالعموم شدید ناقدانہ رہا ہے، اور اس کے اسباب بالکل فطری ہیں، مثلاً: مسئلہ فلسطین ہی کے باب میں مغرب (اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) خصوصاً امریکا کا طرز عمل، واضح طور پر ایک رُخا اور جانب دارانہ رہا ہے۔ اسی

طرح مغرب نے اہل مشرق، بالخصوص مسلم اُمّہ کو اپنی عیارانہ سیاست اور استعماری غلبے کے ذریعے، پس ماندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بایں ہمہ، مغرب کے بارے میں اقبال کا رویہ معاندانہ نہیں ہے۔ وہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے قائل ہیں:

الْحِكْمَةُ ضَالَةٌ الْمُؤْمِنِ (حکمت و دانائی، مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے)۔ وہ مغرب کی حکمت اور تکنیکی ترقی سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، البتہ اس کی ظاہری چکاچوند سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مغرب کے باب میں ان کا مفاہمانہ اور متوازن رویہ ان کے مثبت ذہن کی عکاسی کرتا ہے، مگر خود مغرب کا طرزِ عمل کیا ہے؟ مغرب کی نمائندگی کی دعوے دار اور اس وقت کرہ ارض کی واحد سپر پاور امریکا، دنیا پر ایک ایسا ورلڈ آرڈر مسلط کرنے کے درپے ہے، جو محض اس کے اور اسرائیل کے مفادات کا ضامن ہو۔ اسی لیے اس نیو ورلڈ آرڈر کو بجا طور پر جیو ورلڈ آرڈر (Jew World Order) قرار دیا جا رہا ہے۔ اس صورت میں، اگر اقبال، مشرق کو اپنی امیدوں کا مرکز سمجھتے ہیں، تو یہ کچھ بے جا بھی نہیں۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ مشرق، خصوصاً مشرق کی مسلمان قومیں آگے بڑھ کر نظامِ عالم کی تشکیل نو میں اپنا کردار ادا کریں۔ گویا اس طرح اہل اسلام اور مسلم اُمّہ پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور نظامِ عالم کی تشکیلِ جدید کا بوجھ اب انھی ناتواں کندھوں پر ہے۔

بیسویں صدی میں ایک طرح کی بیداری کے باوجود، اُمّتِ مسلمہ بعض پہلوؤں سے انحطاط پذیر بھی ہوئی۔ اقبال نے زوالِ اُمّت کا بکثرت ذکر کیا ہے اور اس افسوس ناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیریں بھی سنجھائی ہیں۔ عصرِ حاضر کے فکری اور علمی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے فقہِ اسلامی کی تشکیل نو اور اجتہاد پر زور دیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم اُمّہ اپنے اندرون کو بدلے اور خود کو خودی اور فقر و عشق کی قوت سے لیس کرے۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں علامہ اقبال کہتے ہیں:

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا، خارجی وجود اختیار نہیں



اقبال اور عالمی نظام کی تشکیل جدید

کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اہل قانون، جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔<sup>۳۶</sup>

دراصل ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اسلام کو سمجھے بغیر، اقبال کے مجوزہ اور مطلوبہ نظامِ عالم کی تفہیم بہت مشکل ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی پاپائیت، صلیبی محاربے اور بعض مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں، مغرب میں اسلام کی تفہیم میں رکاوٹ رہی ہیں۔ اقبال کے بقول: 'اسلام آج تک بے نقاب نہیں ہوا، گویا اس پردے کو ہٹانے کی ضرورت ہے، جو اہل اسلام اور غیر مسلم اقوام کے درمیان حائل ہے۔ اقبال کے نزدیک، اسلام ایک وسیع الہیت مذہب ہے۔ بون یونیورسٹی کے پروفیسر ہارٹن کے حوالے سے خطبات میں وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی روح بڑی وسیع ہے، اتنی وسیع کہ آپ اسے لامحدود کہہ سکتے ہیں۔ الحادی خیالات سے قطع نظر، اس نے اپنے گرد و پیش بسنے والے لوگوں کے خیالات کو جمع و جذب کر لیا ہے اور انھیں ترقی کے لیے اپنے مخصوص طور طریقوں سے آشنا کیا ہے۔'<sup>۳۷</sup>

اقبال کے نزدیک، نظامِ عالم کی تشکیل نو صرف اسی وقت با معنی و کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد حق و صداقت اور انصاف اور برابری پر ہو، اور ہر طرح کی نسلی و لسانی تفریق اور جغرافیائی قومیتوں کو ختم کر دیا جائے۔ قوم پرستی کی بنیاد پر تشکیل پذیر اتحاد کبھی پایدار قوت نہیں بن سکتا۔<sup>۳۸</sup>

اقبال کے عالمی نظام میں انسان کی تکریم و تجلیل اہمیت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: انسان دنیا میں اسی وقت پنپ سکتا ہے جب وہ باہم احترام اور عزت کو اپنا شعار بنائے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ پورا عالم انسانیت، اللہ کا کنبہ ہے۔<sup>۳۹</sup>

اب سوال یہ ہے کہ اقبال کی امنگوں کی روشنی میں دنیا کی موجودہ صورتِ حال میں عالمی نظام کی تشکیل نو کیوں کر ممکن ہے؟ اقبال نے اپنی وفات سے پہلے بڑے دکھ سے کہا تھا کہ روئے زمین پر ہر جگہ انسان بدستور مصائب و آلام کا شکار ہے، لاکھوں انسانوں کو نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے، اور طاقت و رکمزوروں کا خون چوس

رہے ہیں۔ زمین پر ہر طرف نحوست چھائی ہوئی ہے اور انسانی ہمدردی کی کوئی آواز کہیں سے سنائی نہیں دیتی۔<sup>۱۰</sup>

گرد و پیش پر نظر ڈالیے، صورت حال فی الواقع حوصلہ افزا نہیں ہے۔ سب سے بڑے عالمی ادارے (اقوام متحدہ) میں پانچ بڑوں کو ویٹو کا 'حق' بذات خود 'خلاف حق' اور شدید بے انصافی ہے۔ توازن اقتدار، دنیا کی بڑی ایٹمی طاقتوں کے حق میں ہے۔ یہ صورت حال افسوس ناک ہی نہیں، پریشان کن بھی ہے۔ اقبال نے ایک پُرمسرت اور مطمئن زندگی اور آزادی، برابر اور خوش حالی کے جو خوب صورت خواب دیکھے تھے، وہ کسی ایسے نام نہاد ورلڈ آرڈر میں پورے نہیں ہو سکتے، جسے مرتب کرتے ہوئے اقوام عالم کی امتگوں کو نظر انداز کیا گیا ہو اور اس کی بنیاد کسی ایک قوم یا چند اقوام کے مخصوص مفادات پر ہو، اور جسے ایٹمی ہتھیاروں کے زور اور فوجی قوت اور اسلحے کی برتری کے بل بوتے پر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے ایسا غیر منصفانہ عالمی نظام بری طرح ناکامی سے دوچار ہوگا۔ اقبال نے اپنے آخری زمانے کے ایک بیان میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ عالم انسانیت کو ان خرابیوں سے نجات حاصل کرنے اور انسانیت کی معراج تک پہنچنے میں کتنی صدیاں لگیں گی؟<sup>۱۱</sup> اس کا جواب ہمارے ذمے ہے، اور ان لوگوں کے ذمے بھی، جو دنیا کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اقبال کی اس تلقین پر توجہ دینے کی ضرورت ہے: ۱۰

آدمیت، احترامِ آدمی      باخبر شو از مقامِ آدمی<sup>۱۲</sup>  
یہ شعر اس اعتبار سے، اقبال کے مجوزہ نظام عالم کا ماٹو ہے اور، کوئی بھی نیا عالمی نظام تلاش و مرتب کرتے وقت اسے اقوام عالم کے لیے دلیلِ راہ بنایا جاسکتا ہے۔

## حوالے اور حواشی

۱- بانگِ درا، ص ۶۸، ۷۱۔

۲- پیام مشرق، ص ۱۲۔

اقبال اور عالمی نظام کی تشکیل جدید

- ۳- پیام مشرق، ص ۱۹۳۔ اسی ضمن میں مس فارکو ہرن کے نام ایک خط (مؤرخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء) میں لکھتے ہیں: ایشیا کے مسلمان سمجھ گئے ہیں کہ (مجلس اقوام عالم) ایک ایسا اینگلو فرانسسی ادارہ ہے، جو کمزور مسلم علاقوں کی تقسیم اور شکست و ریخت کے لیے قائم کیا گیا ہے، Speeches, Writings and Statements of Iqbal مرتب: لطیف احمد شروانی۔ ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۲-۲۳۵۔
- ۴- Letters and Writings of Iqbal، ص ۵۸۔
- ۵- انوار اقبال، ص ۱۷۶۔
- ۶- انگریزی مضمون، مشمولہ: لطیف احمد شروانی کی محولہ بالا کتاب، حوالہ نمبر ۳۔ اردو ترجمہ مشمولہ: مقالات اقبال۔ مرتب: عبدالواحد معینی۔
- ۷- مشمولہ: تصانیف اقبال، ص ۴۹۱-۵۰۷۔
- ۸- مطبوعہ روزنامہ احسان، لاہور، ۹ مارچ ۱۹۳۸ء، مشمولہ، مضامین اقبال، مرتب: تصدق حسین تاج، احمدیہ پریس حیدرآباد دکن، ۱۳۶۲ھ [۱۹۴۳ء]، ص ۱۸۰-۱۹۶۔
- ۹- شروانی کی مرتبہ کتاب مذکور (حوالہ نمبر ۳)، ص ۲۵۱۔
- ۱۰- بانگِ درا، ص ۲۷۴۔
- ۱۱- پیام مشرق، ص ۱۲۔
- ۱۲- خطوط اقبال، ص ۱۵۵-۱۵۶۔
- ۱۳- جاوید نامہ، ص ۶۵۔ اس صورت حال کو قرآن حکیم سواء السبیل کی گم شدگی سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے: فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ۔ اس کی تشریح میں سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: ”جب انسان خود اپنا رہنما اور شارع بنتا ہے، تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ، اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ، وہ بلا ارادہ، بے انصافی کرنے لگتا ہے، اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چال چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنی آخری حدود پر پہنچنے پہنچنے انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے، تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل، جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو، مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا، کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے

زیادہ دبا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقنضنا کے مطابق ایک خاص رخ پر بہا لے جاتا ہے، جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسکلوں کے ساتھ بے انسانی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ بچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور انتہائی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو انسان نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں، خطِ مخنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

’موجودہ زمانے کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے، ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جاتی ہے، یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ ’جدلی عمل‘ (dialectical process) انسانی زندگی کے ارتقا کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقا کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (thesis) اسے ایک رخ پر بہا لے جائے، پھر اس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (anti-thesis) اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے، اور پھر دونوں کے امتزاج (synthesis) سے ارتقاے حیات کا راستہ بنے، حالانکہ دراصل یہ ارتقا کی راہ نہیں ہے، بلکہ بد نصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے ارتقا میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔‘ (تفہیم القرآن: اول، ص ۳۵۲-۳۵۴)

- ۱۴- ارمغانِ حجاز، مشمولہ: کلیاتِ اقبال اُردو، ص ۶۵۳/۱۲۔
- ۱۵- بالِ جبریل، ص ۶۰۔
- ۱۶- ایضاً، ص ۷۰۔
- ۱۷- اقبال نامہ، دوم: ص ۴۵۔
- ۱۸- ضربِ کلیم، ص ۶۹۔
- ۱۹- شروانی کی مرتبہ کتابِ مذکور (حوالہ نمبر ۳)، ص ۲۵۰۔
- ۲۰- اقبال نامہ اول، ص ۱۸۱۔
- ۲۱- اقبال، جہانِ دیگو، مرتب: محمد فرید الحق۔ گریزی پبلشرز کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۶۷۔
- ۲۲- بالِ جبریل، ص ۱۰۰۔
- ۲۳- Letters of Iqbal، ص ۲۵۴۔
- ۲۴- تفصیل کے لیے دیکھیے، سیرِ افغانستان: سید سلیمان ندوی۔ نیس اکیڈمی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۷ء، نیز: اختر اہی (مرتب) اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں: بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۷۸ء۔
- ۲۵- مثنوی مسافر، در: پس چہ باید کرد، ص ۶۴۔

- ۲۶- کتاب مذکور، ص ۵۷۔
- ۲۷- اقبال نامہ، دوم، ص ۹۴۔
- ۲۸- جاوید نامہ، ص ۱۷۷-۱۷۸۔
- ۲۹- چودھری محمد حسین اور اقبال (روابط): ثاقف نفیس، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ایم اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء، مخزنہ: اورینٹل کالج لائبریری لاہور، ص ۶۶۔
- ۳۰- محمد اکبر منیر، اقبال نامہ دوم، ص ۱۶۳۔
- ۳۱- ایضاً، نیز: مکتوب بنام محمد جمیل، ۱۸ افروری ۱۹۲۹ء، اقبال نامہ، دوم، ص ۸۸۔
- ۳۲- بانگ درا، ص ۲۶۶۔
- ۳۳- اقبال کے حضور، مرتب: نذیر نیازی۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۵۲۔
- ۳۴- چودھری محمد حسین اور اقبال (روابط) ص ۶۵۔
- ۳۵- شروانی (حوالہ نمبر ۳)، ص ۲۴۴۔
- ۳۶- پیام مشرق، ص ۱۲۔
- ۳۷- اقبال: Reconstruction، ص ۱۳۰۔
- ۳۸- شروانی (حوالہ نمبر ۳)، ص ۲۵۱۔
- ۳۹- ایضاً۔
- ۴۰- ایضاً، ص ۲۵۰۔
- ۴۱- ایضاً، ص ۲۶۱۔
- ۴۲- جاوید نامہ، ص ۲۰۵۔
- (ماہ نامہ سیارہ، لاہور، اقبال نمبر جون، جولائی ۱۹۹۲ء۔ تجدید نظر: جنوری ۲۰۰۴ء)



## علامہ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی

علامہ اقبال، مہاراجا سرکشن پرشاد کے نام ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:  
صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں، پھر اس کے بعد نہیں سوتا، سوائے اس کے کہ مصلے پر کبھی  
اوگھ جاؤں۔<sup>۱</sup>

تقریباً دو سال بعد، ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے خط میں پھر لکھتے ہیں:  
بندہ رو سیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔  
سو، خدا کے فضل و کرم سے، تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی، دعا کروں گا کہ اس وقت  
عبادتِ الہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔<sup>۲</sup>

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اوائلِ عمر ہی سے سحر خیزی کا ایک  
طبعی ذوق رکھتے تھے اور قابلِ ذکر بات ہے کہ یورپ کے نسبتاً مختلف اور ناسازگار ماحول  
میں بھی، ان کا یہ ذوق برقرار رہا:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی  
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی<sup>۳</sup>  
سوال یہ ہے کہ اقبال کے ذوقِ سحر خیزی کی اس تربیت و تشکیل میں کن عناصر کو دخل  
رہا اور اس کی وجوہ کیا تھیں؟ اس سلسلے میں علامہ کے اسلوبِ زندگی، ان کی افتادِ طبع اور ان  
کے ذخیرہٴ نظم و نثر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اول تو یہی بات کچھ کم اہم نہیں کہ ہمارے ہاں سحر خیزی کو خوش بختی کی علامت سمجھا

جاتا ہے۔ اسلامی اور مشرقی روایات کے مطابق علی الصّباح جاگنا اور جگانا ایک مبارک اور قابل قدر فعل ہے۔ خالد نظیر صوفی نے اقبال کا ایک قول نقل کیا ہے: ”سحر خیزی تو اسلام کا سب سے بڑا اور بہترین تحفہ ہے“۔ وہ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک بار جاوید اقبال کے حوالے سے بات ہو رہی تھی، فرمانے لگے: ”بچے اگر اوائل عمر سے ہی اس [سحر خیزی] کے عادی بن جائیں تو پھر پوری زندگی نہ صرف اس کے روحانی بلکہ جسمانی فیوض و برکات سے بھی فیض یاب ہوتے رہیں گے“۔<sup>۴</sup>

اقبال اس سحر خیز خورشید کو بھی خوش آمدید کہتے ہیں جو نیند کے ماتوں کو جگاتا ہے:

خورشید، وہ عابدِ سحر خیز  
لانے والا پیام ”بر خیز“<sup>۵</sup>

علامہ قرآن حکیم کے مفاہیم و معانی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ قرآن حکیم میں قیام اللیل اور عبادتِ شب کی بہت تلقین کی گئی ہے۔ اسے اہل تقویٰ اور ’عباد الرحمن‘ کی نشانی بتایا گیا ہے، فرمایا:

○ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا (الفرقان: ۶۴) (رحمن کے اصلی بندے) وہ (ہیں جو) اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ ○ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (الذاریات: ۱۸) وہ سحر کے اوقات میں استغفار کیا کرتے تھے۔ ○ الصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْأَسْحَارِ (آل عمران: ۱۷) یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راست باز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے یہاں رات کی عبادت سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ اللہ جل شانہ، نے براہ راست رسول اکرمؐ کو عبادتِ شب یعنی نمازِ تہجد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

○ وَمِنَ اللَّيْلِ فَهَجَّجِدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ۚ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (بنی اسرائیل: ۷۹) اور رات کو تہجد پڑھو۔ یہ تمہارے لیے نفل ہے۔ بعید نہیں کہ تمہیں تمہارا رب مقام محمود پر فائز کر دے۔



ایک اور مقام پر آپ کو اس طرح تاکید فرمائی:

○ يَا أَيُّهَا الْمُرْمِلُ ○ فَمِ اللَّيْلِ إِلَّا قَلِيلًا ○ نَصَفَهُ أَوْ انْقَضَ مِنْهُ قَلِيلًا ○ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (المزل: ۱-۴) اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو، مگر کم-آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

یہاں اگرچہ خطاب براہِ راست نبی اکرم سے ہے لیکن بالواسطہ عبادتِ شب کی تاکید، امت کو بھی کی گئی ہے کیونکہ نبی کے ہر چھوٹے بڑے عمل میں امت کو ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد نہایت نیک نفس اور متقی بزرگ تھے۔ پابندِ صوم و صلوة اور عبادتِ الہی کے مشتاق --- کچھ تعجب نہیں کہ تہجد اور قیام اللیل ان کے معمولات میں داخل ہو۔ اقبال کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں شیخ نور محمد کی روحانیت کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کے لیے شیخ نور محمد کی حیثیت، ایک مثالی شخصیت کی تھی۔ عبادتِ شب کے ضمن میں بھی، انھوں نے یقیناً اپنے والد سے اثرات قبول کیے ہوں گے۔ یہ فطری امر تھا۔

اصل میں تو یہ سنتِ نبوی کا اتباع تھا۔ نبی کریم سے شیخ نور محمد اور خود اقبال کی وابستگی و شیفنگی محتاجِ بیان نہیں۔ اقبال نے جب بھی سحر خیزی اور عبادتِ شب کا اہتمام کیا تو قیام اللیل کے وہ تمام فوائد و ثمرات ان کے ذہن میں متحضر ہوں گے، جن کی نشان دہی نبی کریم نے فرمائی ہے۔ شب بیداری اور نماز تہجد کی تاکید کے سلسلے میں چند احادیثِ نبویؐ ملاحظہ کیجیے:

○ عن ابی امامة قال قال رسول اللہ: علیکم بقیام اللیل فانہ واثب الصالحین قبلکم وهو قربة لکم الی ربکم ومکفرة للسیات ومنهارة عن الاثم (ترمذی): حضرت امامہ کا بیان ہے کہ نبی کریم نے فرمایا: نماز تہجد کا التزام کیا کرو۔ یہ تم سے پہلے کے نیک لوگوں کی خصلت ہے اور خدا سے تمہیں قریب کرنے والی اور گناہوں کے برے اثرات مٹانے والی اور معاصی سے روکنے والی چیز ہے۔

○ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ: افضل الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ المكتوبۃ الصلوٰۃ فی جوف اللیل (مسلم): حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: فرض نماز کے بعد، سب سے افضل نماز، نصف شب میں پڑھی جانے والی (تہجد کی) نماز ہے۔

○ وعن جابر قال سمعت النبیؐ یقول ان فی اللیل لساعة لا یوافقها رجل مسلم یسئل اللہ فیہا خیراً فی امر الدنیا والآخرة الا عطاہ وذلک کل لیلۃ (مسلم): حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: رات میں ایک ساعت ہے۔ اگر اس میں کوئی مسلمان، دین و دنیا کی بھلائی کی دعا مانگے تو خداوند تعالیٰ اس کو عطا فرمادیتا ہے اور یہ ساعت ہر رات میں ہوتی ہے۔

○ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ثلثۃ یضحک اللہ الیہم الرجل اذا قام باللیل یصلی والقوم اذا صفوا فی الصلوٰۃ والقوم اذا صفوا فی قتال العدو (مشکوٰۃ شریف، جلد اول): حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تین شخص ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ خوش ہوتا ہے اور ان سے راضی رہتا ہے: ایک تو وہ شخص جو رات کو اٹھ کر نماز پڑھے، دوسرے وہ لوگ جو نماز کے لیے صفوں کو برابر درست کریں اور تیسرے وہ لوگ جو دشمن کے مقابلے پر لڑنے کے لیے صفوں کو ترتیب دیں۔

○ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ینزل ربنا تبارک وتعالیٰ کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الآخر یقول من یدعونی فاستجب لہ من یسألنی فاعطیہ من یتستغفر لی فاغفر لہ (بخاری، مسلم): حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ عزوجل روزانہ (رات کے وقت) دنیا کے آسمان پر نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کو عطا کروں، کون ہے جو مغفرت چاہے اور میں اسے بخش دوں۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے ایک جگہ فرمایا ہے: 'علم کے ساتھ فکر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ فکر اور تدبیر کے بغیر نہ تو آدمی کے اندر صحیح فہم بیدار ہوتا ہے اور نہ اس کے بغیر علم،

علامہ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی

آدمی کی زندگی پر کوئی گہرا اور دیرپا اثر ڈال سکتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ غور و فکر کی یہ تاکید، حیات و کائنات کی حقیقت و ماہیت تک پہنچنے کے لیے ہے۔

یہ مسلم ہے کہ علامہ اقبال محض شاعر نہ تھے، ایک مفکر اور فلسفی شاعر تھے۔ تفکر، ان کی شخصیت کا جز اور سوچ بچار اور غور و فکر ان کی عادتِ ثانیہ تھی۔ اگر ہم کچھ پیچھے چلیں اور اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں شاعر کے ہاں حیات و کائنات کے بارے میں اس تفکر کے بطن سے پھوٹتا ہوا، ایک استغہامیہ لہجہ ملتا ہے۔ پھر اسی ضمن میں ان کے ہاں ایک اضطراب، سکون نا آشنائی، تنہائی کا الم انگیز احساس، اور ان احساسات کی تسکین کے لیے فطرت کے مناظر و مظاہر کی طرف رجوع اور شہروں اور آبادیوں سے ویرانوں اور صحراؤں کی طرف گریز کا رجحان بھی نمایاں ہے:

شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا  
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو  
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری  
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو ۷

وہ نموشی شام کی، جس پر تکلم ہو فدا  
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا ۸

کشتہٴ عولت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں  
شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں ۹

دن کی نسبت رات زیادہ پرسکون ہوتی ہے اور شب کے خاموش لمحوں میں غور و فکر کے لیے ماحول بہت سازگار ہوتا ہے۔ اس لیے آبادی سے گریز، تنہائی کی تلاش اور خاموشی کو پسند کرنے کا رجحان، بیداریِ شب تک پہنچتا ہے اور شاعر رات کی تنہائیوں میں

حیات و کائنات کے متعلق ان سوالات پر غور کرتا ہے جو بہت ابتدا سے اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے:

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی

اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے نل

تلاش حقیقت کے ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی یہ دعا بھی اہم ہے: ارنا الاشیاء کماہی (اے اللہ!) ہمیں اس قابل بنا کہ ہم ہر چیز کو اس طرح دیکھیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

احادیثِ مذکورہ کی روشنی میں شب بیداری کا ایک محرک اور عبادتِ شب کی غرض و غایت، اقبال کے نزدیک، حیات و کائنات کی حقیقت و ماہیت پر تفکر اور دنیا و ما فیہا کے مسائل پر غور کرنا ہے اور یہ بھی کہ ہم حقیقت آشنا ہو کر صراطِ مستقیم کو پالنے کے لیے حضورِ ایزدی میں دست بدعا ہوں۔

شب کی تنہائیوں میں تفکر، رجوع الی القرآن اور عبادتِ شب کے نتیجے میں شاعر کے حساس دل کو کچھ ایسا سکون و ثبات نصیب ہوا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ اس خدا کی بارگاہ میں عقیدت کے آنسو، جس نے شاعر کو طمانیت کی ویسی ہی کیفیت عطا کی تھی، جو صحرا کے ایک مسافر کو اچانک کسی نخلستان میں پہنچنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ شب کی تنہائیوں میں جاگ جاگ کر آنسو بہانا اور آہ و فغاں کرنا اس کا مستقل شعار بن گیا۔ یہ شعار، اقبال کے ہاں ابتدائی دور کی شاعری سے لے کر آخری دور کی شاعری تک، ہر مرحلے اور ہر دور میں ایک مستقل رجحان کی شکل میں موجود ہے:

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی موڈن

میں اس کا ہم نوا ہوں، وہ میری ہم نوا ہو

پھولوں کو آئے جس دم، شبنم وضو کرانے

رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو نل

دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں  
 عورتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں ۱۲

لیکن شب کی تنہائیوں میں بیدار رہ کر آنسو بہانا بجائے خود مقصود نہ تھا۔ جو کچھ  
 مطلوب و مقصود تھا، اس کی طرف علامہ اقبال نے ایک دو جگہ اس طرح اشارہ کیا ہے:

سکوتِ شام سے تا نغمہٴ سحر گاہی  
 ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیمِ شبی ۱۳

کئی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری  
 سحرِ قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی ۱۴

اقبال کی فغانِ نیمِ شب اور آہِ سحر گاہی کا رشتہ شبِ بیداری کی مذہبی روایت سے  
 وابستہ ہے جیسا کہ انھوں نے خود واضح کیا ہے: 'سحرِ قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی'۔ گویا  
 شبِ بیداری اور عبادتِ گزاری کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے حضورِ عجز و نیاز اور الحاح و زاری  
 کے ساتھ دستِ دعا دراز کیا جائے۔

دعا وسیلہٴ قربِ الہی ہے، جس کے نتیجے میں مومن خدا سے مزید توفیق و عنایت کی  
 دعا مانگتا ہے۔ مناظر و مظاہرِ فطرت کے مطالعے کا دعا پر منتج ہونا اور اس ذریعے سے قرب  
 الہی کا حصول، ایک فطری اور تدریجی امر ہے۔ اقبال کے نظامِ فکر میں دعا کی خاص اہمیت  
 ہے۔ خطبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

Religion is not satisfied with mere conception; it seeks a more  
 intimate knowledge of and association with the object of its  
 pursuit. The agency through which this association is achieved  
 is the act of worship or prayer. ۱۵

مذہب کے لیے یہ ممکن نہیں کہ صرف تصورات پر قناعت کر لے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے مقصود و مطلوب کا زیادہ گہرا علم حاصل کرے اور اس سے قریب تر ہوتا چلا جائے لیکن یہ قرب حاصل ہوگا تو دعا کے ذریعے۔<sup>۱۷</sup>

مزید لکھتے ہیں:

Prayer, then, whether individual or associative, is an expression of man's inner yearning for a response in the awful silence of the universe. It is a unique process of discovery. <sup>۱۸</sup>

دعا خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی، ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔ یہ انکشاف و تجسس کا (ایک) عدیم المثال عمل ہے۔<sup>۱۸</sup>

گویا وہ رجحان، جس نے تلاش حقیقت میں آبادی سے ویرانے اور انسان سے فطرت کی طرف گریز کیا تھا، اب فطرت اور ویرانے سے بھی کنارہ کشی کر کے گوشہ قلب میں سمٹ آیا ہے اور نالہ نیم شب، گریہ سحری، فغان صبح گاہی اور دعا کے ذریعے قرب الہی حاصل کر کے ان سوالات کا جواب چاہتا ہے، جو عرصہ دراز سے اس کے قلبی اضطراب کا سبب بنے ہوئے ہیں:

چہ پرسى از طريق جستجویش  
فرو آرد مقام ہاے و ہولیش  
شب و روزے کہ داری بر ابد زن  
فغان صبح گاہے بر خرد زن <sup>۱۹</sup>

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں  
خرد کھوئی گئی ہے، چارسو میں  
نہ چھوڑ اے دل! فغان صبح گاہی  
اماں شاید ملے اللہ ہو میں <sup>۲۰</sup>

علامہ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی

اقبال کا نظامِ فکر اپنے اندر ایک وحدت رکھتا ہے اور اس کے جملہ تصورات و نظریات باہم دگر مربوط ہو کر اس وحدت کو مکمل کرتے ہیں۔ اس نظامِ فکر کی اساس اقبال کے نظریہ خودی پر ہے اور فکرِ اقبال کا کوئی معمولی سے معمولی رجحان بھی خودی سے الگ یا علاحدہ نہیں ہے۔ اقبال کا تصورِ سحر خیزی بھی علمی، عقلی اور عملی اعتبار سے ان کے نظریہ خودی سے وابستہ ہے۔ نفسیاتی اور عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو شبِ بیداری، سحر خیزی، عبادتِ شب اور دعا انسانی شخصیت میں بعض ایسے اخلاقی اوصاف کا باعث بنتی ہے جن کا حصول کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہیں۔ اول تو یہ کہ انسان ایک ایسے نازک مرحلے سے گزرتا ہے جو دو چار سخت مقامات سے کم نہیں۔ سحر خیزی ایک نہایت سخت اور نفس کو تکلیف دینے والا عمل ہے جسے قرآن پاک میں اشدُّ و طاء یعنی نفس کو خوب روندنے والا عمل۔ (المزمل: ۶) قرار دیا گیا ہے۔ نفس کو روندنے کے علاوہ باقاعدگی، مستعدی، فرض شناسی، قوتِ برداشت اور ضبطِ نفس بھی بیداریِ شب کے ثمرات میں شامل ہیں۔ پھر طبی نقطہ نظر سے دیکھیے تو مسلم ہے کہ سحر خیز انسان لطیف الطبع اور ذہین ہوتا ہے۔ میسوں مفکرین و فلاسفہ اور ادبا و شعرا کے ہاں سحر خیزی کا اہتمام رہا اور ان کی بہترین قلمی کاوشیں اور تخلیقات ذہنی، اہتمامِ سحر خیزی کا نتیجہ ہیں۔ سحر خیز انسان بالعموم ایسی بہت سی ذہنی بیماریوں سے بھی محفوظ رہتا ہے جن میں گراں خواب اور نیند میں مدہوش لوگ اکثر و بیشتر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ گویا شبِ زندہ دار اور سحر خیز انسان ایک ایسے راستے پر چل رہا ہوتا ہے جو اسے خود شناسی اور عرفانِ نفس کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں اسی کا نام خودی ہے۔ ’گریہ سحر گاہی‘ اولادِ آدم کے لیے حضرت آدمؑ کی میراث ہے۔ جنت سے بوقتِ رخصت فرشتے آدمؑ سے کہتے ہیں:

گراں بہا ہے ترا گریہ سحر گاہی

اسی سے ہے تیرے نخلِ کہن کی شادابی ۱۲

یہ ’گریہ سحر گاہی‘ درحقیقت دعا ہی کا دوسرا نام ہے۔ اقبال اپنے انگریزی خطبات

میں ایک جگہ کہتے ہیں:

affects different varieties of consciousness differently.<sup>۲۲</sup>

دعا وہ چیز ہے جس کی انتہا، روحانی تجلیات پر ہوتی ہے اور جس سے مختلف طبیعتیں مختلف اثرات قبول کرتی ہیں۔<sup>۲۳</sup>

خطبات ہی میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

\_\_\_ psychologically speaking, prayer is instinctive in its origion. The act of prayer as aiming at knowledge, resembles reflection. Yet prayer at its highest is much more than abstract reflection. Like reflection, it too is a process of assimilation, but the assimilative process in the case of payer draws itself closely together and thereby acquires a power unknown to pure thought.<sup>۲۴</sup>

باغبارِ نفسیات، دعا یا عبادت، ایک جنّتی امر ہے اور پھر جہاں تک حصولِ علم کا تعلق ہے، ہم اسے غور و تفکر سے مشابہ ٹھہرائیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا درجہ غور و تفکر سے کہیں اونچا ہے مگر پھر غور و فکر کی طرح وہ بھی تحصیل و اکتساب ہی کا ایک عمل ہے جو بحالتِ عمل، ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے اور کچھ ایسی طاقت اور قوت حاصل کر لیتا ہے جو فکر محض کو حاصل نہیں۔<sup>۲۵</sup>

ظاہر ہے کہ اقبال نے جس چیز کو کچھ ایسی طاقت اور روحانی تجلیات کہا ہے، وہ خودی کے سوا کچھ اور نہیں، لیکن خودی کا حصول کچھ ایسا آسان نہیں۔ اس منزل تک رسائی کے لیے پہلے انسان کو بے خودی کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے جسے قرآن پاک نے 'دُفَسْ کو روندنے والا' قرار دیا ہے۔ شاید یہ حیاتِ انسانی کے دو چار بہت سخت مقامات ہی میں سے ایک مقام ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ایک 'مشکل مقام':

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا

تھم اے رہ رو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا<sup>۲۶</sup>

گویا عرفانِ ذات کے لیے نفی ذات کا معرکہ سر کرنا ضروری ہے۔ اقبال انگریزی

خطبات میں لکھتے ہیں:



علامہ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی

It is a unique process of discovery, whereby the searching ego affirms itself in the very moment of self-negation, and thus discovers its own worth and justification as a dynamic factor in the life of the universe.<sup>۲۷</sup>

یہ [دعا] وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالبِ حقیقت کے لیے نفی ذات ہی کا لمحہ، اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے اور جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس

کی حیثیت، کائنات کی زندگی میں، سچ سچ ایک فعال عنصر کی ہے۔<sup>۲۸</sup>

گویا نفی ذات کا پل صراطِ عبور کرتے ہی فی الفور انسان اثباتِ ذات کی اس جنت میں داخل ہو جاتا ہے جس کا نام خودی ہے۔ جنت کی ہر شے عبادُ الرحمن کے لیے مسخر اور مطیع ہوگی۔ صاحبِ خودی (سحر خیز) انسان بھی حیات و کائنات کو اپنا مطیع و منقاد پاتا ہے۔ اسے ہر طرح کی قوت و سطوت، شان و شوکت اور عظمت حاصل ہوتی ہے۔ فطرت کے وہ مظاہر و مناظر، جن سے وہ رازِ کائنات پوچھتا پھرتا تھا، اب اسے اپنی گدراہ محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے نالہ سحر گاہی اور فغانِ صبح گاہی میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے نہ صرف فرد کی اپنی قسمت، بلکہ قوموں کی اجتماعی تقدیر بھی منقلب ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال اپنی ہمشیرہ کریم بی بی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

مسلمان کی بہترین تلوار دعا ہے، سو اسی سے کام لینا چاہیے۔ ہر وقت دعا کرتے رہنا چاہیے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہیے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس امت کی دعا سن لے اور اس کی غریبی پر

رحم فرمائے۔<sup>۲۹</sup>

اقبال کی شاعری میں 'نالہ بے باک'، 'آہ صبح گاہی'، 'انہک سحر گاہی'، 'گریہ نیم شب' وغیرہ دعا ہی کے مترادف ہیں۔ علامہ، دعا کے اندر مضمحل باطنی قوت کی غیر معمولی تاثیر سے بہ خوبی واقف ہیں:

نہ ستارے میں ہے، نہ گردشِ افلاک میں ہے

تیری تقدیر، مرے نالہ بے باک میں ہے <sup>۳۰</sup>

تلاش، اس کی فضاؤں میں کر، نصیب اپنا  
 جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے ۳۱  
 میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحرگاہی میں  
 جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش ۳۲

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو  
 کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحرگاہی ۳۳

تا کہ خویش از گریہ ہائے نیم شب سیراب دار  
 کز درونِ او شعاعِ آفتاب آید بروں ۳۴

بروں زیں گنبدِ در بستہ پیدا کردہ ام را ہے  
 کہ از اندیشہ برتری پرد آہِ سحرگاہی ۳۵

ز اشکِ صبح گاہی، زندگی را برگ و ساز آور  
 شود کشتِ تو ویراں تا نہ ریزی دانہ پے در پے ۳۶

افرادِ ملت سے اقبال کو یہی شکوہ ہے کہ انھوں نے سحرخیزی کی عادت ترک کی،  
 گریہ ہائے صبح گاہی کو چھوڑا اور اس طرح خودی سے دست کش ہو کر ذلت و عنکبوت کا شکار  
 ہو گئے۔ یہ شکوہ مختلف مقامات پر مختلف انداز سے سامنے آتا ہے:

کس قدر تم پہ گراں، صبح کی بیداری ہے  
 ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے ۳۷

علامہ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی

فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے  
نہ ہو جب چشمِ محفل، آشنائے لطفِ بے خوابی ۳۸

خال خال اس قوم میں، اب تک نظر آتے ہیں وہ  
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو ۳۹

بہ خواب رفتہ جوانان و مردہ دل پیراں  
نصیبِ سینہ کس، آہ صبح گاہے نیست ۴۰

دورِ جدید میں مختلف اور متضاد علمی و سائنسی اور انقلابی نظریات کے درمیان ٹکراؤ اور تہذیبوں کے درمیان کش مکش تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ امتِ مسلمہ اپنی تاریخ کے دامن میں علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا ایک عظیم الشان سرمایہ رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے عصرِ حاضر کے چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے اس پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک اس چیلنج کا جواب صرف اس داخلی اور روحانی قوت اور فقر و قناعت پسندی کے ذریعے دیا جاسکتا ہے جو کارزارِ حیات میں مردِ مومن کا اصل سرمایہ اور کش مکش و کشاکش میں کامیابی کے لیے اس کا کارگر ہتھیار ہے۔ روحانی قوت اور فقر کا سرمایہ، ذوقِ سحر خیزی کے ذریعے ہی فراہم ہو سکتا ہے اور یہی تقویمِ خودی کا راز ہے۔

اقبال، امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کے لیے بطورِ خاص دعا گو ہیں کہ خدا انھیں ذوقِ سحر خیزی کی دولت سے نوازے:

بے اشکِ سحر گاہی، تقویمِ خودی مشکل  
یہ لالہٴ پیکانی، خوش تر ہے کنارِ جو ۴۱

جوانوں کو مری آہ سحر دے  
پھر، ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے ۴۲

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے  
مرا عشق، میری نظر بخش دے  
مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں  
مرے دل کی پوشیدہ بے تائیاں  
مرے نالہ نیم شب کا نیاز  
مری خلوت و انجمن کا گداز ۴۳

سوزِ او را از نگاہِ من بگیر  
یا ز آہِ صبح گاہِ من بگیر ۴۴

ہر درد مند دل کو، رونا مرا رلا دے  
بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید انھیں جگا دے ۴۵

بالِ جبیریل میں 'اذان' کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ اس میں اقبال نے مسلمانوں کے ذوقِ سحر خیزی کو از سر نو تازہ کرنے اور ان پر شبِ بیداری کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ چاند ستاروں کا ایک مکالمہ ہے۔ انداز نہایت حکیمانہ ہے۔ مسلمانوں کو ان کی غفلت کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ ان کے مقام اور مرتبے کی عظمت کا اظہار و اعتراف بھی کیا ہے۔ چاند، انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ستاروں سے مخاطب ہے:

علامہ اقبال کے ہاں ذوقِ سحر خیزی

واقف ہو اگر لذتِ بیداریِ شب سے  
اونچی ہے تڑپا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار  
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں  
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار ۴۶

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، شبِ بیداری، سحر خیزی اور آہِ صبح گاہی کا منطقی نتیجہ تقویمِ خودی ہے۔ اقبال اپنی بے خوابیوں اور شبِ بیداریوں کے نتیجے میں 'اس لذتِ آہِ سحر گاہی' سے بہرہ ور تھے، جس کا ثمر قیام و استحکامِ خودی ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر یہ ساری مشقِ مذہبِ ملا و جمادات، کا حصہ شمار ہوگی جس کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ گویا سحر خیزی، شبِ بیداری اور فغان و فریاد ایک ظاہری عمل ہے، تو استحکامِ خودی اس کی روح ہے۔ روح کے بغیر ظاہری عمل، ایک مردہ جسم ہے جس سے اقبال تو کیا، کسی بھی ہوش مند شخص کو ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اگر شبِ بیداری ایک رسم یا دین داری کی نمائش بن کر رہ جائے تو یہ محض ریا کاری ہوگی جس کا حاصل حصولِ کچھ نہ ہوگا۔ علامہ اقبال ایسی عبادت اور سحر خیزی کو مردود قرار دیتے ہیں:

یہ ذکرِ نیمِ شمی، یہ مراقبے، یہ سرور  
تری خودی کے نگہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں ۴۷

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی اے پیرِ حرم! تیری مناجاتِ سحر کیا؟  
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خاقہوں سے اس شعلہٴ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شر کیا! ۴۸

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے  
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے ۴۹

کارگاہِ حیات میں اگر شیطانی اور طاعنونی طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ نالہ ہائے سحری سے خودی کو تقویت پہنچائی جائے۔ دنیا کی باطل قوتیں، بشمول

ابلیس، اسی سحر خیز مسلمان سے خوفزدہ ہیں۔ ابلیس اپنے مشیروں کو یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ مسلم شب زندہ دار کو خانقاہی رنگ کے ذکر صبح گاہی میں مست و مدہوش رکھو۔ پیرانِ حرم کو بھی خدشہ ہے کہ سحر خیز مردِ مومن، ان کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں:

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں خدایانِ خانقاہی  
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ ۵۰  
مگر علامہ اقبال کی یہی تلقین ہے کہ:

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز  
از خوابِ گراں خیز ۵۱

علامہ اقبال عمر بھر جس 'جہان تازہ' کی تلاش و تشکیل کے لیے آرزو مند اور اس کی فکر میں جس طرح غلطاں و پیچاں رہے، اس کی رمز اسی ذوقِ سحر خیزی اور نواہے سحر گاہی میں پوشیدہ ہے:

نہ ستارے میں ہے، نہ گردشِ افلاک میں ہے  
تیری تقدیر مرے نالہ بے باک میں ہے  
کیا عجب میری نواہے سحر گاہی سے  
زندہ ہو جائے، وہ آتش کہ تری خاک میں ہے ۵۲

## حوالے اور حواشی

- ۱- اقبال بنام شاد، ص ۱۸۸۔
- ۲- ایضاً، ص ۲۳۵۔
- ۳- بالِ جبیریل، ص ۴۰۔
- ۴- اقبال درونِ خانہ [دوم]، ص ۱۹۔
- ۵- بانگِ درا، ص ۱۲۷۔
- ۶- کشف المحجوب، اردو ترجمہ: میاں طفیل محمد۔ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۷۸۔

- ۷- بانگِ درا، ص ۴۷۔
- ۸- ایضاً، ص ۲۳۔
- ۹- ایضاً، ص ۷۷۔
- ۱۰- ایضاً، ص ۸۲۔
- ۱۱- ایضاً، ص ۴۷۔
- ۱۲- ایضاً، ص ۱۷۳۔
- ۱۳- ایضاً، ص ۲۲۳۔
- ۱۴- ایضاً، ص ۲۰۸۔
- ۱۵- Reconstruction، ص ۷۰، ۷۱۔
- ۱۶- تشکیلِ جدید، ص ۱۳۳۔
- ۱۷- Reconstruction، ص ۷۲۔
- ۱۸- تشکیلِ جدید، ص ۱۳۹۔
- ۱۹- زبورِ عجم، ص ۱۶۲۔
- ۲۰- بالِ جبریل، ص ۸۳۔
- ۲۱- ایضاً، ص ۱۳۱۔
- ۲۲- Reconstruction، ص ۷۱۔
- ۲۳- تشکیلِ جدید، ص ۱۳۳۔
- ۲۴- Reconstruction، ص ۷۱۔
- ۲۵- تشکیلِ جدید، ص ۱۳۵۔
- ۲۶- بالِ جبریل، ص ۵۷۔
- ۲۷- Reconstruction، ص ۷۲۔
- ۲۸- تشکیلِ جدید، ص ۱۳۹۔
- ۲۹- مظلومِ اقبال: شیخ اعجاز احمد۔ کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۱۔
- ۳۰- بالِ جبریل، ص ۶۵۔
- ۳۱- ایضاً، ص ۶۹۔
- ۳۲- ایضاً، ص ۷۵۔
- ۳۳- ایضاً، ص ۵۶۔

- ۳۴- زبور عجم، ص ۹۷۔
- ۳۵- ایضاً، ص ۱۰۰۔
- ۳۶- ایضاً، ص ۱۰۷۔
- ۳۷- بانگِ دراء، ص ۲۰۱۔
- ۳۸- ایضاً، ص ۲۳۸۔
- ۳۹- ارمغانِ حجاز، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۱۲/۶۵۴۔
- ۴۰- پیامِ مشرق، ص ۱۸۱۔
- ۴۱- ضربِ کلیم، ص ۱۷۳۔
- ۴۲- بالِ جبریل، ص ۸۶۔
- ۴۳- ایضاً، ص ۱۲۴، ۱۲۵۔
- ۴۴- جاوید نامہ، ص ۱۹۹۔
- ۴۵- بانگِ دراء، ص ۲۸۔
- ۴۶- بالِ جبریل، ص ۱۲۵۔
- ۴۷- ضربِ کلیم، ص ۳۴۔
- ۴۸- ایضاً، ص ۱۷۳۔
- ۴۹- ارمغانِ حجاز، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۱۵/۶۵۷۔
- ۵۰- ایضاً، ص ۲۴۴/۶۸۶۔
- ۵۱- زبور عجم، ص ۸۱۔
- ۵۲- بالِ جبریل، ص ۶۵۔

(سہ ماہی اقبال، لاہور، جنوری ۲۰۰۰ء)



## اقبال کا تصوّرِ جہاد

علامہ اقبالؒ ۱۹۳۳ میں افغانستان کی دس روزہ سیاحت (۲۳ اکتوبر تا ۲ نومبر) سے واپس آئے تو سخت کوش افغانیوں کا آہنگِ حیات، ان کے ذہن میں تازہ تھا۔ کوہ و صحرا کے فطری ماحول میں پروردہ افغان، ان کے نزدیک ایک بہادر اور شجاع قوم تھی اور اسی لیے ”طلسمِ فرنگ“ سے آزاد تھی۔ اس دورے میں بابر، محمود غزنوی، حکیم سنائی اور احمد شاہ ابدالی کے مقبروں کی زیارت نے انہیں ایک روحانی کیف و لذت سے سرشار کیا۔ واپس ہندستان آتے ہوئے ان کا تاثر یہ تھا کہ افغانستان میں ایک نئی بیداری کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔

۱

مثنوی مسافران کے دورہ افغانستان کا ماحصل ہے۔ اس کے آخری حصے میں وہ نادر شاہ مرحوم کے جانشین ظاہر شاہ کو ”حرفِ شوق“ کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ (ع: حرفِ شوق آورده ام، از من پذیر)۔۔۔ یہ ”حرفِ شوق“ کیا ہے؟۔۔۔ ظاہر شاہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

چوں پدر اہل ہنر را دوست دار      بندہ صاحب نظر را دوست دار  
ہم چوں آں خلد آشیایاں بیدار زی      سخت کوش و پُر دم و کزّار زی  
می شناسی معنی کزّار چیست؟      ایں مقامے از مقاماتِ علیّ است

امتناں را در جہان بے ثبات نیست ممکن جز بہ کزّاری حیات  
سرگذشت آل عثمان را نگر از فریب غریباں خونیں جگر  
تا ز کزّاری نصیبے داشتند در جہاں دیگر علم افراشتند  
مسلم ہندی چرا میداں گذاشت؟ ہمت او بوے کزّاری نداشت<sup>۱</sup>

(اپنے والد کی طرح اہل دانش و بینش سے دوستی استوار کرو۔ اسی غلد آشاں کی سی بیدار  
مغزی، سخت کوشی اور بہادری و جرأت مندی سے زندگی بسر کرو۔ جانتے ہو کزّار کے معنی کیا  
ہیں؟<sup>☆</sup> یہ حضرت علیؑ کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ اس جہان بے ثبات میں کزّاری  
(جہاد) کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ عثمانیوں (ترکوں) کی تاریخ دیکھ لو، جب تک انھوں نے  
کزّاری (جہاد) سے سروکار رکھا، دنیا میں ان (کے اقتدار) کا جھنڈا، (ایک نرالی شان سے)  
لہراتا رہا۔۔۔۔۔ (تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ) ہندی مسلمان کیوں میدان چھوڑ گیا؟ اس  
لیے کہ اس کے اندر کزّاری (جہاد) کا حوصلہ باقی نہیں رہا)۔

اقبال نے یہاں فقط مسلم ہندی اور آل عثمان (ترکوں) کی مثالیں دی ہیں، مگر  
ان کی نظر جملہ اقوام عالم کی تاریخ پر محیط تھی۔ ان کے خیال میں آویزش و پیکار ہی  
حیات و کائنات کا مزاج ہے۔ یہاں ازل سے خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان ایک  
کشاکش پیہم جاری ہے، جس میں افراد و اقوام کی کامیابی ایک خاص انداز و آہنگ حیات  
(life style) اپنانے پر منحصر ہے۔ اقبال اسے ”کزّاری“ کا نام دیتے ہیں اور ان کی تلقین  
ہے، ع: سخت کوش و پُردم و کزّاری۔۔۔۔۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ افراد ہوں یا اقوام، حیات  
انسانی کی بقا، آزادی اور اس کا ثبات و استحکام ”کزّاری“ کو بروے کار لائے بغیر ممکن  
نہیں۔ وہ اسے ”سخت کوشی“ کا نام بھی دیتے ہیں، اور ”قوت شیری“ بھی کہتے ہیں۔ ان  
کی شاعری میں کہیں یہ ”ضربِ کلیمی“ ہے تو کہیں ”چوبِ کلیم“۔۔۔۔۔ اس کا نام ”فقرِ غیور“  
بھی ہے اور ”جرأتِ رندانہ“، ”خودی“ اور ”عشق“ بھی۔۔۔۔۔ بعض اوقات وہ اسے ”دل  
بیدار“ سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی اسے ”مجاہدانہ حرارت“ سے موسوم کرتے ہیں۔

☆ کزّار، حضرت علیؑ کا لقب ہے۔ لفظی معنی: ہٹانے والا، بار بار حملے کرنے والا۔

مجموعی طور پر وہ اس ”ذوقِ یقین“ پر زور دیتے ہیں، جو بسا اوقات بلا شمشیر و تدبیر، بنی نوع انسان کو غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔

## ۲

عہدِ اقبال کے مخصوص سیاسی و سماجی حالات کی وجہ سے ”جہاد“ کی اصطلاح کے بارے میں عام ذہنوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ (ع: آہ! محلومی و تقلید و زوالِ تحقیق) اور جہاد کو محض شمشیر زنی کے مترادف سمجھ لیا گیا تھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس صورت حال کی تصویر کشی، ان الفاظ میں کی ہے:

عموماً لفظ ”جہاد“ کا ترجمہ انگریزی زبان میں holy war (مقدس جنگ) کیا جاتا ہے، اور اس کی تشریح و تفسیر مدت ہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ ”جوشِ جنوں“ کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے، ڈاڑھیاں چڑھائے، خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ جہاں کسی کا فر کو دیکھ پاتا ہے، پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول: لا الہ الا اللہ، ورنہ ابھی سرتن سے جدا کر دیتا ہوں۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی قلم کاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حروف میں لکھ دیا ہے کہ ع: بوے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے ۱

درحقیقت اسلامی جہاد کا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ محض قتال و شمشیر زنی تک محدود نہیں، بلکہ فلاحِ انسانی کے لیے جملہ صلاحیتوں اور طاقتوں کے استعمال کا نام ”جہاد“ ہے۔ انسانی اصلاح اور تعمیر کے لیے ہر طرح اور ہر سطح کی کوشش و کاوش جہاد ہی کے زمرے میں شمار ہوگی۔ قوت و طاقت کے استعمال اور مال و متاع کی قربانی کے علاوہ: ”زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطہ نظر کو بدلنا، اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔“ ۲

ابتدائی زمانے میں، ذہنی انقلاب کے سلسلے میں اقبال کی نظم ”عبدالقادر کے نام“ (۱۹۰۸ء) قابل ذکر ہے، بقول غلام رسول مہر: ”قوم کی عملی خدمت کے لیے کمر بستہ ہونے کا یہ پہلا اعلان“، لکھا تھا جس میں نوجوان شاعر، افق خاور پر چھائی ہوئی ظلمت کو اُجالے میں بدلنے اور بزم گہ عالم میں شمع کی سی زندگی کے ساتھ ”خود جلیں، دیدہ اغیار کو بینا کر دیں“ کا عزمِ صمیم ظاہر کرتا ہے۔ وہ ”اپنے در ماندہ کارواں“ کو، منزلِ مقصود تک پہنچانے کے والہانہ جذبے سے سرشار ہے (غزل بہ عنوان: ”مارچ ۱۹۰۷ء“)۔ مابعد کی بیشتر منظومات (بلادِ اسلامیہ، ترانہ ملی، شکوہ، خطاب بہ جوانانِ اسلام، شمع اور شاعر، حضور رسالت مآب میں، جوابِ شکوہ، فاطمہ بنتِ عبداللہ، دعا، جنگِ یرموک کا ایک واقعہ، حضرِ راہ، طلوعِ اسلام) میں ملتِ اسلامیہ کی سیکڑوں سالہ جہادی سرگرمیوں اور مجاہدینِ اسلام کے فاتحانہ کارناموں کی مدح و ستائش ملتی ہے۔ اقبال کے نزدیک طرابلس کے شہیدوں کا لہو، ملت کے لیے حیاتِ نو کی علامت ہے اور فاطمہ بنتِ عبداللہ کو وہ ”آبروے اُمتِ مرحوم“ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس عرب لڑکی کی جرأت و جسارت، شوقِ شہادت اور ایک والہانہ جذبہٴ جہاد پر خوش گوار تعجب کا اظہار کرتے ہیں:۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی ۵

اسی زمانے کی نظم ”شمع اور شاعر“ (۱۹۱۲ء) میں اقبال، قدرے واشگاف لہجے میں کہتے ہیں:۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیرِ اللہ کو

خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو ۶

ہفت کشور جس سے ہوتنخیر، بے تیغ و تہنگ

تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سماں بھی ہے ۷

اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) اور موزِ بے خودی (۱۹۱۸ء) میں ملت اور افرادِ ملت کو ان کی اصلیت، جو ہر و جذبے اور ان کے اندر پوشیدہ ”شوکتِ طوفان“ سے آگاہ کرنے کی سعی ملتی ہے۔۔۔ بالِ جبریل کی شاعری میں خودی اور عشق کے امتزاج سے ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، حیدر کُرّار اور شبیرؓ یا حسینؓ، جذبہٴ جہاد کے استعارے بن کر سامنے آتے ہیں اور اقبال کردارِ قاہرانہ، متاعِ تیموری، جرأتِ زندانہ اور حملہٴ ترکانہؑ پر زور دیتے ہیں۔ بالِ جبریل کی غزلوں میں:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم <sup>۸</sup>

عصا نہ ہو تو کلیسی ہے کارِ بے بنیاد <sup>۹</sup>

گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم <sup>۱۰</sup>

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر <sup>۱۱</sup>

کوہِ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب <sup>۱۲</sup>

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیرؓ <sup>۱۳</sup>

میراثِ مسلمانی، سرمایہٴ شبیرؓ <sup>۱۴</sup>

صلہٴ شہید کیا ہے، تب و تابِ جاودانہ <sup>۱۵</sup>

جیسے مصرعے اقبال کے تصورِ جہاد کے سلسلے میں معنی خیز ہیں، اور اس حقیقت کی توثیق بھی کرتے ہیں کہ اقبال ہی کے بقول: ”اسلام، جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے۔“<sup>۱۷</sup> ”طارق کی دعا“ اقبال کے سفرِ اندلس (۱۹۳۳ء) کے قریبی زمانے کی یادگار ہے، اس نظم سے تصورِ جہاد کا ایک پورا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے۔ یہاں اقبال نے جس لذتِ آشنائی اور سُور کا ذکر کیا ہے:۔

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو  
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی کلا  
سُرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے  
تو حرب و ضرب سے بے گانہ ہو تو کیا کہیے<sup>۱۸</sup>

غالباً اس کے پس منظر میں وہ حدیثِ نبویؐ ہے، جس میں آپؐ نے جہاد اور شہادت کے لطف و لذت کا احساس دلانے کے لیے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوَدِدْتُ أَنِّي أَعْرُوُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَأُقْتَلُ، ثُمَّ  
أَعْرُوُ فَأُقْتَلُ ثُمَّ أَعْرُوُ فَأُقْتَلُ<sup>۱۹</sup> (اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے،  
میری خواہش تو یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں لڑوں اور مارا جاؤں، پھر لڑوں اور مارا جاؤں، پھر  
لڑوں اور مارا جاؤں)۔

یوں جہاد فی سبیل اللہ کا حقیقی تصور، اقبال کی شاعری میں پوری طرح واضح نظر آتا ہے، چنانچہ جب وہ کہتے ہیں:

امتاں را در جہان بے ثبات  
نیست ممکن جز بہ کڑاری حیات<sup>۲۰</sup>

یا: ع

زندہ حق از قوتِ شبیریؑ است<sup>۲۱</sup>  
تو یہاں ”کڑاری“ اور ”شبیریؑ“ کے الفاظ واضح طور پر جہاد فی سبیل اللہ کے مترادفات میں سے ہیں۔

علامہ اقبال بجا طور پر سمجھتے تھے کہ گذشتہ ۱۳، ۱۴ سو برسوں میں اسلام کی قوت اور اُمتِ مسلمہ کی بقا کا انحصار جہاد فی سبیل اللہ پر رہا ہے۔ برِ عظیم پر انگریزی استعمار کے تسلط، غلامانہ ذہنیت، سیاسی شکست خوردگی اور مغربی فکر و فلسفے سے مرعوبیت نے تاویلات کے ذریعے تصورِ جہاد کو مخ کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے اس معذرت خواہانہ طرزِ فکر کو قطعی رد کر دیا جس کا بیج سرسید احمد خاں نے تعلیم یافتہ ذہنوں میں بویا تھا اور قادیانی مذہب انگریزی استعمار سے وفاداری کی خاطر اس کی آبیاری کر رہا تھا۔ علامہ اقبال بخوبی جانتے تھے کہ نفیِ جہاد کی اس مہم کے پس پردہ کون سی استعماری طاقت کام کر رہی ہے۔ نظم ”جہاد“ (ضربِ کلیم، ص ۲۸) میں انھوں نے صورتِ حال کا پُر لطف تجزیہ کیا ہے:۔

فتویٰ ہے شیخ کا، یہ زمانہ قلم کا ہے  
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر ۲۲

اقبال کی یہ نظم مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک نظم: ”دینی جہاد کی ممانعت کا فتویٰ“ (۱۹۳۵ء) کا جواب ہے۔ ۲۳۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے خیال میں اقبال، اس نظم میں تنسیخِ جہاد کا اعلان کرنے والی قادیانی جماعت سے مخاطب ہیں ۲۴۔ وہ جناب شیخ سے کہتے ہیں کہ آپ کے وعظ و نصیحت کا اصل مستحق یورپ ہے، جس نے حفظِ باطل کے لیے نوعِ بہ نوع اور جدید ترین اسلحے کے انبار جمع کر رکھے ہیں۔۔۔ اگر آپ امن کے خواہاں ہیں تو ذرا یورپ کا محاسبہ بھی کیجیے: مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر۔ ۲۵

احادیثِ نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات سے افضل ہے۔ ایک دن کا جہاد، ہزار دنوں کی عبادت سے بہتر ہے، بلکہ جہاد کے لیے نکلنے کو صحبتِ نبویؐ میں رہنے پر ترجیح دی گئی ہے۔ ۱۔ جہاد کی اسی فضیلت کے پیش نظر، علامہ اقبال نے تاریخِ اسلام کے ان اکابر و شخصیات کی مدح و ستائش کی ہے، جن کا شمار زمرہٴ مجاہدین و شہدا میں ہوتا ہے (جملہ صحابہ کرامؓ اور بعض حکمران، جیسے: سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان محمد فاتح، ٹیپو سلطان، احمد شاہ ابدالی اور بعض مصلحین و مجاہدین، جیسے: سید احمد شہید بریلوی، شاہ اسماعیل شہید وغیرہ)۔ علامہ اقبال، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی دوراندیشی

کی تعریف کرتے ہیں، جن کی ذات تحریک مجاہدین کی مؤید تھی، اور جن کی دعوت و تحریک پر احمد شاہ ابدالی نے ہندی مسلمانوں کو مرہٹوں کے تسلط سے بچانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔<sup>۲۷</sup>

## ۴

اقبال کے نزدیک جہاد کی دو سطحیں ہیں: ایک ظاہری، دوسری باطنی۔ ظاہری سطح پر جہاد میں قوت و توانائی کے ساتھ جنگی اسلحے اور دیگر اسباب قتال کی فراہمی ضروری ہے۔ فکرِ اقبال میں بحیثیت مجموعی بھی قوت و طاقت، ایک اہم قدر ہے: ع  
کہ سر بہ سجدہ ہیں، قوت کے سامنے افلاک<sup>۲۸</sup>

بازو ہے قوی جس کا، وہ عشق ید اللہی<sup>۲۹</sup>

اقبال کہتے ہیں کہ ”جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد، مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نکتہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے“۔<sup>۳۰</sup>  
اقبال نے طاقت و توانائی اور قوت کے حصول پر طرح طرح سے زور دیا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، مگر اقبال کا ہر ذی ہوش قاری تصدیق کرے گا کہ کلامِ اقبال میں تیزی و تندگی، سرکشی و بے باکی، عزمِ بلند، جرأتِ رندانہ، کردارِ قاہرانہ، دبدبہ نادر، شکوہِ سنجر، شوکتِ تیموری، متاعِ تیموری اور مردانِ جفاکش کا ذکر بکثرت ملتا ہے اور یہ ذکر بالعموم پسندیدگی کے انداز میں ہے۔ اس سے ان کے ہاں ایک ایسے مجاہد کا کردار اُبھرتا ہے جو تمام تر فقر و درویشی کے باوصف، ہمیشہ مستعد و متحرک رہتا ہے، اہو گرم رکھنے کے لیے پلٹنے، جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کو اپنا شعار بناتا ہے اور اس کی رفعت پسندی تلاشِ منزل کے لیے آسمان کی بلندیوں کا رخ کرتی ہے: ع مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ۔<sup>۳۱</sup>  
مختصر یہ کہ اقبال کا مجاہد متحرک اور جہدِ مسلسل کا نمایندہ اور قوت و طاقت کا خواہاں ہے۔



اقبال مرّوجہ تصوّف سے مایوس تھے کیوں کہ صوفیہ کے ہاں ”مجاہدانہ حرارت“ ہی عنقا تھی اور انھوں نے ”جنگِ دست بدست“ کے معرکوں سے گریز پا ہو کر، ”خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات“، کونجات کے لیے کافی سمجھ لیا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے کلامِ اقبال کے مطالعے سے ایک دل چسپ نکتہ اخذ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

کلامِ اقبال کا قریباً ہر شعر اس کے پیامِ حرکت و حرارت کے کسی نہ کسی پہلو کا حامل اور امین ہے۔ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش ۲۵ ہزار اشعار کہے ہیں۔ کم از کم ۲۰ ہزار اشعار ایسے ضرور نکلیں گے جو اس کے کلام میں حرکت و حرارت کی صدا کی کیفیات کے آئینہ دار ہوں گے۔<sup>۳۲</sup>

حرکت و تحرّک کی مناسبت سے یہاں پروفیسر حمید احمد خاں کی ایک روایت کا ذکر مناسب ہوگا۔ وہ علامہ اقبال سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو ملے تھے۔ اس ملاقات کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں کہ تصوّف کا ذکر آیا تو حضرت علامہ نے مرزا غالب کے سکونی (static) تصوّف کے مقابلے میں بیدل کے حرکی (dynamic) تصوّف کی تعریف کی [علامہ نے گفتگو میں یہی انگریزی لفظ استعمال کیے تھے] کیوں کہ ان کے بقول:

بیدل کے کلام میں خصوصیت سے حرکت پر زور ہے، اس گفتگو میں اقبال نے ایک اور پتے کی بات کہی، فرمایا: ”نقشِ بندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت کی بنیاد یہی ہے۔ نقشِ بندی مسلکِ حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے، [ڈاکٹر صاحب نے "dynamic and optimistic" فرمایا]۔ مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے [یہاں ڈاکٹر صاحب نے "pessimistic and static" کے الفاظ استعمال کیے]۔ اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقہٴ ارادت زیادہ تر ہندستان تک محدود ہے، مگر ہندستان سے باہر، افغانستان، بخارا، ترکی وغیرہ میں نقشِ بندی مسلک کا زور ہے۔<sup>۳۳</sup>

افغانستان، ترکی اور بخارا کا ذکر آیا تو یہ بتانا مناسب ہوگا کہ اقبال افغانوں اور ترکوں کے عسکری مزاج کے ہمیشہ مدّاح رہے۔ بہ نسبت دوسری اسلامی قوموں کے، اقبال افغانوں اور ترکوں سے زیادہ توقعات رکھتے تھے، غالباً اس لیے کہ دونوں قوموں نے بیرونی تسلط کے خلاف ہمیشہ مزاحمت کی اور اپنی مجاہدانہ افتادِ طبع کی وجہ سے، کسی استعماری طاقت

کی مستقل غلامی پر رضامند نہیں ہوئے۔ جہاد افغانستان (۱۹۷۹ء-۱۹۸۹ء) تو ایسا کرشمہ ساز ثابت ہوا کہ بخارا و سمرقند کی غلامی کی زنجیریں بھی ٹوٹ گئیں۔ عہد اقبال میں وسطی ایشیا کے مسلم اکثریتی علاقے اشتراکی سامراج کی گرفت میں تھے اور غازی انور پاشا اور ان کے رفقاء، ترکی سے چل کر مقامی مجاہدین آزادی کی مزاحمتی کارروائیوں میں جاشامل ہوئے۔ اقبال نے انور پاشا کی جہادی سرگرمیوں کو سراہا۔ وہ پُر امید تھے کہ یہ سرگرمیاں نتیجہ خیز ہوں گی۔<sup>۳۳</sup>

اسی طرح ۱۹۳۰ء-۱۹۳۲ء کے زمانے میں چینی ترکستان کے مسلمانوں نے جنگِ آزادی شروع کر رکھی تھی۔ برِ عظیم کے مسلمانوں کو قدرتا، اس سے دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا بیان ہے کہ علامہ اقبال کو اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس تحریک سے کسی عظیم تر انقلاب ("آشوبِ ہلاکوے، ہنگامہ چنگیزے") کی توقعات قائم کر رہے تھے۔<sup>۳۵</sup> ایک اور جگہ انھوں نے الجوزائر کے عبدالکریم ریفنی کی جہادی سرگرمیوں کی تائید و تحسین بھی کی ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اقبال کے فکر اور ان کی شاعری کی افتاد و نہاد مجاہدانہ ہے اور ان کے نزدیک افراد کی حیاتِ نو اور اُمت کی نشاتِ ثانیہ کا راز اسی جہادی قوت و طاقت میں مضمر ہے۔ جہاد کے لیے قوت و طاقت کی بہر قیمت فراہمی عین تقاضا دین ہے۔ تلواروں کے سارے تلے زندگی کی نشوونما کا تصوّر (تیغوں کے سارے تلے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں)<sup>۳۶</sup> اقبال نے غالباً رسولِ اکرمؐ کے اس فرمان سے اخذ کیا ہے: إِنَّ أَبْوَابَ الْجَنَّةِ تَحْتَ ظِلِّ الشَّيْطَانِ (جنت کے دروازے تلواروں کے سایے تلے ہیں)<sup>۳۷</sup>۔ ایک اعتبار سے 'عصا'، 'ضربِ کلیمی'، 'چوبِ کلیم' اور زورِ حیدری، اسی تلوار کے مترادفات ہیں۔

ایک بار جناب یوسف سلیم چشتی سے جہاد پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ کہنے لگے:  
 جہاد کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اگر ایک شخص اپنے ایمان، اپنے تمدن اور اپنے وطن کی حفاظت یا حمایت میں تلوار بلند نہیں کر سکتا تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر

تلوار کا اور مصرف کیا ہے؟ جب کبھی مسلمان کا دین خطرے میں ہو، اس پر تلوار اٹھانا فرض ہے۔ اگر وہ اس مقدس فرض کی انجام دہی کے لیے تلوار نہیں اٹھاتا تو پھر اس کی تلوار اس کے کس دن کام آئے گی؟

جہاد اگر جوع الارض کے لیے ہو تو حرام ہے، لیکن اسلام کی حفاظت کے لیے جہاد کرنا پہلے بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے۔<sup>۳۸</sup>

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے شمشیر زن مجاہد کے لیے خطر پسندی اور سخت کوشی کو ضروری قرار دیا ہے۔ سطورِ بالا میں اقبال کے جس مجاہدانہ کردار کا ذکر آیا ہے، اس کی وضاحت اقبال کے بعض شعروں اور مصرعوں سے ہوتی ہے، مثلاً: ع

سخت کوشی ہے تلخِ زندگانی انگلیں<sup>۳۹</sup>

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر<sup>۴۰</sup>

تو ان کو سکھا خارہ شگانی کے طریقے<sup>۴۱</sup>

جوے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی<sup>۴۲</sup>

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں

وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد<sup>۴۳</sup>

باطل کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے سب سے بڑا اور کارگر ہتھیار تلوار ہے، جس کے بغیر کوئی مہم سر نہیں ہو سکتی: ع

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے

بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے<sup>۴۴</sup>

اقبال کے تصورِ جہاد میں ظاہری قوت و طاقت کا استعمال ضروری تو ہے، مگر جہاد کی باطنی سطح بھی قابلِ توجہ ہے اور یہ زیادہ بامعنی اور اہم ہے۔ مجاہد کی حقیقی قوت کا سرچشمہ روحِ جہاد ہے۔ اقبال کے ہاں تلوار محض ایک آلہ ضرب کا نام نہیں، بلکہ اس جذبے، رویے اور روحانی قوت کا نام ہے جسے اقبال کبھی ”فقر“ کا نام دیتے ہیں، کبھی ”خودی“ کا اور کبھی ”عشق“ کا۔۔۔ یعنی جہاد میں اصل چیز وہ باطنی کیفیت یا روحِ جہاد ہے جس سے سرشار ہو کر مردانِ غازی، ع: ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے<sup>۴۷</sup> اور، ع: تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے بھی لڑ جاتے تھے<sup>۴۸</sup> کا مجسم نمونہ بن جاتے ہیں۔ فی الحقیقت مردِ غازی، شمشیر و سناں، تیغ و فنگ یا دوسرے خارجی وسائل پر بھروسا نہیں کرتا (مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی)۔<sup>۴۹</sup> وہ اس یقین و اعتماد سے سرشار ہے کہ وہ تاریخ کا رخ بھی بدل سکتا ہے اور قوموں کی تقدیر بھی۔ کلمہ لا الہ الا اللہ، اقبال کے نزدیک ایک تیغ بے زہار ہے اور، ع: لا الہ ضرب است و ضربِ کاری است۔<sup>۴۸</sup> یہی کلمہ، قلبِ مومن کو ”فقر“ سے آشنا کرتا ہے (ع: اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار<sup>۴۹</sup> اور اس کے نتیجے میں:۔

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن

یا خالدِ جانناز ہے یا حیدرِ کرار<sup>۵۰</sup>

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اقبال کے ہاں ”فقر“ کی جس قدر تلقین ملتی ہے، وہ ”خودی“ اور ”عشق“ سے کہیں زیادہ ہے، اور عباداتِ ظاہری سے تو یقیناً، زیادہ ہے۔ ان کے نزدیک ”فقر“ پورے دین پر محیط ہے، بلکہ یہ اسلام ہی کا دوسرا نام ہے:

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر

دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور<sup>۵۱</sup>

اقبال کا تصورِ فقر انسان کو تحرک، قوت اور جرأتِ رندانہ عطا کرتا ہے۔ یہ ایک جہادی رویہ ہے جس سے غفلت کا نتیجہ غلامی ہے:۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو  
کہ تجھ سے ہو نہ سکی، فقر کی نگہبانی ۵۲

اقبال نے کیفیتِ فقر کو اسوۂ رسولؐ کے حوالے سے بھی واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک فقر ”متاعِ مصطفیٰ“ ہے۔۔۔ ع: ما مینیم، اس متاعِ مصطفیٰ است،۔ ۵۳ آل حضورؐ کے لیے ”فقر“ باعثِ فخر تھا۔ آپؐ کے ہاں کئی کئی دن چولہا تک گرم نہیں ہوتا تھا۔ کہیں سے ہدیہ آتا، آپؐ فوراً تقسیم کر دیتے۔ جنگِ خندق کے موقع پر، آپؐ نے اپنے رفقا کے (ایک ایک پتھر کے) مقابلے میں پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ آپؐ نے جاہ و منصب اور مال و منال کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بلاشبہ آپؐ یُوْتِرُونَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ کا بہترین نمونہ تھے۔ اقبال نے اسے ”جمازی فقر“ کہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

اس فقر سے آدمی میں پیدا      اللہ کی شان بے نیازی  
یہ فقرِ غیور جس نے پایا      بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی  
مومن کی اسی میں ہے امیری      اللہ سے مانگ یہ فقیری ۵۴

اقبال کا فقیر یا قلندر، فی الاصل بہت بڑا مجاہد ہے۔ مثنوی پس چہ باید کرد  
میں اقبال کہتے ہیں کہ جب مجاہد اپنے ”فقر“ کو بروے کار لاتا ہے تو اس کی ہیبت سے  
بحر و بر اور چاند اور سورج بھی لرزتے ہیں۔ اس فقر کی قوت کبھی تو بدروحین میں ظاہر ہوتی  
ہے اور کبھی اس کی جھلک تکبیرِ حسینؑ میں نظر آتی ہے (ص ۲۲)۔ پھر اقبال اس قوم پر افسوس  
کرتے ہیں جس نے میر و سلطان تو پیدا کیے مگر کوئی درویش پیدا نہیں کیا، ع: میر و سلطان زادو  
درویشے نژاد۔ ۵۵ ان کے نزدیک زوالِ مسلم کا ایک سبب فقر سے محرومی ہے:۔

یہ فقر، مردِ مسلمان نے کھو دیا جب سے  
رہی نہ دولتِ سلیمانی و سلیمانی ۵۶

ند ایراں میں رہے باقی نہ تو راں میں رہے باقی  
وہ بندے، فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسر ۵۷

اقبال نے ”فقر“ کی تجسیم جن شخصیات میں کی، ان میں محی آخراۃ ماں کے علاوہ حضرت خالد بن ولید، حضرت علیؓ اور حضرت شبیرؓ شامل ہیں۔ ان درویشانِ باصفا کو اللہ نے نانِ جویں کے ساتھ بازوے حیدر سے بھی نوازا تھا۔ بلاشبہ یہ اصحاب، زہد و ریاضت اور فقر و غنا کا نمونہ تھے اور اسی لیے جہادِ اسلامی کے مثالی پیکر بھی۔ اس سے یہ نکتہ اخذ کرنا غلط نہیں کہ تکمیلِ شخصیت کے لیے فقر و جہادِ لازم و ملزوم ہیں۔

اوپر بھی اشارہ کیا گیا کہ اقبال کے ہاں جہاد کا مفہوم، محض شمشیر زنی، اظہارِ قوت، معرکہ آرائی یا قتال تک محدود نہیں، اصل مطلوب جہادی روح یا جہادی رویہ ہے چنانچہ قوت و طاقت اور معرکہ آرائی کے ساتھ علم و عقل اور حکمت و دانش کا حصول بھی روحِ جہاد کا ضروری حصہ ہے۔ اقبال کا مجاہدانہ کردار، ’نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں‘ کا امتزاج ہے اور ’عجم کے حسنِ طبیعت، اور عرب کے سوزِ دروں‘ کا نمائندہ۔

## ۶

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کے تناظر میں اقبال کے تصورِ جہاد کی کیا معنویت ہے؟

اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ اقوامِ عالم میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا ہے۔ اقبال کے زمانے میں مغرب کی بڑی طاقتوں کا استعمارانہ تسلط برقرار و باقی تھا، چنانچہ اقبال شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ: ’نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے‘۔<sup>۵۸</sup> مگر اس تشکیل کے لیے مغرب کی فراہم کردہ بنیادیں بودی ثابت ہو چکی تھیں، بقول اقبال:

جہان نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم پیر مر رہا ہے

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے، قمار خانہ<sup>۵۹</sup>

اقبال کا تصورِ جہاد، جہانِ نو کی تشکیل کے لیے اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کی

بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد، دنیا میں ایک عادلانہ نظامِ زندگی کا قیام و استحکام ہے۔ اقبال کی وفات پر چھ عشروں سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، مگر ان کے تصورِ جہاد کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ واضح رہے کہ اقبال نے جہاد کا جو تصور پیش کیا ہے، اس میں، جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے ہی سے معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اقبال نے جہاد کو اسلام کی روح اور سنتِ پیغمبری قرار دیا ہے (جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است<sup>۱۰</sup>)۔ ان کے نزدیک جہاد کا مقصد نہ تو حصولِ دولت و غنائم ہے اور نہ شہرت و نامِ وری۔ مجاہد نہ تو فساد یوں کی طرح کمزوروں پر دھونس جماتا ہے، نہ وہ استعماریوں کی مانند ملک گیری کی ہوا و ہوس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی ساری تگ و دو مفسدوں اور ظالموں کی بیخ کنی، باطل و بدی کے خلاف جہادِ پیہم اور کمزوروں اور مظلوموں کی مدد و اعانت کے لیے ہوتی ہے۔ گویا، جہاد سے مقاصدِ دین ہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

قوت و طاقت اور دین کا باہمی ربط کیا ہے؟ ضربِ کلیم کی نظم ”قوت اور دین“ میں اقبال نے اس تعلق کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قوتِ محض یا اندھی قوت انتہائی خطرناک ہے، کیوں کہ اس کا مقصد جاہ و اقتدار کا حصول اور نفسانی اغراض کی تکمیل ہے۔ وحشیانہ قوت نے اسکندر و چنگیز کی صورت میں بارہا دامنِ انسانیت تارتا رہا ہے، اس کے سامنے عقل و نظر اور علم و ہنر بھی بے بس ہو جاتے ہیں، ہاں اگر اسے دینی حدود کا پابند کر لیا جائے تو پھر یہی جہادی قوت ہر طرح کے فتنہ و فساد کا علاج بن جاتی ہے بلکہ، ع:

ہو دین کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک<sup>۱۱</sup>

بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کی ہلاکت خیزیوں کا تصور کیجیے اور دنیا کے مختلف خطوں میں مظلومین و مستضعفین کے خلاف ظالموں اور مفسدوں کی حالیہ چنگیزیّت اور ستم رانیوں، بلکہ ایک طرح کی غیر اعلانیہ جنگ (undeclared war) کا خیال کیجیے۔۔۔ پھر تاریخ کے اوراق میں محفوظ مجاہدین کے طرزِ عمل پر نظر ڈالیے، تو اقبال کی متذکرہ بالا نظم کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔

اسلام نے جہاد کا جو تصور دیا ہے (اور اقبال کا تصور جہاد بھی، اس سے مختلف نہیں ہے) اس کی حقیقی نوعیت و معنویت، جہاد کے ثمرات و برکات سے متعین ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ سیدنا حضرت عمر فاروق کے زمانہ خلافت کا واقعہ ہے۔ مجاہدین اسلام کی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں۔ اسلامی افواج نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ایک جانب سے سپہ سالار ابو عبیدہ بن الجراح تھے اور مخالف سمت سے، ان کے ایک کمانڈر خالد بن ولید محاصرین پر دباؤ بڑھا رہے تھے۔ جناب ابو عبیدہ نے مصالحت سے کام لیا اور دمشق میں داخل ہو گئے۔ عین اسی وقت حضرت خالد نے محاصرین کو مغلوب کر لیا اور دوسری جانب سے فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت حال سے بے خبر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار، قلب شہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مقام اتصال پر دونوں کو صورت حال کا علم ہوا۔ معاملہ پیچیدہ تھا، مگر اسلام کے قانون بین الاقوام (International Law) پر عمل درآمد کے نتیجے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ فوراً ایک لیکر کھینچ کر شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اتفاقاً امر یہ کہ شہر کا ایک گرجا دو حصوں میں بٹ گیا۔ تقسیم کی لیکر اس کے درمیان سے گزرتی تھی۔ چنانچہ شہر کے ایک حصے پر، جسے حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا تھا، فتح کے احکام کا نفاذ کیا گیا، اور حضرت ابو عبیدہ کے ہاتھوں جو علاقہ فتح ہوا تھا، اس پر صلح کے احکام نافذ کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں آدھا گرجا مسجد بنا دیا گیا اور باقی آدھا، گرجا ہی رہنے دیا گیا۔ یوں شہر کے آدھے حصے پر، اسلامی قانون کے احکام لاگو کیے گئے اور آدھے حصے پر، جسے حضرت ابو عبیدہ نے مصالحت سے حاصل کیا تھا، بدستور عیسائی احکام باقی رکھے گئے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے جب مسلم احکام والا علاقہ زیادہ عدل و مساوات اور بھائی چارے کا مظہر بنا تو عیسائی رعایا بھی جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور اس کے پُر زور مطالبے پر شہر کے باقی ماندہ حصے پر بھی مسلم احکام نافذ کر دیے گئے۔ یہ احکام اس وقت تک لاگو نہیں کیے گئے تھے جب تک کہ خود عیسائی آبادی نے اس کا مطالبہ نہیں کیا۔ ۱۲

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، جہاد کے مثبت اور وسیع الاطراف اثرات سے تاریخ اسلامی



کے اوراق جگمگ رہے ہیں۔ مندرجہ بالا مثال سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالمِ انسانیت کو جیسا امن و انصاف اور جیسی سلامتی، جہادِ اسلامی کے ذریعے میسر آ سکتی ہے، وہ دورِ حاضر کے نام نہاد امن معاہدوں اور منافقانہ سمجھوتوں سے ممکن نہیں۔

تصوّرِ جہاد کو دو حوالوں سے رو بہ عمل لانے کی ضرورت ہے:

اول: اُمتِ مسلمہ کا بڑا حصہ آج بھی تقلید و جمود اور جہالت و جاہلیت کی بھول بھلیوں میں گم ہے اور ملوکیت و خانقاہیت کا اسیر اور فریبِ نفس کا شکار ہے۔ عالمِ اسلام، مغرب کی سیاسی غلامی سے تو آزاد ہو گیا، مگر ذہنی و فکری اور تہذیبی و علمی اعتبار سے بدستور اس کا غلام ہے۔ جذبہٴ جہاد ایسی خود اعتمادی عطا کرتا ہے کہ اس کے ذریعے غلامی و مرعوبیت کا یہ طلسم کا فور ہو سکتا ہے۔ فی الوقت مغرب کے اس طلسم سے رہائی عالمِ اسلام کی بنیادی ضرورت ہے۔

دوم: عالمِ اسلام سے آگے بڑھ کر، عالمِ انسانیت پر نظر ڈالیے۔ اقبال کا آخری زمانہ تھا، اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا (۱۸ اگست ۱۹۳۵ء)۔ علامہ کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا، ع: ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش --- مسولینی کے اس فسطائی اقدام پر اقبال کا ردِ عمل بہت کرب انگیز تھا:۔

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال

غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گرگ کو ہے برّہٴ معصوم کی تلاش ۶۳

وفات سے چند ماہ پہلے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سالِ نو کے ریڈیائی پیغام میں، انھوں نے حبشہ، فلسطین، ہسپانیہ اور چین کے حوالے سے اپنے کرب و اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

The same misery prevails in every corner of man's earthly home, and hundreds of thousands of men are being butchered mercilessly. The Governments are sucking the

blood of the weaker people economically. It is, as if the day of doom had come upon earth, ..... and in which no voice of human sympathy or fellowship is audible.<sup>۶۴</sup>

(یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے زمینی گھر کا ہر حصہ ایسے ہی ظلم اور خون ریزی کا شکار ہے، اور سیکڑوں اور ہزاروں انسان بے دردی کے ساتھ ذبح کیے جا رہے ہیں۔ حکومتیں بھی مختلف معاشی حربوں سے غریب عوام کا خون چوس رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمین پر قیامت برپا ہوگئی ہو۔۔۔ اور ایسے میں انسانی ہمدردی اور دوستی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔)

عالمی منظر پر نگاہ دوڑائیے، آج بھی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔ اقبال ایک اہل سینیا پر روئے تھے، آج روئے زمین پر کتنے ہی خطے اہل سینیا بنے ہوئے ہیں۔ گرگانِ مشرق و مغرب، برہہ ہائے معصوم کی تلاش میں فلسطین، کشمیر، کوسووا، افغانستان، عراق اور چیچنیا کو پامال کر رہے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں: -

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں  
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات  
قافلہٴ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں  
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوے دجلہ و فرات<sup>۶۵</sup>

ہر نیا دن بڑی طاقتوں کے کاروبار فریب و منافقت اور کمزور ملکوں پر ان کے غلبہ و استیلا کے لیے نئی سے نئی اسکیمیں لے کر سامنے آتا ہے۔ دنیا میں جہاں بھی بڑی طاقتوں کے مظالم، مکروریا، اور چال بازیوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے تو مزاحمت کرنے والوں کو کبھی 'بنیاد پرست' اور کبھی 'دہشت گرد' قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ ظلم و استبداد کے خلاف مزاحمت بالکل فطری ہے اور اس کے پس منظر میں کم و بیش وہی روحِ جہاد کارفرما ہے، جس کا تصوّر اقبال نے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: -

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریفِ پنچہ لگن نئے  
وہی فطرتِ اسدِ اللہی، وہی مرجی، وہی عتتری<sup>۶۶</sup>

تازہ ہر عہد میں ہے قصّہ فرعون و کلیم ۷۷

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحرِ قدیم ۷۸

مگر اقبال محسوس کر رہے تھے کہ ”دانشِ حاضر“ کا طلسم ٹوٹنے کو ہے۔ سرمایہ داری کے زوال اور جمہوریت کی ناکامی سے یورپی تہذیب و تمدن حالتِ نزع میں ہے۔ اس صورتِ حال میں جذبہٴ جہادِ نظامِ عالم کی نئی تشکیل میں ایک مؤثر رول ادا کر سکتا ہے۔ اقبال پوچھتے ہیں، ع:

اس زمانے میں کوئی حیدرِ کزار بھی ہے؟ ۷۹

اقبال کے اس سوال ہی میں، جواب بھی پنہاں ہے۔ دوسری جگہ انھوں نے بہ وضاحت کہہ دیا، ع:

گزر اس عہد میں، ممکن نہیں بے چوبِ کلیم ۷۰

’چوبِ کلیم‘ عصرِ حاضر میں امنِ عالم کو خطرے میں ڈالنے والی قوتوں کے لیے بہت بڑا اسدِ جارحیت (deterrent) ہے۔ جیسی اس کی ضرورت آج ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ اقبال کے الفاظ میں: ’جہاد‘ ایک طرح سے اسلام کی روح ہے، اے اور اسی لیے اُمتِ مسلمہ کی قوت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اقبال ہمیں فطرتِ اسدِ اللہی کو بروئے کار لانے، اور چوبِ کلیم سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ کا یہی منشا ہے اور اقبال تصوّرِ جہاد کی معنویت بھی یہی ہے۔

(یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء کو لاہور میں منعقدہ تیسری عالمی اقبال

کانگریس میں پیش کیا گیا۔ مطبوعہ: ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، اپریل ۱۹۹۹ء۔ تجدیدِ نظر: دسمبر ۲۰۰۳ء)۔

## حوالے اور حواشی

- ۱- پس چہ باید کرد، ص ۸۲۔
  - ۲- ”جہاد فی سبیل اللہ“ کے موضوع پر یہ اقتباس اس تقریر سے لیا گیا ہے جو علامہ اقبال کی وفات کے ایک برس کے بعد ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء کو یوم اقبال منعقدہ ناؤن ہال لاہور میں کی گئی۔ (تقریر کا مکمل متن دیکھیے: اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات: اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۹۲)۔
- گیارہ بارہ برس پہلے سید مودودی نے الجمعۃ میں اسلامی جہاد پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا، جو ”مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، رفیق اعزازی دارالمصنفین“ کی پہلی علمی تصنیف کی حیثیت سے الجہاد فی الاسلام کے نام سے ۱۹۳۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا، اس کے سرورق کی عبارت یہ تھی:
- ’اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسلام کے قوانین جنگ و صلح، معترضین کے جوابات اور شکوک و شبہات کا ازالہ اسلامی قانون کا دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے قوانین جنگ سے مقابلہ و موازنہ اور موجودہ یورپین قوانین جنگ پر مفصل تبصرہ اور ان پر اسلامی قانون کی برتری۔‘
- یہ کتاب علامہ اقبال کی نظر سے بھی گزری۔ پھر ۱۹۳۳ء سے ترجمان القرآن، سید مودودی کے زیر ادارت نکلتا شروع ہوا، تو یہ بھی علامہ اقبال کے مطالعے میں آتا تھا۔ بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الجہاد فی الاسلام اور سید مودودی کی دیگر تحریروں سے متاثر تھے۔ چودھری نیاز علی خاں کو موضع جمال پور نزد پٹھان کوٹ میں اپنے مجوزہ اسلامی مرکز کے لیے کسی موزوں شخص کی تلاش تھی، علامہ اقبال کے ایک دربیہ رفیق سید نذیر نیازی (۱۹۰۰ء-۱۹۸۱ء) راوی ہیں کہ ایک ملاقات میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ چودھری صاحب قحط الزجال کا شکوہ کر رہے تھے۔ علامہ اقبال کے ذہن میں ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کا ایک تاثر موجود تھا، انھوں نے فرمایا: ”اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں، ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ بھی شامل ہیں، ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے۔“
- سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدرآباد سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔

دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائلِ حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی، آپ کیوں نہ انھیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے۔ (اقبالیاتِ نذیرِ نیازی، مرتب: عبداللہ شاہ ہاشمی۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۴)۔

حقیقت تو یہ ہے کہ غلامی، سرسید اور قادیانیت نے اسلام کے تصوّرِ جہاد کو مسخ و منسوخ کرنے کی جو کوشش کی تھی، الجہاد فی الاسلام اور علامہ اقبال نے اسے ناکام بناتے ہوئے، تصوّرِ جہاد کو اس کا صحیح تناظر عطا کیا۔ یہ ان کا ایسا بڑا کارنامہ ہے جس کے اثرات کئی سال بعد انقلابِ ایران اور پھر افغانستان، بونیا، کشمیر، عراق، فلسطین، چینیا، برما، فلپائن، لبنان اور کوسووا کی جہادی اور مزاحمتی تحریکوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

- ۳- سید ابوالاعلیٰ مودودی: اسلامی نظامِ زندگی، ص ۳۰۰۔
- ۴- مطالبِ بانگِ درا: شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۵۶۔
- ۵- بانگِ درا، ص ۲۱۴۔
- ۶- ایضاً، ص ۱۹۲۔
- ۷- ایضاً، ص ۱۹۳۔
- ۸- بال جبریل، ص ۶۳۔
- ۹- ایضاً، ص ۷۰۔
- ۱۰- ایضاً، ص ۶۰۔
- ۱۱- ایضاً، ص ۵۲۔
- ۱۲- ایضاً، ص ۲۹۔
- ۱۳- ایضاً، ص ۷۳۔
- ۱۴- ایضاً، ص ۱۶۰۔
- ۱۵- ایضاً، ص ۱۵۔
- ۱۶- اقبال نامہ، اول، ص ۳۶۔
- ۱۷- بال جبریل، ص ۱۰۵۔
- ۱۸- ضربِ کلیم، ص ۵۳۔
- ۱۹- بخاری، مسلم بحوالہ: جہادِ اسلامی، خلیل احمد حامدی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۴-۲۵۔

۲۰- پس چہ باید کرد، ص ۸۲۔

۲۱- اسرار و رموز، ص ۱۱۰۔

۲۲- ضربِ کلیم، ص ۲۸۔

۲۳- مرزا غلام احمد قادیانی کی اس نظم کا شعر ہے:

اب چھوڑ دو جہاد کا، اے دوستو، خیال

دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

مزید برآں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: 'ہم ان تمام مذہبی جنگوں کے مخالف ہیں، جو جہاد کے طور پر تلوار سے کیے جاتے ہیں'۔ (بحوالہ: ثبوت حاضری، مرتب: محمد متین خالد۔ عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت، ملتان، ۱۹۹۷ء، ص ۷۵۰)۔ اقبال نے جاوید نامہ میں دو جعلی بیخبروں کا ذکر کیا ہے، ایک ایرانی (بہاء اللہ) اور دوسرا ہندی (مرزا قادیانی)۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک نے اُمتِ مسلمہ کو حج سے، اور دوسرے نے جہاد سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی ہے (جاوید نامہ، ص ۲۰۰)۔

۲۴- ضربِ کلیم مع شرح، اعتقاد پبلسٹنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۹۹۔

۲۵- ضربِ کلیم، ص ۲۸۔

۲۶- جہادِ اسلامی: ص ۲۲، ۲۷-۲۸۔

۲۷- اقبال کے حضور، مرتب: نذیر نیازی۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۳۱۔

۲۸- ضربِ کلیم، ص ۱۲۳۔

۲۹- ایضاً، ص ۱۷۴۔

۳۰- اقبال نامہ، اول، ص ۴۴-۴۵۔

۳۱- بالِ جبریل، ص ۱۶۵۔

۳۲- تصوّراتِ اقبال، مرتب: معز الدین احمد۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص ۱۹۶۔

۳۳- اقبال کی شخصیت اور شاعری: مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۵۴، ۵۵۔

۳۴- تفصیل کے لیے دیکھیے: چودھری محمد حسین اور اقبال (روابط): ثاقف نفیس۔

غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ایم اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء۔ مخزونہ: اورینٹل کالج لاہور، لاہور۔

۳۵- اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص ۳۷۔

۳۶- بانگِ درا، ص ۱۵۹۔

۳۷- مسلم شریف، بحوالہ: جہادِ اسلامی، ص ۲۹۔

- ۳۸- اقبال ریویو: لاہور، جولائی ۱۹۸۴ء، ص ۳۷۔
- ۳۹- بالِ جبریل، ص ۱۲۱۔
- ۴۰- بانگِ درا، ص ۲۷۳۔
- ۴۱- ضربِ کلیم، ص ۵۸۔
- ۴۲- بانگِ درا، ص ۲۵۹۔
- ۴۳- بالِ جبریل، ص ۸۔
- ۴۴- ضربِ کلیم، ص ۱۲۷۔
- ۴۵- بانگِ درا، ص ۱۶۴۔
- ۴۶- ایضاً، ص ۱۶۵۔
- ۴۷- بالِ جبریل، ص ۳۵۔
- ۴۸- ایضاً، ص ۱۶۔
- ۴۹- ضربِ کلیم، ص ۲۷۔
- ۵۰- ایضاً، ص ۲۷۔
- ۵۱- ایضاً، ص ۳۱۔
- ۵۲- ایضاً، ص ۳۲۔
- ۵۳- پس چہ باید کرد، ص ۴۶۔
- ۵۴- ضربِ کلیم، ص ۸۹۔
- ۵۵- پس چہ باید کرد، ص ۲۳۔
- ۵۶- ضربِ کلیم، ص ۵۱۔
- ۵۷- بالِ جبریل، ص ۲۳۔
- ۵۸- اس ضمن میں ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کے خطوط بنام سید سلیمان ندوی اور بنام راغب احسن میں علامہ اقبال نے ایک جیسے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ (اقبال نامہ، اول، ص ۱۸۱۔ اقبال: جہانِ دیگر، مرتب: محمد فرید الحق۔ گردیزی پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۶۷)۔
- ۵۹- ایضاً، ص ۱۳۰۔
- ۶۰- جاوید نامہ، ص ۱۸۵۔
- ۶۱- ضربِ کلیم، ص ۲۹۔

- ۶۲- ڈاکٹر محمود احمد غازی، خطباتِ بہاول پور (۲) اسلام کا قانونِ بین الممالک:، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۵۔
- ۶۳- ضربِ کلیم، ص ۱۴۵۔
- ۶۴- Speeches، ص ۲۵۰۔
- ۶۵- بالِ جبریل، ص ۱۱۲۔
- ۶۶- بانگِ دراء، ص ۲۵۳۔
- ۶۷- ضربِ کلیم، ص ۳۰۔
- ۶۸- بالِ جبریل، ص ۶۰۔
- ۶۹- ایضاً، ص ۶۳۔
- ۷۰- ایضاً، ص ۶۰۔
- ۷۱- اقبال نامہ، اول، ص ۳۲۳۔



## اسلامی نشاتِ ثانیہ اور علامہ اقبال

مسلم معاشروں میں اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے ایک احساس و آرزو اور اس کے حصول کی تمنا ہمیشہ ایک دیرینہ اور سہانے خواب کی صورت میں موجود رہی ہے۔ اس ضمن میں، ہماری ملٹی تاریخ کے اوراق، داعیانِ دین اور مصلحین و مجددین اُمت کی پُر جوش اور مخلصانہ کاوشوں سے جگمگا رہے ہیں اور ان کاوشوں کا سلسلہ صدیوں پیچھے، انبیاء کرام کی سعی و جدوجہد تک پہنچتا ہے۔

جملہ انبیاء کرام کی تمام تر جدوجہد کی غایت یہ تھی کہ بنی نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ بعثتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی یہی تھا کہ روئے زمین پر اَن اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (الشوریٰ ۱۳: ۴۲) اور لِيُظْهِرَهُ عَلٰى الدِّيْنِ كَمَلِّهِ (التوبہ ۹: ۳۳) کا ایک مثالی اور عملی نمونہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ آں حضور کے برپا کردہ فکری اور ذہنی انقلاب کے ذریعے جاہلی معاشرے کی کاپلٹ گئی۔ اسلام، بساطِ عالم پر ایک ایسی قوت بن کر ابھرا جو مشرق و مغرب کے باطل پرستوں کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔

خلفائے راشدین کے بعد کثرتِ اموال اور تمدنی ترقی سے جاہلیت کی روح پھر سے بیدار ہونے لگی۔ نظمِ مملکت غیر اسلامی بنیادوں پر استوار ہونا شروع ہوا۔ اس پر مصلحین اُمت کو اصلاحِ احوال کی فکر دامن گیر ہوئی۔ خلفائے راشدین کے بعد حضرت عمرؓ

بن عبدالعزیز وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے سنجیدہ کوشش کی۔ آپ کے بعد، امام احمد ابن حنبل، امام غزالی، مجدد الف ثانی، اورنگ زیب عالم گیر، ٹیپوسلطان شہید، شاہ ولی اللہ، محمد بن عبدالوہاب، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، سرسید احمد خاں اور ایسے ہی بعض دیگر اکابر کی مختلف النوع تجدیدی کاوشیں، تاریخِ احیا کا ایک روشن باب ہیں۔ بیسویں صدی میں اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے جن اکابر نے تگ و دو کی، اُن میں علامہ اقبال کا نام بہت نمایاں ہے۔

## ۱

شاعر، طرح طرح کے خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے مگر وہ ذاتی آسودگی کے خواب نہ تھے۔ ان کا دل، بہت سے دوسرے مصلحین کی طرح، اُمت کی بیداری اور نشاتِ ثانیہ کے لیے دھڑکتا تھا اور ان کی آنکھیں اسلام کی سر بلندی کے لیے بے خواب رہتی تھیں۔ ان کی شاعری اور ان کی نثر، خطبات اور تقریریں اور ان کے ملفوظات اور گفتگوئیں ان کے درد و سوز اور بے تاب تمنائوں سے عبارت ہیں اور ان کا مقصد اسلامی نشاتِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر و تکمیل ہے۔

علامہ اقبال نے شعور کی آنکھ کھولی تو پورا عالمِ اسلام نہایت پیچیدہ مسائل کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ مغربی استعمار فکری اور سیاسی، دونوں اعتبار سے اس پر حاوی ہو چکا تھا۔ غلامی کے نتیجے میں مسلم معاشرہ جمود، تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھا۔ زوال پذیری کے ردِ عمل میں جو آوازیں بلند ہوئیں، اُن میں سب سے توانا اور بلند آہنگ آواز علامہ اقبال کی تھی جنہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑنے کی تلقین کی۔

تجدید و احیاء دین کی تمنا بالکل ابتدائی زمانے ہی سے اُن کے ہاں موجود تھی اور یہ کبھی سرد نہیں ہوئی، بلکہ عمر کے ساتھ اس جذبے کی حرارت و شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے لیے اقبال کی مختلف النوع کاوشیں، ان کی طویل زندگی میں مختلف شکلوں میں اور کئی سطحوں

پرسا منے آتی رہیں۔ ان کی اُردو فارسی شاعری، ان کی تمام نثری تحریریں، ان کا پورا نظام فکر و فلسفہ، اُن کے جملہ تصوّرات و نظریات (مثلاً: خودی، بے خودی، فقر، عشق، مردِ مومن، عقل وغیرہ) نشاتِ ثانیہ کے لیے اُن کی مساعی کا اہم حوالہ ہیں۔

اسلام کی سر بلندی کے لیے اُن کے بے تاب جذبوں اور مضطرب تمنائوں کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انھیں اسلام کی حقیقت کے ساتھ، اسلام کے روشن مستقبل پر بھی کامل یقین تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں، عالمِ اسلام ایک مایوس کن منظر پیش کر رہا تھا۔ ایسے میں اقبال کی طرف سے غلبہٴ اسلام کی یہ نوید:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمتِ رات کی سیماب پا ہو جائے گی  
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی  
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ تجود پھر جبیں، خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی  
شبِ گریزاں ہوگی آخر جلوہٴ خورشید سے  
یہ چمن معمور ہوگا نعمتِ توحید سے<sup>۱</sup>

دیوانے کا ایک خواب معلوم ہوتی تھی یا محض ایک شاعرانہ تعلیٰ --- مگر اقبال کو ایک عالم گیر اسلامی انقلاب پر کامل یقین تھا، جس کا واشگاف اظہار انھوں نے نثر میں بھی کئی جگہ کیا ہے، مثلاً:

اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہتوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کر دے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔<sup>۲</sup>  
ایک اور موقع پر فرمایا:

اس وقت جو قومیں دنیا میں کارفرما ہیں، اُن میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ مُكْلَبَهُ کے دعوے پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی۔<sup>۳</sup>

اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے علامہ اقبال کے مجموعی کام کو تین دائروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- فرد کی تعمیر سیرت

۲- فکری اور علمی کاوشیں

۳- پاکستان کا تصور اور اس کے لیے عملی جدوجہد

علامہ اقبال نے تاریخِ عالم کے مطالعے سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک فرد اپنے اخلاق و اطوار اور سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، معاشرے میں کسی بڑے انقلاب کی توقع عبث ہے۔ اقبال کے الفاظ میں: ”دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں“۔<sup>۴</sup> شذرات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

Character is the invisible force which determines the destinations of the nations.<sup>۵</sup>

مسلمان مجموعی اعتبار سے اخلاقی انحطاط کا شکار تھے۔ انھیں اس پستی سے نکالنے کے لیے اقبال کے نزدیک ان کی اخلاقی تربیت اشد ضروری تھی۔ ان کے ہاں خودی کی پرورش و تربیت، نشوونما اور استحکام کی تلقین، اسی اخلاقی تربیت کا ایک پہلو ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اخلاقی تربیت کے لیے: ”مذہب بے حد ضروری چیز ہے“۔<sup>۶</sup> اور مذہب کی مضبوط گرفت ہمیں بھٹکنے اور گمراہ ہونے سے بچاتی ہے۔ اگر یہ گرفت ڈھیلی پڑی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ شاید ہمارا انجام وہی ہو جو یہودیوں کا ہوا۔<sup>۷</sup> زندگی میں مذہب کی اسی اہمیت اور معنویت کی بنا پر گوئے کے اس قول: Art still has truth, take refuge there میں تصرف (Art) کی جگہ (Religion) کے بعد وہ اس بات کے قائل تھے کہ مذہب ہی بھٹکتے ہوئے انسان کی دستگیری اور راہنمائی کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک انسانی کردار کی تعمیر میں بھی قرآن حکیم اساسی حیثیت رکھتا ہے:۔

قرآن میں ہونو طہ زن اے مردِ مسلمان

اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار ۱۵

ایک بار چند نوجوانوں کو مخاطب ہو کر کہا: ”یاد رکھو مسلمانوں کے لیے جاے پناہ صرف قرآن کریم ہے۔۔۔ میں اس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں جس گھر سے علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے“۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کی کہ: ”قرآن مجید کا صرف مطالعہ ہی نہ کیا کرو بلکہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو“۔ قرآنی تعلیمات کے حوالے سے اقبال نے افرادِ اُمت کو ارکانِ خمسہ کی پابندی ۱۶ اور فرائض کے ساتھ نوافل، شب بیداری، اور تہجد کے اہتمام کو مستحسن قرار دیا ۱۷ کہ یہ اہتمام مسلمان کے اندر اخلاقِ حسنہ کا موجب بنتا ہے۔

علامہ اقبال، قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو بھی پیش نظر رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اسوۂ حسنہ میں اعلاے کلمۃ الحق کو ایک نمایاں اور روشن باب کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک ایک حقیقی مسلمان کلمۂ حق کا اعلان و اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا، مگر سچائی کا اظہار خود اعتمادی کی بنا پر ہی ممکن ہے۔ اقبال کے فلسفہ خودی کا پس منظر یہی ہے۔

اقبال کے فلسفہ خودی کی تشکیل و تعمیر میں عشق اور فقر کو اہم لوازم یا عناصر کی حیثیت حاصل ہے۔ جذبہ عشق میں ایک غیر معمولی قوت پنہاں ہے اور فقر کی لازوال دولت بھی عشق سے کم اہم نہیں۔ اگر کسی قوم کو یہ دونوں قوتیں حاصل ہو جائیں، دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی:۔

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم

عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور ۱۸

اقبال، احیاء اسلام کے لیے جس انقلاب کے داعی ہیں، اُسے برپا کرنے کے لیے خودی، فقر اور عشق سے متصف ہونا ضروری ہے۔ فرد کے اندر یہ صفات پیدا ہو جائیں تو

وہ ”مردِ مؤمن“ کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور اس جدوجہد میں مردِ مؤمن کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ ضعفِ اسلام کا بہت بڑا سبب اُمت کے اندر فروعی مسائل پر شدید اختلافات، اور اس بنیاد پر باہمی دشمنیاں اور مجموعی طور پر انتشار و افتراق کی افسوس ناک صورت حال رہی ہے جس کا ایک اہم سبب علمائے سو اور نام نہاد صوفیہ کا غلط رویہ تھا۔ علامہ اقبال، غیر اسلامی اور عجمی تصوف کو خاص طور پر خرابی احوال کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں عجمی تصوف جزو اسلام نہیں۔ یہ ایک قسم کی رہبانیت ہے جس سے اسلام کو قطعی تعلق نہیں اور جس کے اثر سے اسلامی اقوام میں سے قوتِ عمل مفقود ہو گئی ہے۔<sup>۱۴</sup> ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں کہ عجمی تصوف، لٹریچر میں دل فریبی اور حسن و چمک پیدا کرتا ہے مگر یہ دلوں میں قوت پیدا کرنے کے بجائے، طبائع کو پست کرنے والا ہے۔<sup>۱۵</sup>

علمائے سو کے متعلق وہ بہت شدید جذبات رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے علمائے سو کو تصوف کی موجودہ منح شدہ شکل کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ان کی تنقید کا مقصد فقط یہ تھا کہ اہل تصوف اپنے اصل مقام و مرتبے کا ادراک کریں اور آں حضور کے فرمان: **الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ** کے مصداق، اپنے اندر انبیاءِ کرام کے سے اوصافِ حسنہ پیدا کریں۔ ان کی تلقین ہے کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؑ

کہ رسمِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری<sup>۱۶</sup>

اقبال کے نزدیک سکون و جمود کو ترک کر کے تحرک و عمل اور رسمِ شبیریؑ ادا کیے بغیر،

تجدیدِ اُمت اور نشاۃ ثانیہ کا کوئی خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

دوسرا طبقہ جس سے اقبال بطور خاص مخاطب ہوئے، نوجوانوں کا طبقہ تھا۔ اقبال کی

نظر میں احیاءِ اسلام کی تحریک میں کامیابی کا انحصار بڑی حد تک نوجوان طبقے پر ہے۔ خود

آں حضور کی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں اولیت کا شرف بھی نوجوان طبقے ہی کو حاصل

ہوا۔ اقبال مسلم نوجوانوں کو تن آسانی اور عیش پسندی کے بجائے جھانسی اور سخت کوشی کی تلقین کرتے ہیں:۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند کلا

نوجوانانِ اُمت کے لیے اقبال کے اضطراب اور دردمندی کا اظہار، جس والہانہ خلوص کے ساتھ دو آخِر کے کلام میں ہوا ہے (مثلاً: ”ساقی نامہ“ کا آخری حصہ، بالِ جبریل) وہ ان کے بے تاب جذبوں کی سچی تصویر ہے۔

اس طرح احیاءِ اسلام کے سلسلے میں اولین سطح پر اقبال نے فرد کی انفرادی اصلاح اور اس کی تعمیر سیرت پر زور دیا اور پھر معاشرے کے دو اہم طبقوں، یعنی علمائے مذہب و صوفیہ اور نوجوانوں کو متوجہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر اسلامی نشاتِ ثانیہ کی تحریک میں اپنا مثبت اور مؤثر کردار ادا کریں۔

### ۳

مسلمان انگریزوں کی سیاسی غلامی کے ساتھ، ذہنی اور فکری اعتبار سے بھی مغرب سے مغلوب ہو چکے تھے۔ اس مغلوبیت کی تین صورتیں تھیں: اول: نیشنلزم کا سراب۔ دوم: دین و دنیا کی دوئی۔ سوم: مغربی تہذیب سے ایک مجموعی مرعوبیت۔ علامہ اقبال نے ان تینوں تصورات و رجحانات پر شدید تنقید کی بلکہ ایک اعتبار سے ان پر ایک کاری ضرب لگائی۔

اپنے فکری سفر کے آغاز میں اقبال خود بھی قوم پرست تھے۔ ایک بار اعتراف کیا کہ:

In my college days, I was a zealous nationalist ۱۸

مگر یورپ کو قریب سے دیکھنے پر انھیں نیشنلزم کے مفاسد و نقصانات کا احساس ہوا۔ وہ بتاتے ہیں کہ قیامِ یورپ نے ان کے خیالات کو انقلابِ عظیم سے دوچار کیا۔ اقبال کے الفاظ ہیں: ’یورپ کی آب و ہوا

نے مجھے مسلمان کر دیا،<sup>۱۹</sup> وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر قوم پرستی کے 'فرنگی نظریہ' و وطنیت کی اشاعت کا مقصد اسلام کی وحدتِ دینی پارہ پارہ کرنا ہے۔<sup>۲۰</sup> اسی بنا پر عرب قوم پرستی کا فتنہ پروان چڑھا اور سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ چنانچہ علامہ نے مغربی تصورِ قومیت کو ایک 'روحانی بیماری' قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف عمر بھر جہاد کیا۔ ان کے نزدیک انسانی اشتراک کا سب سے قوی رابطہ اور ان کے درمیان سب سے زیادہ مضبوط رشتہ کلمہ 'توحید' کا ہے۔ اسی بنیاد پر انھوں نے تصورِ ملت کی بازیافت کی: ۷

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر  
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ<sup>۲۱</sup>

اسی تصورِ ملت نے آگے چل کر علامہ کے ہاں تصورِ اتحادِ عالمِ اسلامی کی شکل اختیار کی (ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے)۔

مسلمانوں کے فکری و ذہنی انحطاط کا دوسرا نمایاں پہلو ان کا محدود تصورِ دین تھا۔ شہنشاہیت نے اہل مذہب کو مساجد تک محدود کر دیا اور سیاست کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ دین و سیاست میں بُعد پیدا ہو گیا۔ مگر اقبال کے نزدیک: 'از روئے شریعتِ محمدیہ مذہب و سیاست میں کوئی تفریق و تمیز نہیں'۔<sup>۲۲</sup> انھوں نے دین و سیاست کی علاحدگی پر سخت تنقید کی کیونکہ اس کا نتیجہ ہمیشہ خون ریزی و چٹنگیزی اور عالم گیر تباہی کی شکل میں نکلتا ہے۔<sup>۲۳</sup> درحقیقت نشاتِ ثانیہ کی تحریک میں کسی طرح کی پیش رفت اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھی کہ دین و سیاست میں دوئی کی نفی کر کے، دین کا حقیقی اور (سیاست، تمدن، معیشت، تعلیم، عمرانیات، قانون، غرض زندگی کے تمام شعبوں پر محیط) ایک جامع تر تصور نہ پیش کیا جاتا۔

تجدید و احیاء دین کی راہ میں تیسری بڑی رکاوٹ مغرب کی ذہنی غلامی اور وہاں کی تہذیب سے مرعوبیت تھی۔ علامہ اقبال مغرب اور مغربیت کا بذاتِ خود مشاہدہ کر چکے تھے اس لیے انھوں نے نہایت واضح و اشکاف الفاظ میں اس کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا: ۷

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے      حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات<sup>۲۴</sup>



نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے<sup>۲۵</sup>

اس شعر میں 'صناعی'، 'جھوٹے نگوں' اور 'ریزہ کاری' جیسے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ شاید تہذیبِ مغرب کے تصنع، بناوٹ اور کھوکھلے پن کا اس سے بہتر تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

خیال رہے کہ اقبال، یورپ کی تمدنی و سائنسی ترقی کے معترف تھے اور اس سے اکتساب و استفادے کے قائل ہی نہ تھے، ملت کی حیاتِ نو کے لیے اُسے ضروری بھی سمجھتے تھے مگر مجموعی حیثیت سے یہ بے خدا تہذیبِ اقبال کی نظر میں 'فسادِ قلب و نظر' کا نمونہ تھی۔

خطبات میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ آج یورپ سے بڑھ کر، انسان کے اخلاقی ارتقا میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

Europe today is the greatest hinderance in the way of man's ethical advancement.<sup>۲۶</sup>

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ فکرِ مغرب کے جو ثمرات، سوشلزم اور نام نہاد جمہوریت اور سرمایہ داری کی شکل میں، دنیا کے سامنے رونما ہوئے تھے، اقبال نے ان سب کو باطل اور بہر طور ناقابلِ قبول ٹھہرایا تھا۔ مغربی جمہوریت کو، جس کی بنیاد مادر پدر آزادی ہے، انھوں نے رد کر دیا:۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صدر فکرِ انسانے نمی آید کلا<sup>۲۷</sup>

خیال رہے کہ سوشلزم اور اشتراکیت کے بارے میں اُن کے خیالات میں ایک ارتقا ملتا ہے۔ پہلے پہل انھوں نے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کو سراہا کیونکہ وہ مظلوموں کا حامی بن کر سامنے آیا تھا مگر بہت جلد اس کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ چنانچہ اقبال نے اس سے براءت کا اعلان کرتے ہوئے تاریخ کی مادی تعبیر کو سراسر غلط قرار دیا۔<sup>۲۸</sup>

علامہ اقبال کا یکم جنوری ۱۹۳۸ء کا ریڈیائی پیغام، مغربی فکر اور سیاست پر ایک جامع تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ فی الحقیقت انھوں نے جس طرح مغربی تہذیب اور فکر و فلسفے پر تنقید کی، ہماری فکری تاریخ میں ان سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی اس جرأت مندانہ تنقید کے نتیجے میں تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مغرب

سے مرعوبیت ختم ہونے لگی اور تجدید و احیا اور نشاتِ ثانیہ کے لیے فضا اور سازگار ہو گئی۔

علامہ اقبال کو اس امر کا بھی شدید احساس تھا کہ ہمارے علمائے مذہب، اجتہاد کی اہمیت سے غافل ہو چکے ہیں۔ فکری سطح پر علامہ اقبال کی ایک مثبت عطا یہ بھی ہے کہ انھوں نے عصرِ حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کے انگریزی خطبات میں چھٹا خطبہ 'اجتہاد دینی الاسلام' کے موضوع پر ہے۔ اس سلسلے میں ایک بار فرمایا:

آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سیکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو، جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔<sup>۲۹</sup>

اجتہاد پر یہ زور مسلم علما کے اندر صدیوں کے فقہی جمود کے خلاف ایک ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ردِ عمل کا ایک مثبت پہلو، اقبال کا یہ احساس ہے کہ عصرِ حاضر کی مقتضیات و مسائل کی روشنی میں اسلامی فقہ کی از سر نو ترتیب و تشکیل کی ضرورت ہے۔ اقبال خود بھی اس طرح کا کام کرنا چاہتے تھے۔<sup>۳۰</sup> لیکن پھر یہ نازک ذمہ داری کسی روشن دماغ عالم کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ غالباً اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے مختلف اوقات میں مولانا شبلی نعمانی، سید انور شاہ کاشمیری اور سید سلیمان ندوی کو پنجاب منتقل ہونے کی دعوت دی مگر کامیابی نہ ہوئی۔<sup>۳۱</sup>

چودھری نیاز علی خاں نے علامہ اقبال کے مشورے سے جمال پور (نزد پٹھان کوٹ) میں ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں علامہ اقبال کا خواب یہ تھا کہ:

○ 'علوم جدید کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین' یہاں جمع ہوں گے۔

○ اپنی 'زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف' کر دیں گے۔

○ یہاں ایک 'عظیم الشان لائبریری قائم' کی جائے گی۔

○ 'قرآن حکیم میں مہارت تامہ رکھنے والے کسی 'معلم صالح و کامل' کی رہنمائی

میں ’وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں گے‘۔

پٹھان کوٹ کا ادارہ دارالاسلام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

علامہ اقبال ہی کے ایما اور مشورے پر سید ابوالاعلیٰ مودودی، ۱۹۳۸ء کے اوائل میں حیدرآباد، دکن سے ہجرت کر کے جمال پور آ گئے تھے۔ علامہ کا ارادہ تھا کہ وہ بھی ہر سال، چند ماہ کے لیے وہاں آ کر قیام کیا کریں گے مگر افسوس کہ وہ جلد ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ادارے نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں جنہوں نے آگے چل کر تجدید و احیاءِ دین کے لیے ایک عملی تحریک کی صورت اختیار کی۔ ۳۳

## ۴

ہندستان میں ایک علاحدہ اسلامی ریاست (جسے بعد میں پاکستان کا نام دیا گیا) کا تصور اور اس کے حصول و قیام کے لیے عملی کوششیں، اقبال کی مساعی میں آخری سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے مغرب کے نظریہ قوم پرستی کو رد کر کے اسلام کے تصورِ مملّت کو اجاگر کیا۔ ہندستانی سیاست سے ان کی دل چسپی اسی حوالے سے تھی۔ اس سلسلے میں ان کی خواہش تھی کہ، اول: ہندستان آزاد ہو۔ دوم: یہاں اسلامی حکومت قائم ہو۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ فقط آزادی اقبال کا مقصود نہ تھا، ان کی منزل مقصود اسلام اور اُمت کی نشاتِ ثانیہ تھی۔ حیاتِ مستعار کے بالکل آخری زمانے میں، وفات سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے، مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ وطنیت کے جواب میں، علامہ اقبال نے ایک تاریخی بیان جاری کیا، اس کے آخر میں وہ کہتے ہیں:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائیں۔ اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے

قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان، ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔<sup>۳۴</sup>

ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کی حیثیت سے، اسلام ہمیشہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ و رائج کیا جائے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور ان اَقِمْوا الدِّینَ کا مفہوم بھی یہی ہے مگر سیاست و قوت کے بغیر اقامت دین ممکن نہیں۔ اقبال کا یہ معروف شعر: ے

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصانہ ہو تو کلیسیا ہے کارِ بے بنیاد<sup>۳۵</sup>  
اسی نکتے کی شعری تفسیر ہے۔ اقبال کے خیال میں باطل کی بیخ کنی بھی قوت ہی سے ممکن ہے ے

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحرِ قدیم گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم<sup>۳۶</sup>  
یہاں علامہ کا یہ نکتہ لائق توجہ ہے: ”مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے [لیکن] بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہے۔ اگر مسلمان امر و نہی کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے بازوؤں میں طاقت ہونا ضروری ہے“۔<sup>۳۷</sup>

برطانوی سامراج کی غلامی میں فوری طور پر قوت و طاقت اور اقتدار کا حصول آسان نہ تھا۔ اقبال نے مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور کی بیداری پر پوری توجہ مرکوز کی۔ آزادی ہند سے متعلق کوئی معاملہ ہو یا مسلمانوں کا کوئی ملٹی مسئلہ، وہ برابر کوشاں رہے کہ مسلمان مستقبل کے منظر نامے میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ سیاسی سطح پر انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی علاحدہ قومیت پر زور دیا اور مخلوط انتخاب کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کے ملٹی شخص کی خاطر

جداگانہ اصولِ انتخاب پر اقبال کا اصرار، آگے چل کر ایک علاحدہ مسلم مملکت کے تصور کی شکل میں سامنے آیا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز کے رخصت ہونے کے بعد، اصولِ جمہوریت کے تحت ہندستان کا اقتدار ہندوؤں کو منتقل ہو جائے گا اور اکھنڈ بھارت میں مسلمانوں کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔ اس لیے انھوں نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کا تصور پیش کیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: خطبہ الہ آباد)

جس موقع پر اقبال نے ایک ’منظم اسلامی ریاست‘ کا تصور پیش کیا، مسلمان شدید انتشار اور مایوسی کا شکار تھے۔ محمد علی جناح ہندستانی سیاست سے بددل ہو کر لندن جا بسے تھے اور بقول سید نور احمد: ’مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت‘ ’مسلم لیگ‘ کا پلیٹ فارم طفلانہ حرکتوں کا میدان بن گیا تھا‘۔<sup>۳۸</sup> اس مایوس کن صورت میں اقبال کی پیش کردہ اسلامی ریاست کی تجویز، ہندی مسلمانوں کے لیے ایک بڑا سہارا ثابت ہوئی۔

مسلمانوں کے مسائل سے ان کی دل چسپی اور ان کے مستقبل کے بارے میں ان کی فکر مندی، قائد اعظم کے نام ان کے خطوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً ۳۰ مارچ اور ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خطوط سے اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے اقبال کے ولولوں، اُمتوں اور مضطرب جذبوں کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں، وہ مستقبل کی اسلامی ریاست میں اسلامی قانون اور شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔<sup>۳۹</sup>

علامہ اقبال تو ۲۱/۱۲/۱۹۳۸ء کو اپنے رب سے جا ملے مگر ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے سات سال بعد، ۱۴/۱۲/۱۹۴۷ء کو پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کی حیثیت سے، کرۂ ارض پر نمودار ہوا۔ بلاشبہ پاکستان کا قیام اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے اُمتِ مسلمہ کی ہزار سالہ جدوجہد میں ایک اہم پیش رفت کی حیثیت رکھتا ہے مگر علامہ اقبال کے خوابوں کی حقیقی تعبیر اُس وقت سامنے آئے گی جب پاکستان میں اسلامی قانون اور شریعتِ محمدیہ کا مکمل اور نتیجہ خیز نفاذ ہوگا اور پاکستان، دنیا میں اسلامی نشاتِ ثانیہ اور اُمت کی سر بلندی کی علامت بن جائے گا۔

نشأتِ ثانیہ کے لیے علامہ اقبال کی اس جدوجہد میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے لیے ان کے انتہائی خلوص، دردمندی اور دل سوزی کے جذبات بہت نمایاں ہیں۔ اُن کا یہ شعر اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں  
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

اس سوز و ساز اور پیچ و تاب کا اظہار نثر میں بھی ہوتا ہے۔ منشی محمد صالح صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ: ”اسلام پر ایک بہت بڑا نازک وقت ہندستان میں آ رہا ہے۔ سیاسی حقوق و ملی تمدن کا تحفظ تو ایک طرف، خود اسلام کی ہستی معرضِ خطر میں ہے۔“ اے انھی کے نام ایک اور خط میں مسلمانوں، اسلام اور آئندہ نسلوں کے مستقبل کے بارے میں اپنی تشویش اور اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے، علامہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہ کیا تو ہم سب لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

اسی طرح متعدد دیگر احباب کے نام خطوں، تقریروں اور بیانات میں بھی ایسی ہی فکر مندی کی جھلک نظر آتی ہے، اور جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہوا، بطور خاص قائد اعظم کے نام خطوں میں، وہ بار بار اسلام، ہندستانی مسلمانوں اور تہذیبِ اسلامی کے مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ چودھری نیاز علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ”اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے، جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔“

پھر اپنی ساری مساعی میں ذاتِ باری تعالیٰ سے رسولؐ کریم کا تعلق اور بے پایاں شغف، اقبال کے لیے سب سے بڑا منبعِ فیضان (source of inspiration) رہا۔ آں حضورؐ کی ذات اور آپؐ کا اسوہ حسنہ کارزارِ حیات میں اقبال کے لیے روحانی تائید کا بہت بڑا

ذریعہ ہے۔ ایک صاحب نے علامہ سے ذکر کیا کہ انھوں نے خواب میں حضور رسالت مآب کو جلابی رنگ میں یا سپاہیانہ لباس میں دیکھا ہے۔ اس پر علامہ نے انھیں لکھا: 'میرے خیال میں یہ علامت احیاء اسلام کی ہے'۔ ۱۹۳۲ء کو علامہ نے ایک بار پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام ایک خط میں لکھا: 'اسلام کی عظمت کا زمانہ ان شاء اللہ قریب آ رہا ہے'۔ ۱۶

تجدید و احیاء دین کے لیے اقبال کی اس ساری تگ و دو اور جدوجہد کا مقصد بھی سنتِ رسولؐ کی پیروی ہے۔ اقبال کے نزدیک، ایک مسلمان کی جملہ مساعی کا محور یہی ہونا چاہیے۔

بمصطفیٰ برسوں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی است ۱۷

۳۰ جولائی ۱۹۳۲ء کو علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا: 'اس وقت مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت، خدا تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے، اسے اسلام کی خدمت، اور اقوام و ملل اسلامیہ کے احیاء و بیداری میں صرف کرے۔۔۔'، ۱۸ اپنے اس قول کے مصداق، خود علامہ نے اپنی بے مثل شاعری اور اپنے توانا فکر کی پوری قوتِ اُمتِ اسلامیہ کی نشاتِ ثانیہ کے لیے استعمال کی۔

بایں ہمہ علامہ کی عمر بھر کی جدوجہد و کاوش کی تکمیل ہونا باقی ہے۔ شاید وہ ہمارے لیے ہی کہہ گئے ہیں:

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے ۱۹

## حوالے اور حواشی

- ۱- بانگِ درا، ص ۱۹۵۔
- ۲- گفتارِ اقبال، ص ۱۷۸۔
- ۳- ایضاً، ص ۱۹۔
- ۴- مقالاتِ اقبال، ص ۵۳۔
- ۵- *Stray Reflections*، ص ۷۹۔
- ۶- گفتارِ اقبال، ص ۲۵۵۔
- ۷- *Stray Reflections I*، ص ۲۹۔
- ۸- ضربِ کلیم، ص ۱۳۶۔
- ۹- گفتارِ اقبال، ص ۲۱۳۔
- ۱۰- ایضاً
- ۱۱- ملفوظات [اقبال]، مرتب: محمود نظامی۔ امرت الیکٹریک پریس لاہور، س ن۔ [طبعِ اول] ص ۳۹۔
- ۱۲- اقبال نامہ، دوم، ص ۱۹۳۔
- ۱۳- ضربِ کلیم، ص ۵۲۔
- ۱۴- مقالاتِ اقبال، ص ۱۷۷۔
- ۱۵- اقبال نامہ، دوم، ص ۵۵۔
- ۱۶- ارمغانِ حجاز، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۳۸/۶۸۰۔
- ۱۷- بالِ جبریل، ص ۴۴۶۔
- ۱۸- *Letters & Writings of Iqbal*، ص ۵۸، ۵۹۔
- ۱۹- انوارِ اقبال، ص ۱۷۶۔
- ۲۰- حرفِ اقبال، ص ۲۲۲۔
- ۲۱- بانگِ درا، ص ۲۴۸۔
- ۲۲- مقالاتِ اقبال، ص ۹۲۔



۲۳- مولانا مودودی، اس تصوّر [دین اور سیاست کی علاحدگی] کی نفی اور مہمّت کو، اقبال کا 'ایک بڑا کارنامہ' قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیاست بے دین کے متعلق اقبال کا یہ مصرع:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ایسا ہے کہ اس موضوع پر تمام دنیا کا لٹریچر ایک طرف اور یہ مصرع ایک طرف --- اقبال نے اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابوں کا خلاصہ اور عطر نکال کر رکھ دیا ہے (اقبال اور مودودی، مرتب: ابوراشد فاروقی۔ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۶-۲۷)

۲۴- بالِ جبریل، ص ۱۰۷-

۲۵- بانگِ درا، ص ۱۷۲

۲۶- Reconstruction II ص ۱۴۲-

۲۷- پیام مشرق، ص ۱۳۵-

۲۸- اقبال نامہ، اوّل، ص ۳۱۹-

۲۹- حیاتِ انور: محمد ازہر شاہ قیصر۔ دیوبند، ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۵-

۳۰- اقبال نامہ، اوّل، ص ۳۲۰-

۳۱- اقبال نامہ، اوّل، ص ۲۷۶-۲۷۵-

۳۲- ایضاً، ص ۲۵۱-۲۵۲۔ نیز دیکھیے، ذکو اقبال: عبدالمجید سالک۔ بزمِ اقبال لاہور، ص ۲۱۲-۲۱۳۔ اور: خطوط مودودی، دوم، مرتبین: رفیع الدین ہاشمی + سلیم منصور خالد)۔ منشورات، لاہور ۱۹۹۵ء میں شامل خطوط بنام چودھری نیاز علی خاں اور نذیر نیازی۔

۳۳- علامہ اقبال سید مودودی کے رسالے ترجمان القرآن کے قاری تھے، مگر ان سے رابطہ، چودھری نیاز علی خاں کے ذریعے قائم ہوا، اور سید صاحب، علامہ کی دعوت پر جمال پور، پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ اس موضوع کی تفصیل اقبال اور مودودی (مرتب: ابوراشد فاروقی) نیز: خطوط مودودی، دوم (محولہ بالا) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۳۴- مقالاتِ اقبال، ص ۲۳۷-۲۳۸۔ یہاں اس حیرت انگیز توارد کی نشان دہی، دل چسپی کا باعث ہوگی کہ علامہ نے متذکرہ بالا بیان میں جو بات کہی ہے، اس سے پہلے وہی بات سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے ایک مضمون میں لکھ چکے تھے۔ علامہ کا بیان مارچ ۱۹۳۸ء میں روزنامہ احسان میں شائع ہوا۔ (بحوالہ: Speeches، ص ۳۰۰) دس گیارہ ماہ پہلے سید مودودی یہی بات ان الفاظ میں کہہ چکے تھے:

”یہ ملک کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا

دارالکفر ہے، ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مدابنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیا صرف کرنا، لٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام اور قطعی حرام ہے۔“ (ترجمان القرآن، حیدرآباد دکن، ربیع الاول ۱۳۵۶ھ، [مئی ۱۹۳۷ء]، جلد ۱۰، عدد ۳، ص ۱۶۹-۱۷۰)۔

میاں محمد شفیع (مش) کی روایت ہے کہ علامہ اقبال، آخری زمانے میں سید مودودی کا رسالہ ترجمان القرآن پڑھوا کر سنتے تھے۔ قیاس ہے کہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے سید مودودی کے اشارات (اداریہ: ترجمان القرآن محولہ بالا) سماعت کیے ہوں گے اور ایک نکتہ ان کے ذہن میں محفوظ رہا، دس گیارہ ماہ بعد اس کا اظہار متذکرہ بیان میں ہوا۔

۳۵- بالِ جبیریل، ص ۷۰۔

۳۶- ایضاً، ص ۶۰۔

۳۷- نقوش، لاہور، اقبال نمبر، اول، ۱۹۷۷ء، ص ۴۰۷۔

۳۸- مارشل لا سے مارشل لا تک: سید نور احمد۔ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۱۔

۳۹- Letters of Iqbal، ص ۲۵۴۔

۴۰- بالِ جبیریل، ص ۱۷۔

۴۱- اقبال نامہ، دوم، ص ۳۸۴۔

۴۲- ایضاً، ص ۳۸۸۔

۴۳- Letters of Iqbal، ص ۲۴۹۔

۴۴- اقبال نامہ، اول، ص ۲۴۸۔

۴۵- انوارِ اقبال، ص ۲۱۶۔

۴۶- اقبال نامہ، دوم، ص ۱۶۶۔

۴۷- ارمغانِ حجاز، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۴۹/۶۹۱۔

۴۸- انوارِ اقبال، ص ۱۹۲۔

۴۹- بانگِ درا، ص ۲۰۶۔

(ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، اپریل ۲۰۰۳ء۔ تجدید نظر: دسمبر ۲۰۰۳ء)

## تاریخِ ہند: چند تصریحات

۱

علامہ اقبال سے منسوب تاریخِ ہند کے بارے میں سب سے پہلی اطلاع ہمیں روزگارِ فقیر، دوم (نومبر ۱۹۶۴ء) میں، ان الفاظ میں ملتی ہے:

اُردو زبان میں تاریخ کی یہ کتاب ۱۳-۱۹۱۳ء میں ڈل کی جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کتاب کا خلاصہ امرتسر کے ایک پبلشر نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا تھا، وہ محفوظ ہے۔ اصل کتاب نایاب ہے۔<sup>۱</sup>

حاشیے میں بتایا گیا ہے کہ خلاصہ، جناب ممتاز حسن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

چند ماہ بعد، جنوری ۱۹۶۵ء میں، کے اے وحید (=خواجہ عبدالوحید) نے *A Bibliography of Iqbal* شائع کی۔ تاریخِ ہند کے بارے اس کے اندراج سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کتاب مذکور کی تحریر و تصنیف میں لالہ رام پرشاد، علامہ اقبال کے شریک مصنف تھے۔ مذکورہ اندراج حسب ذیل ہے:

*Tarikh-i-Hind* compiled in collaboration with Lala Ram Parshad. (A summary of this work published at Amritsar in 1914 as *Iqbal-i-Hind*, pp 162).<sup>۲</sup>

اس اطلاع میں:

(۱) تاریخِ ہند کو compilation، یعنی ترتیب و تدوین قرار دیا گیا ہے اور اس

کا اندراج بھی Works edited by Iqbal کے تحت کیا گیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ تاریخ ہند ایک طبع زاد تصنیف ہے۔

(۲) کتاب کے صفحات کی تعداد ۱۶۲ بتائی گئی ہے۔ معلوم نہیں اس کا ذریعہ کیا ہے؟ قیاس ہے کہ خواجہ عبدالوحید نے مذکورہ خلاصہ (اقبال ہند) جناب ممتاز حسن کے ہاں ہی دیکھا ہوگا، کیوں کہ کسی اور جگہ اس کی موجودگی کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔

کچھ عرصے کے بعد، فقیر سید وحید الدین کی مرتبہ البم *Iqbal in Pictures* (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں تاریخ ہند کے متذکرہ بالا خلاصہ (اقبال ہند) کا عکس شائع ہوا، جس کے ساتھ یہ عبارت درج ہے:

Iqbal wrote a school text-book on Indian History in 1913-14. The book is no longer available but a copy of a summary printed in 1914 is in the library of Mr. Mumtaz Hasan. <sup>۳</sup>

لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ آخر ۱۹۶۵ء سے اوائل ۱۹۶۷ء کے درمیان، کسی وقت تاریخ ہند کے ایک نئے کاسراغ مل گیا۔ غالباً یہ ممتاز حسن صاحب ہی کی ملکیت تھا اور اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر بشیر احمد ڈار نے انھی سے تاریخ ہند کے سرورق کا عکس حاصل کر کے پہلی بار اسے اپنی مرتبہ کتاب انوار اقبال میں شائع کیا (بالمقابل صفحہ ۲۴)۔ اس کے ساتھ ہی کتاب کا حسب ذیل مختصر تعارف بھی شامل ہے:

درسی کتابوں کے سلسلے میں ایک کتاب تاریخ ہند ہے جسے اقبال نے لالہ رام پرشاد، پروفیسر تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے مرتب کیا۔ یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں پہلی بار، راجہ صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلیشرز نے شائع کی۔ یہ کتاب لارڈ مینٹو پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا آخری فقرہ یوں ہے: ”یہ وائسرائے ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء کو بمبئی پہنچا“۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں۔

ہندستان کی گذشتہ اور موجودہ حالت (۳۶۶-۳۷۸)۔ ضمیمہ ۱: قدیم اور حال کی ملکی

تقسیم اور مشہور تاریخی مقامات (۳۷۹-۴۱۶)۔ ضمیمہ حصہ دوم: ہند کی حالت ۱۹۰۶ء میں  
 (۴۱۷-۴۴۱)۔ تبتہ اول: سنسکرت کا علم ادب (۴۴۱-۴۵۰)۔ تبتہ دوم: مسلمانوں کا علم  
 ادب (۴۵۱-۴۵۶)۔

ڈار صاحب نے انوارِ اقبال کے 'عرض حال' میں اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن  
 یہ اعتراف ضرور کیا ہے کہ انوارِ اقبال کی تیاری میں جناب ممتاز حسن کے 'نہایت پیش  
 بہا، نادر اور متنوع' ذخیرہ اقبالیات سے استفادہ کیا گیا، اس لیے قریب قریب یقین سے  
 کہا جاسکتا ہے کہ اس نادر کتاب کا یہ نسخہ جناب ممتاز حسن ہی نے کہیں سے حاصل کیا ہوگا  
 اور یہی انوارِ اقبال کا ماخذ ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ممتاز حسن، نیشنل بینک کراچی کے کتب  
 خانے کے لیے جگہ جگہ سے پیش بہا نادر خرید خرید کر جمع کرتے رہتے تھے۔  
 بہر حال، اس کے بعد سے تاریخ ہند کو اقبال کی تصانیف میں شمار کیا جانے لگا۔

## ۲

انوارِ اقبال کی اشاعت (مارچ ۱۹۶۷ء) سے پہلے ممتاز حسن کا تذکرہ بالانسخہ،  
 اقبال اکادمی کو منتقل ہو چکا تھا (یا اسی اشاعت کا کوئی اور نسخہ، اقبال اکادمی کو کہیں سے  
 دستیاب ہو گیا تھا)۔ اس پر اقبال اکادمی کی گول مہر لگا کر، نمبر شمار ۸۸۷ درج کیا گیا  
 (دیکھیے: عکس سرورق، مشمولہ: انوارِ اقبال، بالمقابل ص ۲۴)۔ تقریباً ساڑھے تین سال بعد  
 اسی سرورق پر، اکادمی کی ایک اور، نسبتاً بڑی مہر لگا کر، اس پر نمبر شمار ۶۳۰ لکھا گیا اور  
 ۱۶ اگست ۱۹۷۱ء کی مہر بھی ثبت کی گئی (دیکھیے سرورق: نسخہ اکادمی، مشمولہ مضمون ہذا)۔  
 واضح رہے کہ نسخہ اکادمی اور نسخہ ممتاز، درحقیقت ایک ہی کتاب کے مشتی ہیں۔

نسخہ اکادمی، اکادمی کے کتب خانے (پہلے کراچی، بعد ازاں لاہور) میں عرصہ  
 دراز تک موجود رہا، لیکن تعجب کی بات ہے کہ گیارہ برسوں میں کسی نے اس کتاب کے مشمولات  
 دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ راقم نے ۱۹۸۰ء میں مذکورہ نسخے کا عکس، اس وقت کے ڈائریکٹر

ڈاکٹر محمد معز الدین کی اجازت سے حاصل کیا اور جب اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں اسے دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ تاریخ ہند 'لالہ رام پرشاد کی تحریر کردہ ہے اور علامہ اقبال کا، بہ جوسرورق کے، کتاب کے مباحث و مندرجات سے کچھ علاقہ نہیں'۔<sup>۵</sup>

یہ نتیجہ اس بنا پر اخذ کیا گیا کہ کتاب مذکورہ میں بعض مسلم اکابر کا ذکر ایسے مخالفانہ بلکہ کہیں کہیں معاندانہ انداز میں کیا گیا ہے، جو ایک متعصب ہندو ذہن سے تو مطابقت رکھتا ہے مگر اقبال کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ان بیانات سے متفق ہوں گے۔ مثلاً:

مصنف نے اورنگ زیب عالم گیر کو: 'بڑا پاک صاف اور متقی و پرہیزگار اور بڑا پکا مسلمان' تسلیم کرنے کے ساتھ، یہ بھی کہا ہے کہ وہ راجپوتوں پر اور نیز اپنی ساری ہندو رعایا پر، مذہبی تعصب سے، بڑی سختی کرتا تھا؛ یہاں حاشیے میں لکھا ہے کہ:

اورنگ زیب نے اپنے مذہبی تعصب سے، جو جو سختیاں ہندوؤں پر کیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جزیہ، جس کو اکبر نے موقوف کر دیا تھا، پھر لگایا۔ یہ محصول مسلمانوں کے سوا سب پر لگایا جاتا اور فی کس وصول کیا جاتا تھا اور بعض پٹھان بادشاہوں نے اس ذریعے سے بڑے بڑے ظلم کیے تھے۔ غرض یہ محصول ہندوؤں کو سخت ناگوار تھا۔

مصنف نے شکوے کے انداز میں کہا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخوں میں اس [اورنگ زیب] کو بادشاہان مغلیہ میں سب سے عمدہ لکھا ہے۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ اکبر پر بھی اس کو ترجیح دی ہے۔<sup>۶</sup> پھر عالم گیر کا اکبر سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اصل یہ ہے کہ اورنگ زیب، عام لیاقت اور ہمت و چالاکی میں اکبر کے برابر، اور داگستری اور جھاکشی میں بھی اس کی مانند تھا، لیکن اور سب خصلتوں میں، بالکل اکبر کے خلاف تھا۔ مصلحتِ ملکی کے اعتبار سے دونوں بڑے کامل تھے، مگر اورنگ زیب حکمت و ریاضت سے اپنا مطلب نکالتا تھا اور ہمیشہ ٹیڑھی تدبیروں کو پسند کرتا تھا۔ اکبر بڑا عالی حوصلہ اور فراخ دل اور صلح کل تھا۔ سب کے ساتھ فیاضی کے ساتھ برتاؤ اور مغلوب دشمن پر خصوصاً رحم کیا کرتا تھا، مگر اورنگ زیب بڑا متعصب تھا۔ غیر مذہب کے لوگوں کو اذیت پہنچاتا۔ سب کی طرف سے بدظن رہتا۔ مغلوبوں پر

سختی کرتا اور بری [کذا] طرح بھی کچھ ہاتھ لگتا تو کبھی نہ چوکتا تھا۔ چونکہ اس کو کسی کا اعتبار نہ تھا، اس لیے نہ اس کے دل کو کبھی چین آرام ملا اور نہ کسی مہم میں بالکل کامیابی ہوئی۔<sup>۹</sup>  
 کیا منقولہ بالا تحریر، اس شخص کے قلم سے نکل سکتی ہے (یا وہ اس سے متفق ہو کر، اس پر اپنا نام دینے کا روادار ہو سکتا ہے) جو اورنگ زیب عالم گیر کو ’کارزار کفر و دیں‘ میں ’ترکیش مارا خدنگ‘ آخریں لے لے کہتا ہو؟..... علامہ نے تو عالم گیر پر ’مظالم، عدم برداشت، غداری اور سیاسی سازشوں، کا بہتان تراشنے والوں کو Interpreters of Indian History کے ترجمان، قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ عالم گیر، ایک مثالی مسلم کردار ہے اور ہمیں بچوں کی تعلیم و تربیت میں اس کردار کو نشوونما دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خطبہ علی گڑھ میں کہتے ہیں:

The charges brought against him are based on a mis-interpretation of contemporary facts and complete misunderstanding of the nature of social and political forces which were then working in the Muslim State. To me, the ideal of character, foreshadowed by Alamgir is essentially the Muslim type of character, and it must be the object of all our education to develop that type.<sup>۱۱</sup>

یہ خطبہ ۱۹۱۱ء کا ہے۔ تعجب ہے کہ ’ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب‘ نے دو سال بعد تاریخ ہند (۱۹۱۳ء) میں ہندوستانی تاریخ کے انہی Western interpreters (مغربی شارحین) کا منصب سنبھال لیا اور جس شخص کو وہ ایک مسلم کردار کا نمونہ قرار دے رہے تھے، اسے ظالم، فریبی، تنگ دل اور متعصب کہنے لگے۔

معلوم ہے کہ اقبال، ٹیپو سلطان سے خاص عقیدت<sup>۱۲</sup> رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ’ہندستان کا آخری مسلمان سپاہی‘<sup>۱۳</sup> اور ’شہیدانِ محبت کا امام‘<sup>۱۴</sup> تھا، جس نے:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زبیت

بھجو مرداں جاں سپردن زندگیت<sup>۱۵</sup>

کا مثالی پیکر بن کر اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی، مگر تاریخ ہند کے مصنف نے

(بالفاظ اقبال) 'یک دم شیریں بہ از صد سالِ میش' <sup>۱۷</sup> کے قائل ٹیپو کو کم ہمت اور بزدل بنا کر پیش کیا ہے۔ سلطان کی شکستوں سے بین السطور، لکھنے والے کی دلی مسرت ظاہر ہوتی ہے۔ مصنف بتاتا ہے کہ لارڈ ڈؤلرلی نے اپنے دو جرنیوں کو دو طرف سے میسور پر حملہ کرنے کے لیے متعین کیا تھا۔ ان:

دونوں... نے ٹیپو کی خوب خبر لی اور اس کو پے در پے شکست دی..... آخر دونوں..... بڑھتے بڑھتے میسور کے پایہ تخت سیرنگ پٹم پر جا پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

اب ٹیپو کے اوسان خطا ہوئے اور خوف و ہراس دل پر چھایا، چنانچہ کہیں تو وہ فال کھلواتا اور پنڈتوں نجومیوں سے پوچھتا تھا اور کہیں مسجدوں میں دعائیں منگواتا اور مندروں میں پوجا کرواتا تھا، اور وہ دن بھول گیا تھا کہ ہندوؤں کو کیسی کیسی تکلیفیں دی تھیں، اور ان کے مندروں کو مسمار کرایا تھا۔ آخر جب کسی طرح کام بنتا نظر نہ آیا تو صلح کا پیغام بھیجا، مگر جرنیل ہیرس نے جو شرطیں پیش کیں، ان کے منظور کرنے میں لیت و لعل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت سارے فنون سپاہ گری اور عہد و پیمان کے ڈھنگ بھول گیا تھا، بلکہ اس میں اوسط درجے کی عقل و دانش بھی باقی نہیں رہی تھی۔ <sup>۱۸</sup>

زیر بحث تاریخ ہند کا مصنف، اورنگ زیب کے علاوہ محمود غزنوی اور سراج الدولہ کے متعلق بھی واضح طور پر مخالفانہ جذبات رکھتا ہے، مثلاً: وہ لکھتا ہے کہ 'محمود کا ہند کی دولت پر تو دانت تھا ہی، مگر ساتھ ہی یہ بھی آرزو کہ بڑے بڑے بانکے راجپوتوں کو تلوار کے زور سے دین اسلام میں داخل کر لے، <sup>۱۸</sup> آگے چل کر ہندوستان پر محمود کے حملوں کے ضمن میں اس نے بتایا ہے کہ محمود نے متعدد تیرتھوں پر حملے کر کے، بہت سے مندروں کو لوٹا، ہندوؤں کو قیدی بنایا اور بے شمار دولت لے کر غزنی کی طرف مراجعت کی۔ <sup>۱۹</sup>

اسی طرح سراج الدولہ کو بڑا ظالم و عیاش <sup>۲۰</sup> قرار دیتے ہوئے، مصنف نے ہندوؤں پر اس کے 'مجنونانہ ظلم و تعدی' <sup>۲۱</sup> کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ 'اس نے اپنی ہندو رعایا پر نہایت سخت ظلم کیے، مثلاً: بڑے بڑے شریف خاندانوں کو اپنی اوباشی کے سبب بے حرمت کیا، دولت مندوں کو لوٹ لوٹ کر مفلس بنا دیا اور بے رحمیاں کر کے سب کو ہیبت



زده کر دیا،<sup>۲۲</sup> مزید برآں اس نے ڈھا کے کے ایک ’متمول‘ حاکم راج بلب کی دولت پر دندانِ طمع تیز کیے،<sup>۲۳</sup> آگے چل کر ’بلک ہول‘ کا قصہ، ایک حقیقتِ واقعہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔<sup>۲۴</sup>

ایک جگہ رسولِ اکرمؐ کا ذکر جس انداز و اسلوب میں کیا گیا، وہ علامہ اقبال کا اسلوب نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے لکھا ہے:

عرب میں ایک نیا مذہب پیدا ہوا۔ اس مذہب کے بانی حضرت محمدؐ صاحب ۵۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۰ برس کی عمر میں ایک نئے اور فاتح مذہب، یعنی اسلام کی اشاعت کی۔ ۶۳۲ء میں حضرت محمدؐ راجی ملک بقا ہوئے۔<sup>۲۵</sup>

علامہ اقبال آپؐ کا ذکر اس انداز میں سخت ناپسند کرتے تھے۔ غلام رسول مہرنے ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال کی صحبت اٹھائی۔ ان کا بیان ہے کہ اگر کوئی انگریزی زدہ نوجوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ”محمد صاحب“ کہہ کر کرتا تو آپؐ فوراً اسے ٹوک دیتے اور بڑی سختی سے سرزنش فرماتے۔<sup>۲۶</sup> پھر بعثتِ نبویؐ کا ذکر، جس انداز میں کیا گیا ہے (۴۰ برس کی عمر میں ایک نئے اور فاتح مذہب یعنی اسلام کی اشاعت کی) وہ کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو منصبِ نبوت پر آپؐ کے فائز ہونے کے منفرد اور عظیم الشان واقعے کی اہمیت سے ناواقف ہو، بلکہ نبوت کے شعور ہی سے بے بہرہ ہو۔

ان وجوہ سے یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مذکورہ کتاب علامہ اقبال کی تحریر نہیں ہے۔

لیکن اس پر علامہ کا نام کیسے درج ہے؟..... یہ ایک معما ہے، جسے ابھی تک حل نہیں کیا جاسکا۔ ممکن ہے علامہ نے ازراہ وضع داری، اپنا نام کتاب پر لکھنے کی اجازت دے دی ہو..... لیکن ایسا کرتے ہوئے، انھیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ کتاب کے مسودے پر ایک نظر ڈال لیں؟..... علامہ کے اولین سوانح نگاروں (محمد طاہر فاروقی، عبدالجید سالک) نے تاریخ ہند کا ذکر نہیں کیا۔ خود اقبال کے کسی خط، مضمون یا گفتگو میں اس طرح کی کسی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ علامہ اقبال کی مجالس میں حاضر باش کسی شخص نے بھی، کبھی ایسی کسی

کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، بشیر احمد ڈار اور ممتاز حسن جیسے جید اقبال شناسوں نے تاریخ ہند کو متعارف تو کرایا، مگر تعجب ہے کہ ان کی نظر کتاب کے محتویات پر نہیں گئی، اور انھی کی اطلاع پر اسے اقبال کی تصانیف میں شمار کیا جانے لگا، اور یہ بڑی غلطی اور غلط فہمی تھی۔ پہلی بار راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے (تصانیف اقبال... تحریر: ۱۹۸۰ء، اشاعت: ۱۹۸۲ء) میں تاریخ ہند کی اصلیت سے پردہ اٹھایا۔

### ۳

راقم الحروف کو تاریخ ہند کے کسی دوسرے نسخے کی تلاش بھی رہی۔ کئی سال بعد مالیر کونٹلہ کے ایک کرم فرما محمد کفایت اللہ صاحب تاریخ ہند کا ایک نسخہ (= نسخہ کفایت) لے کر آئے۔ محلے میں نے اس کا عکس بنوا لیا، اصل نسخہ وہ واپس لے گئے۔ جب دونوں نسخوں کا موازنہ کیا تو یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ دونوں نسخوں کا نام تاریخ ہند ہے، مصنفین کے نام بھی وہی ہیں اور سرورق بھی ہو بہو ویسا ہی ہے، دونوں کا دیباچہ بھی بالکل یکساں ہے، بلکہ دیباچے کے دونوں صفحے ایک ہی کتابت سے چھاپے گئے ہیں اور ان کے صفحات نمبر (الف، ب) بھی یکساں ہیں، لیکن دونوں کتابوں کا متن، ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے، یعنی ایک نام کی یہ دو مختلف کتابیں ہیں۔

نسخہ اکادمی کے صفحات ۲۵۶ ہیں۔ نسخہ کفایت ناقص الآخر ہے، لیکن اس کا آخری باب، فہرست کے مطابق صفحہ ۳۵۴ سے شروع ہوتا ہے۔ گویا اس کی ضخامت اندازاً ۲۰۰ صفحات تک ہی ہوگی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دو بار لکھی گئی۔ نسخہ اکادمی نسبتاً تفصیلی ہے اور نسخہ کفایت قدرے مختصر۔ ایک کتاب کو دوسری بار، نئے متن کی صورت میں، تحریر و تصنیف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایک قیاس یہ ہے کہ نسخہ اکادمی پہلے لکھا گیا، مگر اس کے بعض بیانات کی وجہ سے اسے ایک نصابی کتاب کے طور پر منظور نہیں کیا گیا۔ (خیال رہے کہ اس زمانے میں کتابیں

یہاں سکین صفحہ آئے گا

چھاپ کر، منظوری کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔) چنانچہ کتاب کا ایک نیا متن تیار کیا گیا۔ ہمارے اس قیاس کو اورنگ زیب عالمگیر، ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کے بارے میں نسخہ کفایت کے تبدیل شدہ اور قدرے بہتر بیانات سے بھی تقویت ملتی ہے۔ نسخہ کفایت سے چند مثالوں کے ذریعے اس کا اندازہ ہوگا۔

اورنگ زیب کی ایک 'خامی' کو تو مصنف نے بالکل معاف نہیں کیا اور جگہ جگہ بتایا ہے کہ اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگا دیا، لیکن بحیثیت مجموعی، یہاں اس کی تعریف کی گئی ہے، مثلاً: اورنگ زیب، شاہ جہاں کے بیٹوں میں 'سب سے زیادہ لائق و فائق تھا'،<sup>۲۸</sup> اور 'جفاکش پر لے درجے کا تھا'،<sup>۲۹</sup> اسی طرح یہ کہ وہ ایک دین دار مسلمان تھا۔ اس نے محصول راہداری، چنگی، عرس و چاترہ کے محاصل، وصولی قرضہ کے ابواب اور دیگر قسم کے قرضہ جات معاف کر دیے۔<sup>۳۰</sup>

مصنف نے ایک انگریز مؤرخ کے حوالے سے لکھا ہے:

میدان جنگ میں اورنگ زیب کی دلیری اور جسارت بے مثال تھی اور سیاسی معاملات میں اُس کی ہوشیاری اس پایے کی تھی کہ مشرقی ممالک میں اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ اس نے اپنی قلم رو میں سزائے موت موقوف کر دی۔ ترقی زراعت کی مختلف تدابیر کیں۔ بے شمار کالج اور اسکول قائم کیے۔ سڑک اور پل تعمیر کرائے۔ وہ دربار عام میں رعایا کے مقدمات بذات خود فیصل کرتا تھا، اور کسی صوبے دار کی، خواہ وہ کتنی دُور ہی کیوں نہ ہو، خفیف سی نازیبا حرکت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ غرض اورنگ زیب میں یہ شاہانہ خوبی تھی کہ جفاکش پر لے درجے کا تھا اور جس بات میں اُسے اپنی سلطنت کا بھلا نظر آتا تھا، اس میں دل و جان سے ساعی رہتا تھا۔

اگر مسلمانوں کی خوشامد اور ہندوؤں کی مذمت سے قطع نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب سخت گیر اور اعلیٰ درجے کی لیاقت کا آدمی تھا۔ اس کے عہد میں سلطنت، ظاہر میں عروج پر تھی، لیکن اس کا زوال شروع ہو گیا تھا اور اس کے جانشینوں کو سخت مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ پس کیا تعجب کی بات ہے کہ اس کی وفات کے بعد کچھ عرصہ نہیں لگا کہ طاقتِ مغلیہ، پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ لیکن یاد رکھو کہ اورنگ زیب کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ میں ایسی عظمت و شوکت

یہاں سکین صفحہ آئے گا

تھی کہ تمام دنیا تعجب کرتی تھی۔ سیاح، مغل اعظم کا ذکر اسی طرح کیا کرتے تھے جس طرح یونانی شاہِ فارس کا، یعنی دولت بے حد ہے، اختیار لانا انتہا ہے اور شان و شوکت بے نظیر ہے۔ ایک نامی انگریزی شاعر نے اپنے ایک نہایت نفیس ناول میں اورنگ زیب کو ہیرو بنایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ جیتے جی کہانیوں کا ہیرو مشہور ہو گیا تھا۔<sup>۳۱</sup>

نسخہٴ کفایت میں، محمود غزنوی کے تذکرے میں بھی، مصنف کا ذہن ویسا مخالفانہ نہیں رہا جیسا نسخہٴ اکادمی کے متعلقہ حصے (ص ۷۰-۷۸) میں تھا۔ نسخہٴ اکادمی کے مطابق محمود کی لوٹ مار اور حرص و ہوا کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نسخہٴ کفایت میں مصنف لکھتا ہے:

یہ بادشاہ، مسلمان فاتحوں کا نمونہ ہے، یعنی سخت گیر و جنگ جو، لیکن ساتھ ہی کشادہ دل، سپاہیانہ بچپوں میں ہوشیار اور حکمتِ عملی سے کام نکلنے والا۔ اکبر کی طرح ہندوؤں سے بالعموم اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس نے گجرات کا صوبے دار ہندو ہی مقرر کیا تھا، اور قنوج کے راجا کو اس کی گدی پر رہنے دیا تھا۔<sup>۳۲</sup>

نسخہٴ اکادمی میں مصنف نے فردوسی کا قصہ بھی بیان کیا ہے اور اس ضمن میں محمود کی 'دون ہمتی' اور وعدہ خلافی کا بھی ذکر کیا ہے،<sup>۳۳</sup> لیکن نسخہٴ کفایت میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ یہ، فردوسی شاعر کا سر پرست تھا۔<sup>۳۴</sup>

سراج الدولہ کے تذکرے<sup>۳۵</sup> میں بھی وہ تفصیل اور شدت نہیں ہے جو نسخہٴ اکادمی میں ملتی ہے۔<sup>۳۶</sup> بابر کے بارے میں بھی کوئی منفی ریمارک نہیں ملتا<sup>۳۷</sup> بلکہ اس کے حالات میں، اس کی شجاعت و بہادری اور مفتوحین سے اس کے 'شاہانہ سلوک' کا ذکر کیا گیا ہے۔<sup>۳۸</sup> نسخہٴ کفایت میں مسلمانوں کے بارے میں مصنف نے بالعموم مثبت رائے دی ہے، مثلاً: ایک جگہ کہتے ہیں: 'اس ملک میں شمال مغرب کی جانب سے ایک مہذب قوم آئی ہے،<sup>۳۹</sup> بیشتر مسلم بادشاہوں، مثلاً: فیروز شاہ تغلق، شیر شاہ سوری اور ہمایوں<sup>۴۰</sup> کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

تاریخ ہند کے ان دونوں نسخوں میں جلال الدین اکبر کی جی بھر کر تعریف کی گئی ہے۔ مصنف نے اکبر کے تدبیر، حسن انتظام اور اس کی دانائی اور بہادری کو سراہا ہے۔ بتایا

ہے کہ:

جن بادشاہوں کے سر پر تاج سلطنت رکھا گیا، اکبر ان سب میں بڑا ہے۔ اکثر مفتوح دشمنوں کا قصور معاف کر دیا کرتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا مدبر ملک تھا۔ فاتح تو بہتیرے ہوئے ہیں لیکن ایسے صاحب تدبیر بادشاہ کم ہوئے ہیں کہ سلطنت مفتوحہ کو استحکام دیں اور ایسا انتظام چھوڑ جائیں کہ صدیوں تک چلا جائے۔<sup>۱۷</sup>

مصنف کے مطابق ہندو رعایا کے ساتھ اکبر کا سلوک اتنا اچھا تھا کہ اس نے ”ہندو رعایا کا دل اپنے ہاتھ میں،“<sup>۱۸</sup> لے لیا تھا۔ مصنف نے اکبر کے مذہبی خیالات کی بھی تعریف کی ہے، اور آخر میں لکھا ہے: ”غرض اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے کہ مشرقی بادشاہوں میں اکبر سب سے دانا اور بہادر بادشاہ ہے۔“<sup>۱۹</sup>

مصنف نے من حیث القوم ہندوؤں کی، ہندو مذہب کی اور ہندو فلسفے کی تعریف کی ہے، مثلاً:

- اکثر مذاہب، فلسفہ اور شاعر، ویدانت کے رنگ سے رنگے ہوئے ہیں اور دنیا میں یہ سب سے اعلیٰ فلسفہ شمار ہوتا ہے۔<sup>۲۰</sup>
- نجوم میں ہندوؤں کی تحقیقات اعلیٰ پایے کی ہے۔<sup>۲۱</sup>
- ہندوؤں کا علم طب، آج کل کے طب کی بنیاد ہے۔<sup>۲۲</sup>

قدیم زمانے کا ذکر کرتے ہوئے، مصنف نے شودروں سے برہمنوں کے روایتی سلوک کی تردید کی ہے۔ کہتے ہیں:

اکثر مورخین کی رائے ہے کہ برہمنوں نے شودروں کا، کبھی سراونچا نہیں ہونے دیا اور جہاں تک ہوسکا، ان پر ظلم و ستم روا رکھے۔ یہ محض غلط ہے..... برہمن، شودروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے اور ان کی ترقی میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالتے تھے، اور یہ خیال بھی کہ برہمن اور اونچی ذات کے آدمی، شودروں کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا بھی کھاتے تھے، بالکل بے بنیاد ہے۔<sup>۲۳</sup>

آگے چل کر مصنف نے شواجی کی بہادری، چالاکی اور ہردل عزیزی کی تعریف کی ہے۔ مرہٹوں کے تذکرے میں لکھا ہے: ”اگر احمد شاہ ابدالی سے شکست نہ کھاتے تو مغلوں

کی جگہ یہی ہندوستان کے بادشاہ بن جاتے، ۴۸

۴

۱۹۸۴ء میں سید شکیل احمد نے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کی ایک مسل کی بنیاد پر تاریخ ہند کے بارے میں بعض معلومات و اطلاعات شائع کیں۔ انھوں نے بھی کتاب مذکور کو ڈاکٹر اقبال اور لالہ رام پرشاد کی ایک مشترکہ تصنیف خیال کرتے ہوئے لکھا کہ اقبال کو ایک بلند مرتبہ شاعر کی حیثیت میں تو سبھی جانتے ہیں، لیکن انھیں ایک مورخ کی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ ۴۹ سید شکیل احمد کے مطابق حیدرآباد دکن میں، یہ کتاب ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۷ء، یا ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء میں امتحانات السنہ شرقیہ کے نصاب Oriental Title Examination Syllabus میں داخل تھی۔ ۵۰ اس کی سفارش علما اور نام ور معلمین کی گیارہ کئی کمیٹی نے منفقہ طور پر کی تھی، جس کے سربراہ مولانا حمید الدین فراہی تھے۔ ۵۱۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کمیٹی نے کتاب پر صرف اقبال کا نام دیکھ کر اسے داخل نصاب کرنے کی سفارش کر دی اور کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) کمیٹی میں شامل نہیں تھے، مگر انھوں نے کتاب دیکھی، پڑھی تو انھیں یقین نہیں آیا کہ تاریخ ہند، اقبال کی تصنیف ہے۔ انھوں نے لکھا:

میں نے تاریخ ہند دیکھی۔ مجھ کو تعجب ہے کہ اس پر ڈاکٹر اقبال کا نام ہے، حالانکہ نہ اس کے لٹریچر میں، نہ اس کے مطالب میں، وہ زندہ دلی یا زندگی ہے، جو اقبال کا حصہ ہے۔۔۔۔۔ جہاں تک جلد ممکن ہو سکے، جدید عمدہ تاریخ تالیف کرا کر، اس کو خارج کر دینا چاہیے۔ اس تاریخ کو پڑھنے سے طلبہ کے دماغ پر ہرگز وہ اثر نہیں پڑ سکتا، جو تاریخ سے فن شریف کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ ۵۲

اس کے چند ماہ بعد تاریخ ہند پر ایک اور اعتراض اس وقت سامنے آیا جب اسے میٹریکولیشن کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ روزنامہ صحیفہ (۲ مئی ۱۹۱۸ء) کے



ایک مضمون نگار نے اعتراض کیا کہ کتاب میں خانوادہ آصفی کے بعض سابقہ حکمرانوں کے بارے میں مصنف کا لب و لہجہ نامناسب ہے اور معلومات بھی بے ادبی اور غلط تاویلات پر مبنی ہیں..... مصنف تاریخ ہند کے الفاظ یہ ہیں: اسی زمانے کے قریب ایک بڑا بھاری واقعہ ظہور میں آیا۔ نظام الملک صوبہ دارِ دکن، خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔<sup>۵۳</sup>

گویا کتاب میں 'بادشاہ بن بیٹھا' کے الفاظ مضمون نگار کے نزدیک قابل اعتراض تھے کہ اس سے شاید نظام الملک کے سوائے ادب کا پہلو نکلتا تھا۔ بہر حال، سید شکیل احمد، مذکورہ مسل کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ (غالباً اسی مؤرخ الذکر سبب سے بالآخر) اسے نصاب سے خارج کر دیا گیا۔<sup>۵۴</sup>

### حوالے اور حواشی

- ۱- روزگار فقیر، دوم، مرتب: فقیر سید وحید الدین۔ لائن آرٹ پریس کراچی، نومبر ۱۹۶۴ء، ص ۶۴۔  
عبدالغنی اور خواجہ نور الہی کی *Bibliography of Iqbal* [۱۹۵۴ء] میں تاریخ ہند کا ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح نذیر احمد کی کلید اقبال [۱۹۶۱ء] میں بھی اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔
- ۲- *A Bibliography of Iqbal*، مرتب: کے اے وحید۔ اقبال اکادمی کراچی، جنوری ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۔
- ۳- *Iqbal in Pictures*، مرتب: فقیر سید وحید الدین۔ لائن آرٹ پریس لاہور، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص [۵۸]۔
- ۴- انوار اقبال، ص ۲۴۔
- ۵- تصانیف اقبال، ص ۴۳۴ و مابعد۔
- ۶- تاریخ ہند: ڈاکٹر شیخ محمد اقبال + لالہ رام پرشاد۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۱۴۲-۱۴۳۔
- ۷- ایضاً، ص ۱۴۱-۱۴۲۔
- ۸- ایضاً، ص ۱۴۳۔
- ۹- ایضاً، ص ۱۴۳۔
- ۱۰- رموزِ بے خودی، ص ۹۸۔ رموزِ بے خودی میں اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں حسب ذیل اشعار ملتے ہیں:

شاہ عالمگیر گردوں آستاں  
 پایۂ اسلامیاں برتر از  
 درمیان کارزار کفر و دین  
 تخم الحادے کہ اکبر پرورید  
 شمع دل در سینہ ہا روشن نبود  
 حق گزید از ہند عالمگیر را  
 از پئے احمیای دین مامور کرد  
 برق تیغش خرمن الحاد سوخت  
 کور ذوقاں داستاں ہا ساختند  
 شعلہ توحید را پروانہ بود

اعتبارِ دودمانِ گورگاں  
 احترامِ شرعِ پیغمبرِ ازو  
 ترکش ما را خدنگِ آخرین  
 باز اندر فطرتِ دارا دمید  
 ملتِ ما از فسادِ ابنِ نبود  
 آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را  
 بہر تجدیدِ یقینِ مامور کرد  
 شمعِ دینِ در محفلِ ما برفروخت  
 وسعتِ ادراکِ او شناختند  
 چوں برائیم اندریں بت خانہ بود

در صفِ شاہنشاہاں کیلتا ستے  
 فقرِ او از تریش پیدا ستے

- ۱۱- تصانیف اقبال، ص ۴۵۸۔
- ۱۲- عبدالواحد بنگوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: 'سلطان شہید سے مجھے ایک خاص عقیدت بھی ہے' کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، مرتب: مظفر حسین برنی۔ اُردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۲۵۔
- ۱۳- اقبال نامہ، اول، ص ۲۳۶۔
- ۱۴- جاوید نامہ، ص ۶۰۔
- ۱۵- اسرار و رموز، ص ۴۹۔
- ۱۶- جاوید نامہ، ص ۷۳۔
- ۱۷- تاریخ ہند، ص ۲۷۱، ۲۷۲۔
- ۱۸- ایضاً، ص ۷۰۔
- ۱۹- ایضاً، ص ۷۱ تا ۷۶۔
- ۲۰- ایضاً، ص ۲۱۶۔
- ۲۱- ایضاً، ص ۲۲۲۔
- ۲۲- ایضاً، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔
- ۲۳- ایضاً، ص ۲۱۷۔
- ۲۴- ایضاً، ص ۲۱۹-۲۲۰۔

- ۲۵- ایضاً، ص ۶۳۔
- ۲۶- اقبال درون خانہ [دوم] خالد نظیر صوفی۔ اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۷۰۔
- ۲۷- محمد کفایت اللہ (کیم مئی ۱۹۲۳ء-۲۲ فروری ۱۹۹۹ء، مالیر کوئٹہ) معلم، ماہر تعلیم اور کتاب دوست شخص تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں وہ تقریباً ہر سال، اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے، پاکستان آیا کرتے تھے۔ پاکستانی دوستوں کی فرمائش پر، اور خود اپنے شوق سے بھی، وہ اپنے ہمراہ بھارتی مطبوعات، خصوصاً اردو کتابوں کا بڑا ذخیرہ لاتے۔ اقبالیات پر نئی بھارتی مطبوعات اور بعض کتابوں کی قدیم اشاعتوں کے لیے، وہ دوستوں کی فرمائش کا ہمیشہ خیال رکھتے۔ اقبال کی مرتبہ نصابی کتابیں انھیں بھارتی پنجاب کے پرانے اسکولوں کی لائبریریوں سے دستیاب ہوئی تھیں۔ تاریخ ہند کا نسخہ مذکور غالباً گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ کی لائبریری سے ملا تھا۔ مرحوم کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: کفایت اللہ: شخصیت اور خدمات، مرتبین: ڈاکٹر زینت اللہ جاوید + ظہور احمد ظہور۔ جشن کفایت اللہ کمیٹی، مالیر کوئٹہ (پنجاب) ۱۹۹۷ء۔
- ۲۸- تاریخ ہند (نسخہ کفایت)، ص ۱۴۸۔
- ۲۹- ایضاً، ص ۱۵۲۔
- ۳۰- ایضاً، ص ۱۵۳۔
- ۳۱- ایضاً، ص ۱۵۴، ۱۵۳۔
- ۳۲- ایضاً، ص ۹۶۔
- ۳۳- تاریخ ہند (نسخہ اکادمی)، ص ۷۸، ۷۷۔
- ۳۴- تاریخ ہند (نسخہ کفایت) ص ۹۶۔
- ۳۵- ایضاً، ص ۲۰۹ تا ۲۱۱۔
- ۳۶- تاریخ ہند (نسخہ کفایت) ص ۲۱۶-۲۲۰۔
- ۳۷- نسخہ اکادمی میں ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے: 'بابر کے نام پر ایک یہ دھبہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بڑی بے رحمی سے پیش آتا تھا'۔ (ص ۱۱۰-۱۱۱)
- ۳۸- تاریخ ہند (نسخہ کفایت) ص ۱۲۴۔
- ۳۹- ایضاً، ص ۱۷۔
- ۴۰- ایضاً، ص ۱۰۹، ۱۲۶، ۱۲۹۔
- ۴۱- ایضاً، ص ۱۳۷۔
- ۴۲- ایضاً، ص ۱۳۷۔

- ۴۳ - ایضاً، ص ۱۴۰۔
- ۴۴ - ایضاً، ص ۴۶۔
- ۴۵ - ایضاً، ص ۴۹۔
- ۴۶ - ایضاً، ص ۵۱۔
- ۴۷ - ایضاً، ص ۳۷، ۳۸۔
- ۴۸ - ایضاً، ص ۱۸۰۔
- ۴۹ - اقبال ریویو: اقبال اکیڈمی، حیدرآباد دکن، اپریل تا جون ۱۹۸۴ء، ص ۱۔
- ۵۰ - ایضاً، ص ۲، نیز دیکھیے: اقبال اور حیدرآباد، سید نکیل احمد۔ الکتاب پبلشرز حیدرآباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶-۱۷۔
- ۵۱ - اقبال ریویو، حوالہ ۴۹، ص ۲۔
- ۵۲ - ایضاً، حوالہ ۴۹، ص ۳۔
- ۵۳ - تاریخ ہند (نئے کفایت) ص ۱۵۸۔
- ۵۴ - اقبال ریویو، حوالہ ۴۹، ص ۵۔
- (شش ماہی بازیافت: ۱، جنوری ۲۰۰۲ء، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور)
- وضاحت: اس مضمون کے تسلسل میں ضمیمہ ۲ کا مطالعہ بھی کیجیے۔

## ’بالِ جبریل‘ کا متروک کلام

علامہ اقبال پر ’نزولِ شعر‘ کے متعدد واقعات شاہد ہیں کہ قدرت نے، انھیں شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی تھی۔ بظاہر، وہ شاعری کے فنی پہلو کو اہمیت نہیں دیتے۔ اُن کے اپنے بقول انھیں: ’فن کی باریکیوں کی طرف توجّہ کرنے کے لیے وقت<sup>۱</sup> نہیں ملتا تھا۔ مگر شاعری کے فنی پہلو سے اس بے نیازی<sup>۲</sup> کے باوجود اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ اشاعت سے پہلے، اپنے کلام کو نقد و نظر کے کڑے پیمانوں سے جانچتے پرکھتے اور مناسب حکّت و اصلاح اور حذف و ترمیم کے بعد ہی، اسے اشاعت کے لیے دیتے۔ دوسرے مرحلے میں مختلف مجموعوں کی ترتیب و تدوین کے موقع پر، علامہ نے چھان پھٹک کا وہی عمل دُہرایا۔ اب چونکہ کلام، مستقل مجموعوں کی صورت میں مرتب و منضبط ہو رہا تھا، اس لیے اس موقع پر اُنھوں نے نسبتاً زیادہ کڑا معیار مقرر کیا، جس کے نتیجے میں بعض مصرعوں اور اشعار کی صورت تبدیل ہو گئی، بلکہ کہیں کہیں، بعض نظموں کے مکمل بند، اور بعض اوقات پوری کی پوری نظمیں اور غزلیں، معیار سے فروتر قرار پا کر ترک کر دی گئیں۔

متروکات اقبال کی اشاعت کا جواز یا عدم جواز، ایک بحث طلب مسئلہ ہے، اور اقبالیات کا ایک اہم موضوع بھی۔ بعض اس بات کے قائل ہیں کہ جن اشعار کو خود اقبال نے قلم زد کر دیا، انھیں شائع کر کے محفوظ کرنے اور اقبال کی یادگار کی حیثیت سے، اُنھیں باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اقبال کے فکری اور شعری ارتقا کی تفہیم اور تجزیے کے لیے، ان کے متروکات و باقیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ تحقیقی نقطہ نظر

سے، اقبال کے متروک اشعار، اقبالیات کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں، اسی اہمیت کے پیش نظر، مختلف اہل علم اور اقبال کے عقیدت مند، باقیات کی تلاش و جستجو، اور ان کے جمع و ترتیب کے لیے کوشاں رہے۔ ان کاوشوں کے نتیجے میں باقیات کے پانچ مجموعے شائع ہوئے:

۱- رختِ سفر، مرتب: محمد انور حارث۔ لاہور، طبع اول، ۱۹۵۲ء۔ اضافوں کے ساتھ طبع دوم: کراچی، ۱۹۷۷ء۔

۲- باقیاتِ اقبال، مرتب: سید عبدالواحد معینی۔ کراچی، طبع اول: ۱۹۵۳ء۔ باشراک: محمد عبداللہ قریشی لاہور، طبع سوم: ۱۹۷۸ء۔

۳- تیسرے اقبال، مرتب: محمد بشیر الحق دیسوی عظیم آبادی، دہلی، اپریل ۱۹۵۹ء۔ ۴- سرودِ رفتہ، مرتب: غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری۔ لاہور، ۱۹۵۹ء۔

۵- نوادرِ اقبال، مرتب: عبدالغفار شکیل۔ علی گڑھ، ۱۹۶۲ء۔

ان مجموعوں میں شامل بیشتر کلام، مشترک ہے۔ باقیاتِ اقبال (طبع سوم، ۱۹۷۸ء) ضخیم ترین مجموعہ ہے اور علامہ اقبال کے شعری متروکات کا، تقریباً تمام معلوم اور دستیاب ذخیرہ، اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۹۷۹ء-۱۹۸۰ء میں راقم الحروف کو اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام کے سلسلے میں، علامہ اقبال کی قلمی بیاضیں اور شعری مجموعوں کے مسودے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان بیاضوں اور مسودوں میں بہت سے ایسے اشعار نظر آئے، جنہیں علامہ اقبال نے قلم زد کرتے ہوئے، اپنے مستقل کلام سے خارج کر دیا تھا، مگر یہ اشعار، باقیات کے کسی مجموعے میں نہیں ملتے۔ اگرچہ میرا موضوع تحقیق باقیات نہ تھا، تاہم راقم نے ضمناً ایسے بعض اشعار نقل کر لیے تھے۔ ذیل میں، شعری متروکات کا یہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔☆

☆ علامہ اقبال کی بیاضوں اور مسودوں کی بنیاد پر، اقبال کے غیر مطبوعہ باقیات شعر کو منظر عام پر لانے کی یہ اولین کوشش تھی۔ یہ مضمون استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی فرمائش پر بہ عجلت مرتب کیا گیا تھا۔ نو برس بعد، صابر حسین [کلوری] صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے بعنوان: باقیاتِ شعر اقبال (۱۹۸۹ء) ←

’بال جبریل‘ کا متروک کلام

یوں تو یہ نوادر، بجائے خود بھی اہم ہیں، تاہم ان کی نوعیت، باقیاتِ شعر کے مجموعہ ذخیرے سے، اس لیے مختلف اور منفرد ہے کہ مجموعوں میں شامل، بیشتر کلام وہی ہے، جو پہلے کسی اخبار یا رسالے میں، یا کتابچے کی صورت میں شائع ہوا، پھر اس مجموعہ کلام کو جمع کر کے کتابی شکل دے دی گئی۔ اس کے برعکس آئندہ سطور میں پیش کردہ اشعار، اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے۔ راقم نے انھیں براہِ راست اقبال کی قلمی بیاضوں اور مسودوں سے اخذ کیا، اور یہ سب اشعار، پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے ان اشعار کو محض اپنی صواب دید پر قلم زد کیا تھا۔ یہ کیوں کر متروک قرار پائے؟ اقبال کے تنقیدی شعور کے حوالے سے، اس کی وجوہ کی تلاش، تحقیق کا ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔ تاہم ان اشعار کا متن شائع کر دینا بھی کسی نہ کسی درجے میں افادیت کا باعث ہے۔ شاعر، بالعموم اپنے کلام کا اچھا ناقد نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس کے متروکات میں، خصوصاً اس صورت میں کہ شاعر صفِ اوّل کا ہو، بہت اعلیٰ درجے کے فن پارے بھی مل جاتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے بھی علامہ اقبال کے متروکات قابلِ غور ہیں۔ (غالب کے متروک کلام کا بھی یہی حال ہے۔)

میں اس ضمن میں مزید مآخذ کی نشان دہی کی اور باقیات کی متعدد فہارس بھی مرتب کر کے پیش کیں۔ بعد ازاں، اپنی اس تحقیق کی بنیاد پر انھوں نے حال ہی میں کلیاتِ شعریہ اقبال (اردو) شائع کیا ہے۔ (اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۴ء)

راقم نے زیرِ نظر مضمون میں جمع کردہ اشعار کا موازنہ متذکرہ بالا کلیاتِ باقیات کے متن سے کیا تو اس کے آٹھ شعر مجھے کلیات میں نہیں ملے۔ ان آٹھ شعروں کی نشان دہی ستارے ☆ کی علامت سے کی گئی ہے۔ اختلافِ متن کا ذکر حواشی میں کیا گیا ہے۔

یہ اعترافِ ضروری ہے کہ چند مقامات پر بعض الفاظ پڑھنے یا نقل کرنے میں مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، اب صابر کلوروی صاحب کے متن کی مدد سے تصحیح کر دی گئی ہے۔ اسی طرح یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ بعض جگہ کلوروی صاحب کا متن درست نہیں ہے۔ (ہاشمی: ۱۵ مئی ۲۰۰۴ء)

یہاں سکین صفحہ آئے گا



بالِ جبیریل' کا متروک کلام

خیال رہے کہ بعض مصرعوں یا اشعار نے دوسری یا تیسری کاوش میں اور متعدد الفاظ و تراکیب کی تبدیلی کے بعد موجودہ صورت اختیار کی۔ ایسے مقامات کی نشان دہی، مضمون کے آخر میں حواشی میں کر دی گئی ہے۔

یہاں جو متروک اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، ان کا تعلق بالِ جبیریل کے دور (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۶ء) سے ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ فنی پختگی کے اس دور میں بھی، علامہ اقبال نے اپنے اشعار کی خاصی بڑی تعداد کو قلم زد کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ہر شعر یا اشعار کے ساتھ متعلقہ غزل یا نظم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ حوالے کے لیے بالِ جبیریل کا جدید ایڈیشن ۱۹۷۳ء اور مابعد (شیخ غلام علی) پیش نظر رہا ہے:

## غزلیات

وہ نغمہ دے کہ میری لحد میں ہو، جس کا شور  
خواباں نہیں میں، نغمہ مرغِ بہار کا  
(غزل، ۵، ص ۹)

نوائے صبح گا ہی نے جگرِ خوں کر دیا میرا  
یہ برقی بے محابا، پھر مرا حاصل نہ بن جائے  
☆ تری دُنیا سے میرا ذوقِ خلوت، لے چلا مجھ کو  
مری آہ و فغاں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے  
فضا، اک اور ہی عالم کی، ہوگی سامنے میرے  
مگر ڈر ہے کہ یہ بھی پردہِ محفل نہ بن جائے  
وہ دل، لاہوتیوں نے، درسِ استغنا دیا جس کو  
کسی معشوقِ بے پروا کا پھر، محفل نہ بن جائے  
(غزل، ۶، ص ۱۰)

یہاں سکین صفحہ آئے گا

تسلی دوں تو دل کی ناامیدی اور بڑھتی ہے  
عقاب آمیز تھی، خلوت میں بھی، تیری شکر خندی  
(غزل ۱۰، ص ۱۴)

ٹھوکریں کھا کر خرد بھی پا گئی اپنی مُراد  
تھی، وہ بیداری، جسے خواب گراں سمجھا تھا میں  
(غزل ۱۴، ص ۱۸)

نظر آئی نہ مجھ کو، بوعلی سینا کے دفتر میں  
وہ حکمت، جو کبوتر کو کرے شاہیں سے بے پروا  
(غزل ۱، ص ۲۳)

بدن کو تن پرستانِ فرنگی اصلِ جاں سمجھے  
حکیمِ غزنوی کہتا ہے: ’آں دون است وایں والا‘  
(غزل ۱، ص ۲۴)

غلاموں کے لیے دستورِ جمہوری، معاذ اللہ!  
غرض یہ ہے، غلام اپنی غلامی سے ہو بے پروا  
☆ ملوکیت سے کیا امید، اے ساحلِ نشین تجھ کو  
نہنگ اپنے نشین کو نہیں کرتا تہ و بالا  
خودی کو گرچہ قدرت نے چھپا رکھا ہے پردوں میں  
کسی مردِ خدا میں، ہو بھی جاتی ہے کبھی پیدا  
(غزل ۱، ص ۲۵)

مہ و ستارہ پہ ناداں کند ڈال اپنی  
کہ تیری خاکِ پریشاں کی زد میں ہے گردوں  
(غزل ۳، ص ۲۷)

یہاں سکین صفحہ آئے گا

من کی دُنیا میں ہوائیں، خوش گوار و بے غبار  
اور اس مٹی کی دنیا میں نہ شہر اچھا نہ بن  
(غزل ۷، ص ۳۱)

کبھی رہ جائے گی افرنگ کی فولاد کاری بھی کے  
کہ ہر مملّت پہ آتا ہے زمانہ شیشہ سازی کا  
(غزل ۸، ص ۳۲)

اگرچہ میری جبین پر نہیں نشانِ سجود  
ہزار شکر کہ یاروں کو مل گئی توفیق  
(غزل ۱۱، ص ۳۴)

ابو تراب ہے خیبر کشا و مرحب کُش  
کہاں وہ حوصلہ تجھ میں کہ تو ہے ابنِ تراب  
(غزل ۱۳، ص ۳۶)

عجب کیا ہے کرے، آب و ہوائے جرمنی پیدا  
کوئی رومی کہ افرنگی سے، کہہ دے، حرفِ تہریزی <sup>۵</sup>  
(غزل ۱۷، ص ۴۱)

☆ بے حضوری میں موت ہے دل کی      زندہ ہو دل، تو بے حضور نہیں  
ہے یہ منزل ہی دل پذیر ایسی      اے مسافر! ترا قصور نہیں  
(غزل ۲۰، ص ۴۳)

تِلگہ بلند، ادا دل نواز، جاں پُرسوز      یہی ہے، اور، جوانوں کی دلیری کیا ہے <sup>۹</sup>  
(غزل ۲۵، ص ۴۸)

اگرچہ موج ہے تُو، سیلِ سُندِ رَو بن جا  
ذرا گراں بھی تو ہو، بحرِ بے کراں کے لیے

یہاں سکین صفحہ آئے گا

مری نوا نے کیا، مجھ کو آشکار ایسا  
 رہی نہ بات، کوئی، میرے رازداں کے لیے  
 (غزل ۲۶، ص ۴۹)

تہذیب کے پردے میں، تعلیم ہوس ناکی نازل ہوا مغرب پر، فطرت کا عتاب آخرت  
 (غزل ۲۹، ص ۵۲)

اقبال! مدرسوں نے دانش تو عام کر دی نیاپاب ہو گیا ہے جذبِ قلندرانہ  
 ملّاے کم نظر نے، اُمت میں پھوٹ ڈالی سیخِ مصطفیٰ ہے، صدیوں سے دانہ دانہ  
 (غزل ۳۲، ص ۵۴)

اس پیکرِ خاکی میں، بنتی ہے خودی جس دم  
 نچیر زبوں اس کا، دنیا کی شہنشاہی  
 (غزل ۳۴، ص ۵۶)

وہی جامِ حقیق اب تک، وہی اہلِ طریق اب تک  
 وہی تریاق ہے لیکن، نہیں تاثیرِ تریاقی  
 جدا تہذیبِ حاضر سے ہے اندازِ مسلمانی  
 وہ ہے گفتارِ آفاقی، یہ ہے کردارِ آفاقی  
 (غزل ۳۶، ص ۵۸)

وطن کے سومانقی کو، بتوں کا کام دیتے ہیں  
 کہیں اخبارِ 'فرعونی' کہیں آثارِ 'شاپوری'  
 (غزل ۳۸، ص ۵۹)

جہاں اس سے خوش تر، ابھی اور بھی ہیں  
 ابھی اے مسافر! سفر اور بھی ہیں  
 گزر، اس صنمِ خانہ رنگ و بو سے  
 محبت کے مندر، ابھی اور بھی ہیں  
 (غزل ۴۰، ص ۶۱)

یہاں سکین صفحہ آئے گا



علیٰ کے علم پہ جت تھی، ذوالفقارِ علی  
غرض کہ دعویٰ صوفی ہے بے قیاس و دلیل  
(غزل ۴۳، ص ۶۳)

اگر رفیقِ خرد ہو نگاہِ قلبِ سلیم  
تو ڈوب کر اُبھر آتی ہے کشتیِ ادراک  
مری نوا میں ہے ناداں، مَنعوں کے پاس نہیں  
وہ سرخوشی کہ میسر ہو بے عصارہ تاک  
غمیں نہ ہو کہ جہاں کے ہیں آخری وارث<sup>۱۱</sup>  
طفیلیانِ سرخوانِ خواجہِ افلاک  
(غزل ۴۶، ص ۶۶)

یا شیوہ درویشی یا ہمتِ سلطانی      یا سطوتِ سلطانی یا طرحِ فقیرانہ

(غزل ۴۷، ص ۶۷)

اگرچہ پاؤں میں اک تار رہ گیا باقی      بچا گئی مجھے صیاد کی کہنِ دامی

(غزل ۵۴، ص ۷۳)

خدا سے روٹھ گیا [تھا] کہ قاسمانِ ازل      مجھے بھی دیتے تھے فزِ قباد و کئے خسرو

(غزل ۵۵، ص ۷۴)

ہے کوئی اور جگہ منزلِ بیگانہ شوق

خانقاہیں بھی ہیں خاموش، مساجد بھی نموش

(غزل ۵۶، ص ۷۵)

میں مرّوت سے رہیں رہ جبریل رہا<sup>۱۲</sup>      وہ یہ سمجھا مری پرواز میں ہے کوتاہی

(غزل ۵۷، ص ۷۵)

رہو جانباز کی غیرتِ مردانہ دیکھ      کر نہیں سکتا قبولِ راحلہ و زادِ راہ

(غزل ۵۹، ص ۷۷)

یہاں سکین صفحہ آئے گا

## منظومات

لینن:

سرمایہ پرستی نے کیا خوار، جہاں کو  
یہ چیز ہے قوموں کے لیے مرگِ مفاجات  
☆ خطرے میں ہے یورپ کے تدبیر کا سفینہ  
مشرق میں ہیں سب منتظرِ وقتِ مکافات  
☆ تو عالم و دانا ہے مگر تیرے جہاں میں  
ہیں تلخ بہت بندۂ محکوم کے اوقات  
(ص ۱۰۶-۱۰۸)

فرشتوں کا گیت:

چرخ ہے کج خرام ابھی، اور ستارہ خام ابھی  
ہے یہ طلسمِ آب و گل، پیکرِ ناتمام، ابھی  
(ص ۱۰۹)

ذوق و شوق:

شوق یگانہ رو مرا، ہم سفروں سے بے نیاز  
آپ ہی کارواں ہوں میں، آپ ہی میرے کارواں  
منزلِ یار سامنے اور یہ کیفیت مری  
خونِ دل و جگر میں ہے ڈوبی ہوئی، مری فغاں  
از غمِ دل حکایتے است، از غمِ دین حکایتے است  
آہ جگر گدازِ من، سوزِ درونِ ملتے است  
(بندا، ص ۱۱۱)

قومِ تہی ضمیر کا، چارہ کار، کچھ نہیں  
 اس کی نگاہ نابصیر، اس کی حیات بے ثبات  
 عشق نہ ہو تو عقل سے راہبری کی کیا اُمید  
 عشق کی آگ کے بغیر، مردہ تمام [کائنات] <sup>۱۳</sup>  
 عشق کے ہاتھ سے گُما، سلسلہ تجلیات <sup>۱۴</sup>  
 رہ زنِ دینِ غزنوی، مغربیوں کے سومنات  
 حلقہ ذوق و شوق میں آج وہ دیدہ و رکھاں <sup>۱۵</sup>  
 جن کی نظر میں تھے کبھی پردگیانِ کائنات  
 ملت بے نظام ہے آج وہ ملتِ نجیب  
 جس کی نماز تھی، کبھی، عکسِ نظامِ کائنات <sup>۱۶</sup>  
 (بند ۲، ص ۱۲)

دیرِ مغاں سے اُٹھ گئے رند، جو تھے کہن سبو  
 خانقہوں میں رہ گئی اہلِ ہوس کی ہاے و ہو  
 وارثِ علمِ انبیا، لیتے ہیں دہریوں سے درس  
 اب ہے خدا کے ہاتھ میں اہلِ حرم کی آبرو  
 اُس کا گناہ گار ہوں، تجھ سے بھی شرم سار ہوں  
 صاحبِ اختیار ہے، میرے معاملے میں تُو  
 گرچہ نواے شوق بھی، رخصتِ شب کی ہے دلیل  
 صبحِ الم کی ہے شفق، مردِ شہید کا لہو  
 تو ہے تجلّی وجود، تو ہے تجلّی شہود  
 راز و نیازِ ما رَمِیْتُ، سوز و گدازِ عَبْدُہ  
 (بند ۳، ص ۱۲)

علم و ہنر کی جدتیں پا برکاب ہیں تمام  
 ذکر ہے سوز سے تہی، فکر سفینہ در سراب  
 فیضِ نظر کہاں کہ جو نقشِ کہن اُبھار دے  
 محو دلوں سے ہو گیا، حرف جو تھا درونہ تاب  
 حلقۂ بزمِ راز میں گرمی ہاے و ہو نہیں  
 میرے سوا یہاں کوئی رندِ کہن سبُو نہیں <sup>۱۷</sup>  
 (بند۴، ص ۳)

عشقِ غیور اگر اسے ذوقِ خودی عطا کرے  
 سنگِ گراں کو توڑ دے، ریزہٴ شیشہٴ حلب  
 اعجمیانِ بے زباں، عشق کے فیض سے کلیم  
 ترک و تار کو دیا اس نے درونہٴ عرب  
 غفلتِ یک نفسِ خطا، دُوریِ جاوداں سزا  
 میرے گناہ بھی عجب، میرے عذاب بھی عجب  
 (بند۵، ص ۵)

علم کے زخمِ خوردہ کو علم سے بے نیاز کر  
 عقل کو مے گسار کر، عشق کو نئے نواز کر  
 صورتِ ریگِ بادیہ، میرے غموں کا کیا حساب  
 درد کی داستاں نہ پوچھ، دستِ کرم دراز کر <sup>۱۸</sup>  
 مفتی دیں حرمِ فروش، پیر حرمِ خدا فروش  
 رندِ دہنِ دریدہ کو محرمِ حرفِ راز کر  
 ☆ چرخ کی آستیں میں ہیں بدر و حنین اور بھی  
 خواجہٴ امتنانِ شرق، اپنی سپاہ ساز کر

یہاں سکین صفحہ آئے گا

ارض و سما کی طاقتیں، تیرے جنود ہیں تمام  
 میرِ عساکرِ اُمم، اپنی سپاہ ساز کر ۱۹  
 طبعِ زمانہ تازہ کر جلوہ بے حجاب سے  
 شب کو سبک رکاب کر، روز کو دیرباز کر ۲۰  
 اپنی سپاہ ساز کر، ایک بھی شہرِ دل نہ چھوڑ  
 ایک بھی شہرِ دل نہ چھوڑ، سینوں میں ترک تاز کر  
 تجکو خبر بھی ہے کہ ہے ربط، دل و نظر میں کیا  
 یا لبِ بام اٹھا نقاب، یا درِ بستہ باز کر  
 صدق بھی دے، صفا بھی دے، وحدتِ مدعا بھی دے  
 جامِ جہاں نما بھی دے، دستِ جہاں کشا بھی دے ۲۱  
 (آخری متروک بند)

جاوید کے نام:

بلند ہے تری ہمت تو فکرِ روزی کیا نہیں ہے لقمہٴ شاہیں، نصیبِ کرگس و زاغ  
 (ص ۱۱۶)

ساقی نامہ:

”ساقی نامہ“ کے ابتدائی مسودے میں کئی بار تبدیلی کی گئی۔ ایک بیاض میں نظم کے مختلف حصے الگ الگ عنوانات کے تحت درج ہیں، مثلاً: بند ۶ (یہ موجِ نفس کیا ہے.....) کا عنوان ہے: ”خودی“ اور بند ۴ (دمادم رواں ہے.....) کے ”حیات“ کے زیر عنوان لکھا گیا ہے۔۔۔ بعد میں عنوانات ترک کر کے، سب حصوں کو ”ساقی نامہ“ کے تحت یکجا کیا گیا۔ ترتیبِ اشعار میں بھی تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار، موجودہ نظم میں شامل نہیں ہیں۔ ہم نے یہ دو مختلف مسودوں

سے اخذ کیے ہیں:

یہاں سکین صفحہ آئے گا



بال جبریل کا متروک کلام

چٹانوں پہ مخمل بچھانے لگی ۲۲  
 پہاڑوں کے چشمتے ہیں سیماب ریز  
 ہواؤں میں آباد ہیں بستیاں  
 محبت میں ہارے ہوئے کی ہے حیت  
 اٹکتا، لچکتا، سرکتا ہوا  
 بڑے چھوٹے نالوں میں بٹنا ہوا  
 بڑے پیچ کھا کر، نکلتا ہوا  
 (بند ۱، ص ۱۲۲، ۱۲۳)

لہو، ان پُرانی رگوں میں نہیں  
 نہیں جس میں باقی ہے ٹنڈ جوش  
 (بند ۲، ص ۱۲۳، ۱۲۴)

۲۳ زباں وہ کہ پتھر کا دل چیر دے  
 (بند ۳، ص ۱۲۴، ۱۲۵)

یہ جوہر، ترا تن بھی، ہے جان بھی  
 گرہ کھا کے تخم و ثمر بن گئی  
 ذرا اور سمٹا تو گوہر بنا  
 خوش اپنے بنائے ہوئے دام میں  
 مگر ہر کہیں ایک اور بے نظیر  
 جھپٹی، لپٹی، کڑکتی ہے یہ  
 جو میری نظر ہے، وہ تیری نہیں  
 (بند ۵، ص ۱۲۷)

سمندر میں پیچاک گرداب دیکھ

نسیم سحر گل کھلانے لگی  
 زمیں، یاسمن سے ہے مہتاب خیز  
 ☆ پرندوں کی چپکار میں مستیاں  
 یہ کہتا ہے دل [سے] پرندوں کا گیت  
 وہ پانی چمکتا، دمکتا ہوا  
 لپٹتا، اُچلتا، سمٹتا ہوا  
 اُچھلتا، پھسلتا، سنھلتا ہوا

چمک ایشیا کے گلوں میں نہیں  
 ادب اس کا مے خانہ بے خروش

زباں مجکو مانند شمشیر دے

یہ شمشیر، شمشیر ہے جان بھی  
 یہ ذوقِ نمو سے شجر بن گئی  
 اُجالا جو سمٹا تو اختر بنا  
 اُلجھتی ہے، پیچاکِ ایام میں  
 رہی خاک کی مورتوں میں اسیر  
 لہکتی، مہکتی، چمکتی ہے یہ  
 جو تیری تمنا ہے، میری نہیں

تماشاے بیداری و خواب دیکھ

یہاں سکین صفحہ آئے گا

خودی کی ہوئی بے خودی سے نمود  
یہ معماریِ زندانِ نزدیک و دُور  
خرد اس کے گھر کی پُرانی کینز  
یہ کارِ آزما، ہے بڑی سخت کوش  
سروِ جہاں کی بم و زیرِ یہ  
یہ عالمِ حجابِ نگاہِ خودی  
یہ ہے حاصلِ کارِ بود و نبود  
اسی کی چمک سے فروغِ شعور  
خودی کی غلامی سے ناچیز، چیز  
نفس اس کے، امروز و فردا و دوش  
بجاتی ہے طنبورِ تقدیرِ یہ  
(بند ۶، ص ۱۲۵ تا ۱۲۸)

یہ انبارِ گل، سنگِ راہِ خودی  
(بند ۷، ص ۱۲۸)

زمانہ:

بیاض میں یہ نظم ’زمین و زمانہ‘ کے زیرِ عنوان درج ہے، اس کے ضمنی عنوان ’زمین‘ کے تحت مندرجہ ذیل اشعار ملتے ہیں، جنہیں بعد میں قلم زد کر دیا گیا:

جہاں میرے اسرار سے بے خبر ہے  
کوئی حد ہے میری شکم خوار یوں کی  
مری خاکِ خاموش میں مل گئے ہیں  
مری خاک میں نادری کا نامہ  
ادھر سرنگوں کاخ و گورومیوں کے  
وہ انبارِ جمشید کی استخوانی  
پلٹتے ہوئے اپنے اپنے کفن میں  
یہ فرعونِ اول، وہ فرعونِ ثانی

حوادث کی میں، اک لحد ہوں پُرانی  
مرا لقمہ، ہر اُمتِ پاستانی  
ستم ہاے تدریجی و ناگہانی  
مری خاک میں قبرِ چنگیز خانی  
ادھر سرنگوں رایتِ گورگانی  
یہ مشیتِ گلِ رستمِ سیتانی  
یہ فرعونِ اول، وہ فرعونِ ثانی

برونِ زمیں جلوہٴ چند روزہ

درونِ زمیں ظلمتِ جاودانی

اس کے بعد ضمنی عنوان ’زمانہ‘ کے تحت وہ اشعار درج ہیں، جو اسی عنوان سے بالِ جبریل (ص ۱۲۹-۱۳۰) میں موجود ہیں۔ تاہم حسبِ ذیل شعر بالِ جبریل کی نظم میں

موجود نہیں ہے:

حکیم ناداں کی خود فریبی، رصد نشینی، ستارہ بینی  
ضمیر میرا وہ جانتے ہیں، نگاہ جن کی ہے عارفانہ  
رُوحِ ارضی آدمؑ کا استقبال کرتی ہے:

اس جت ارضی کی ہے تعمیر تجھی سے  
مٹی کی پلٹ جائے گی تقدیر تجھی سے  
ہے عقلِ فرومایہ، جہاں گیر تجھی سے  
تقدیر ہے زنجیری تدبیر تجھی سے<sup>۲۴</sup>

(ص ۱۳۲، ۱۳۳)

بالِ جبیریل کا بیشتر حصہ، جس بیاض میں درج ہے، اس میں ایک نظم اور چند ایسے متفرق  
اشعار بھی ملتے ہیں جنہیں بالِ جبیریل میں شامل نہیں کیا گیا۔ پہلے متذکرہ نظم ملاحظہ کیجیے:

خطاب بہ فرزندِ آدم:

ترا دل کلیم و مسیح و خلیل	تری نئے میں ہے نعمہ جبریل
ترا دل رُبانیدہ کائنات	ترا دل کشائیدہ کائنات
متاعِ دو عالم، تری جانِ پاک	ستاروں سے اُونچی، تری مُشتِ خاک
مُفسّر ہے تیری کتابِ وجود	تو ہے حاصلِ پیچ و تابِ وجود

جہاں باجہات اور تُو بے جہات

جہاں بے ثبات اور تُو باثبات

## متفرق اشعار

بہتر ہے، مہر و ماہ و ثریّا سے شانِ مرد<sup>۲۵</sup>

یہ آب و گل کا کھیل، نہیں ہے جہانِ مرد

مرنے سے خوف کیا، کہ ہے ارشادِ مصطفیٰ  
دُنیا میں موت مرد کی ، ہے پاسبانِ مرد

☆ نمود اس کی نمود تیری، نمود تیری نمود اس کی  
خدا تجھے بے حجاب کر دے، خدا کو تو بے حجاب کر دے ۲۶

غافل! مری نواے پریشاں میں دُوب جا  
میں نے دیا ہے تیری خودی کا تجھے سراغ  
دل تیرا کر دیا، متزلزل، فرنگ نے  
لرزا [کیا] ہے تُو صفتِ شعلہ چراغ ۲۷

مرے سینے میں تھا سویا ہوا دل  
اسے کھویا تو یوں گویا ہوا دل  
محبت صبح روشن، زندگی رات  
فقط بیدار ہے، کھویا ہوا دل

### حوالے اور حواشی

- ۱- مکتوب بنام سید سلیمان ندوی: اقبال نامہ اول، ص ۱۰۸۔
- ۲- سید سلیمان ندوی کے نام پر ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ”میں نے اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا، فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی“۔ (اقبال نامہ، اول، ص ۱۹۵)
- ۳- بیاض میں اس غزل کے اشعار، سب سے پہلے بطور ایک نظم بہ عنوان: ”زندگی“ درج ہیں۔ بعد ازاں

انھیں ”عشق“ کا عنوان دیا گیا۔ تیسرا عنوان: ’دعا‘ تجویز ہوا، اور آخر میں یہی اشعار بطور غزل، مسودے میں شامل ہوئے۔

۴- اسی غزل کا ایک شعر ہے:

کہہ گئیں رازِ محبت پر وہ داری ہاے شوق  
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

اس کی اوّلین صورت یہ تھی:

کیا عجب [میں] معجزات بے زبانی ہاے شوق  
تھی فغاں وہ بھی، جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

۵- مسودے میں ’بوعلیٰ پر‘ کا نشان بنایا گیا ہے، جو درست نہیں، اس لیے اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

۶- اس مصرعے کی اوّلین صورت یہ تھی: بدن کو اصل جاں سمجھا حکیمانِ فرنگی نے  
دوسری کاوش میں میں علامہ نے لفظی تبدیلی کی مگر مصرع کی صحیح شکل نہیں بن سکی، چنانچہ پورا مصرع  
کاٹ کر موجودہ مصرع لکھا، آخر میں یہ بھی متروک قرار پایا۔ صابر کلوروی صاحب نے صرف اوّلین  
(محولہ بالا) صورت نقل کی ہے۔ (کلیات، ص ۲۸۵)

۷- اوّلین صورت میں یہاں ’خاراشگانی‘ تھا۔ بعد میں ’فولادکاری‘ بنا دیا گیا۔

۸- اس غزل کو سب سے پہلے ’لندن‘ کا عنوان دیا گیا تھا، پھر اسے ’فرنگ‘ سے تبدیل کیا گیا۔ بالآخر  
بلا عنوان ہی بطور غزل، مسودے میں شامل ہوئی۔

۹- اس متروک شعر نے بعد ازاں، قدرے ترمیم کے بعد، یہ صورت اختیار کی:

نگہ بلند، سخنِ دل نواز، جاں پُرسوز  
یہی ہے زحمتِ سفر، میرِ کارواں کے لیے

(بالِ جبویل، ص ۳۳۱)

۱۰- کلیات: ..... فطرت کا عذاب آخر (ص ۲۸۸)

۱۱- کلیات: ..... خواجہ لولاک (ص ۲۹۱)

۱۲- کلیات: ..... رفیق رہِ جبریل (ص ۲۹۲)

۱۳- کلیات: ..... تمام کلیات (ص ۲۶۲)۔ مسودے میں بھی ’کلیات‘ ہی ہے (ص ۹۴)۔ مگر یہاں  
’کائنات‘ کا محل ہے۔

۱۴- کلیات: ..... ہاتھ سے گیا (ص ۲۶۱)۔ بالِ جبویل کی بیاض میں واضح طور پر ’گما‘ ہے اور یہی

درست ہے۔

۱۵- اس مصرعے کی ایک صورت یہ بھی ہے:

مسجد و خانقاہ میں آج وہ دیدہ و رکہاں

۱۶- بجز اقبال، مصرع ثانی کی حسب ذیل دو صورتیں بھی موجود ہیں:

(الف) جس کی دو رکعت صلات، شرح نظام کائنات

(ب) جس کی صلات با امام، شرح نظام کائنات

۱۷- یہ، بند نمبر ۴ کا آخری (ٹیپ کا) شعر تھا۔

۱۸- ایک اور مسودے میں اس شعر کی صورت یہ ہے:

دستِ کرم دراز کر، درد کی داستاں نہ پوچھ

صورتِ ریگِ بادیہ، میرے غموں کا کیا حساب

آئندہ صفحے پر عکس دیکھیے۔ ایک اور بیاض میں دو اشعار کا متن اس طرح ہے:

دستِ کرم دراز کر، درد کی داستاں نہ پوچھ

علم کے زخم خوردہ کو، علم سے بے نیاز کر

صورتِ ریگِ بادیہ، میرے غموں کا کیا حساب

عقل کو مے گسار کر، عشق کو نئے نواز کر

۱۹- اس شعر کے مصرع ثانی کی اولین صورت یہ تھی: ع

میرِ ہمامِ شرق و غرب، اپنی سپاہ ساز کر

۲۰- مصرعِ اول، متداول کلام میں موجود ہے۔

۲۱- پہلے مصرعے کی اولین صورت یہ تھی: ع

فقیر ابو ذری کے ساتھ، قوتِ مرتضیٰ بھی دے

کلوروی صاحب کے ہاں اس شعر کا دوسرا مصرع مقدم ہے اور پہلا مؤخر۔ (کلیات، ص ۴۶۴)

۲۲- بیاض میں اسے قلم زد کر کے، شعریوں بنایا گیا ہے:

صبا، فرشِ محفل بچھانے لگی

زمیں سے ستارے اُگانے لگی

ایک اور بیاض میں پہلا مصرع اس طرح ہے:

صبا فرشِ نسرین بچھانے لگی

یہاں سکین صفحہ آئے گا



’بالِ جبریل‘ کا متروک کلام

- اسی بیاض میں، مزید دو شعروں کے بعد، پہلے مصرعے کی پھر وہی متذکرہ بالا صورت ملتی ہے: ع
- صبا فرشِ مخمل بچھانے لگی
- ۲۳- اوّلین صورت میں، دونوں مصرعوں میں پہلا لفظ ’قلم‘ تھا پھر اُسے کاٹ کر ’زبان‘ بنایا گیا۔ کلیات میں مصرع اول اس طرح ہے: ع
- قلم مجھ کو مانندِ شمشیر دے
- ۲۴- اس مصرع کی اوّلین صورت یہ تھی:
- مخنت کش و خوں ریز و کم آزار، تری خیر
- ۲۵- کلیات: برتر ہے مہر و ماہ..... (ص ۲۹۶)
- ۲۶- کلیات (ص ۵۳۵) میں (بحوالہ علمِ مجلسی) اس شعر کی قدرے مختلف صورت یہ ہے:
- نمود تیری نمود اس کی، نمود اس کی نمود تیری
- خدا کو تو بے حجاب کر دے، خدا تجھے بے حجاب کر دے
- ۲۷- کلیات: لرزا ہوا ہے..... (ص ۲۹۶)
- (مجلّۃ تحقیق، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ جلد ۲، شمارہ ۴: ۱۹۸۰ء۔ نظر ثانی اور ترمیم و تصحیح: ۱۵ مئی ۲۰۰۴ء)



## کچھ غیر مطبوعہ کلام

بانگِ درا کی اشاعت (۱۹۲۳ء) سے قبل، علامہ اقبال کے اُردو کلام کا بہت سا حصہ مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکا تھا۔ پہلے مجموعہ کلام کی ترتیب و تدوین کے موقع پر، انھوں نے مطبوعہ منظومات و غزلیات میں خاصی ترمیم و تنسیخ سے کام لیا۔ متعدد مصرعوں اور اشعار کو بہتر بنایا، کہیں کہیں مکمل اشعار اور کہیں کہیں پورے بند خارج کیے، اور بعض مقامات پر نئے اشعار کا اضافہ کیا۔

باقیات کلام اقبال کے مختلف مجموعوں میں اقبال کا وہ کلام مدون کیا گیا ہے، جو اقبال کے ابتدائی مطبوعہ متن میں شامل تھا، مگر بانگِ درا کی ترتیب و تدوین کے موقع پر اقبال نے اسے بوجہ، اپنے مستقل شعری آثار کا حصہ نہیں بنایا۔

تاہم باقیات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو معرضِ تحریر میں تو آیا، مگر اشاعت سے قبل ہی علامہ اقبال نے اسے قلم زد کر دیا۔ ایسے اشعار، بعض نظموں کے مکمل بند اور بعض مختصر منظومات، اُن کی قلمی بیاضوں میں محفوظ ہیں۔ علامہ اقبال، اپنا کلام، سب سے پہلے کسی بیاض میں لکھتے یا املا کراتے، اس کے بعد اشاعت کے لیے مسودہ تیار ہوتا، کبھی کبھار مسودے میں بھی اصلاح کرتے اور بعض اشعار خارج کر دیتے۔ اس طرح حکمت و ترمیم کا سلسلہ، کتابت کے مرحلے تک جاری رہتا۔ راقم الحروف کو اقبال کی شعری بیاضوں اور مسودوں میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار نظر آئے، جو قلم زد کر دیے گئے، یا جنھیں بدل کر نئی شکل دی گئی۔ بعض اشعار میں علامہ نے دو تین بار ترمیم کی، مگر ان ترمیم شدہ صورتوں پر

بھی، انھیں اطمینان نہ ہوا، بالآخر انھیں قلم زد کر دیا۔

سب سے زیادہ ترمیم و تنسیخ بال جبریل کی نظم 'ذوق و شوق' میں نظر آتی ہے۔ موجودہ نظم کے تیس شعروں کے مقابلے میں، متروک اشعار کی تعداد ۳۴ بنتی ہے۔ اقبال کے فکری وقتی اور شعری ارتقا، نیز ان کے ذوق نقد و انتخاب کے سلسلے میں، ان کی شاعری کا یہ متروک حصہ اور اصلاحات و ترمیم ایسی اہمیت رکھتی ہیں کہ تحقیق اقبال میں انھیں نظر انداز کر کے کوئی نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا۔

شعری بیاضوں سے اخذ کردہ اقبال کا غیر مطبوعہ کلام، بجائے خود، نوادر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بال جبریل سے متعلق متروکات، مضمونِ ماسبق میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ ذیل میں وہ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، جو بانگِ درا، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز (اردو) کے متداول متن میں شامل نہیں ہیں۔ بال جبریل کے بعض متروک اشعار بھی دیے جا رہے ہیں، جو متذکرہ بالا مضمون میں شامل نہ ہو سکے تھے۔

بعض مصرعوں اور اشعار میں اقبال نے جو اصلاح و ترمیم کی، ان کی، نیز اختلافِ متن کی نشان دہی مضمون کے آخر میں حواشی میں کر دی گئی ہے۔ اشعار کے ساتھ متعلقہ نظم کا نام بھی درج ہے۔\*

## بانگِ درا

شکوہ:

تھے اشاعت پہ کمر بستہ غریب اور امیر غافل اس کام سے رہتے تھے، نہ سلطان نہ وزیر  
شہرِ دشمن میں گئے، جنگ میں ہو کر [جو] اسیر واں بھی مقصود رہی خدمتِ دیں کی تدبیر  
ذوقِ تبیخ سے بے چین رہا کرتے تھے  
اہلِ زنداں کو مسلمان کیا کرتے تھے

(بند ۱۲، ۱۳ کے درمیان)

☆ زیر نظر مضمون میں شامل چودہ اشعار کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال میں نظر نہیں آئے، ان پر ستارے ☆ کی علامت بنائی گئی ہے۔

کچھ غیر مطبوعہ کلام

پہلے رہنے کو محل رکھتے تھے، اب گھر بھی نہیں ایسے سشدر ہیں کہ سر رکھنے کو اک در بھی نہیں  
 پھوڑیے کس کو یہاں، دوش پہ اب سر بھی نہیں یہ مینسٹر ہو تو پھر ہاتھ میں پتھر بھی نہیں  
 نہیں مسجد تو ڈریں طعنہ اغیار سے کیا؟  
 توڑ سکتے نہیں بت خانے کی دیوار سے کیا؟

(بند ۱۱۵ اور ۱۶ کے درمیان)

صفتِ غنچہ ہے تدبیر ہماری دل گیر ہو نہ تقدیر مُساعِد، تو کرے کیا تدبیر  
 مدرسے بنتے ہیں، پوری نہیں ہوتی تعمیر زندہ ہم خاک ہوں، تقدیر ہی کہتی ہے بمبر  
 دل کو تسلیم کی خو ڈال کے بہلائیں گے  
 بے نیازی تری عادت ہے تو سہ جائیں گے

(بند ۱۱۷ اور ۱۸ کے درمیان)

شع و شاعر:

رازقِ اقوامِ عالم تھا کبھی جن کا کرم  
 ایک عالم کی زباں پر اُن کے افسانے رہے

(بند ۴، شعر ۶)

بت کدے دُنیا کے، ویراں کر دیے اس نے مگر  
 بت شکن کے مشہدِ دل میں صنم خانے رہے<sup>۳</sup>

(بند ۴، شعر ۸)

ہے خبر تاروں میں لیکن آمدِ خورشید کی  
 ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

(بند ۴، شعر ۱۰)

ابتدائی صورت میں یہ، بند کا آخری شعر تھا، بعد ازاں اسے قلم زد کر کے علامہ نے

مندرجہ ذیل شعر رقم کیا:

یہاں سکین صفحہ آئے گا

☆ رہنر دانا متاعِ کارواں بھی لے گیا  
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی لے گیا ۴

(بند۴، شعر۱۰)

محوِ تعلیمِ تپش ہیں میرے پروانے اگر ۵  
سوزِ آہنگِ محبت سے ہو تو آتشِ فروش

(بند۶، شعر۶)

شرطِ ہستی ہے زمانے میں مذاقِ انقلاب  
ہے وہی خم جو کبھی خنجر، کبھی ابرو ہوا

(بند۷، شعر۲)

☆ قوتِ ایماں سے تھی دُنیا میں تیری آبرو  
یہ توانائی گئی جس دم تو رسوا تُو ہوا

(بند۷، شعر۶)

دیکھ تو اپنی پرانی مے میں، کیفیت ہے کیا  
جامِ دل کو بادۂ نو سے ذرا بیگانہ کر  
تو نے جو دیکھا ہے کیوں اوروں کو دکھلاتا نہیں  
آپ بھی دیوانہ ہو، اوروں کو بھی دیوانہ کر

(بند۸)

جل رہی ہوں میں تو اپنی انجمن کے واسطے ۱  
نغمہ پیرا تو بھی ہو، اپنے چمن کے واسطے

جوابِ شکوہ:

یاد ایامِ سلف، فخرِ اب و جد بے کار  
مثلِ تابانیِ شمعِ سرمرقد بے کار

## تعلیم اور اُس کے نتائج:

کفر کے ہاتھ گرو ہے یہ متاعِ نایاب  
ہر قدم پر رہ منزل میں ہے اُفتاد بھی ساتھ

(شعر ۲)

دانہٗ نخلِ تمنا جو زمیں سے پھوٹا  
خاکِ گلشن سے اُگی برقِ فلک زاد بھی ساتھ

(شعر ۵)

غلام قادر رُہیلہ:

☆ رگوں میں جس کی، گرمی، خونِ تیوری سے باقی ہو  
تو بڑھ کر ذبح کر ڈالے وہ مجھ کو میرے خنجر سے

شبلی وحالی:

معنی شناسِ قصّہٗ اقوامِ روزگار  
گردوں کو جانتی ہے ترے کارواں کی گرد  
☆ احوالِ عہدِ رفتہ سے ہے آگہیِ ضرور  
کیونکر خزاں ہوئی ترے گلشن سے ہم نبرد  
خالی مگر بساطِ عملِ ہوگئی تری  
یہ کیا ہوا کہ ایک بھی باقی نہیں ہے مرد

والدہ مرحومہ کی یاد میں:

فطرت اس گلشن کی ہے محرومِ تابِ اختیار  
ورنہ شاخِ سنگِ رس کرتی نہ پیدا برگ و بار

(بندا)



☆ واے ناکامی کہ میں بھی آشنا حکمت سے ہوں  
طور ہوں بن پیر، بن عقل، خنک فطرت سے ہوں

(بند۲)

تن کے اجزا ہیں اگر فانی، تو فانی ہم نہیں  
قطع دست و پاسے احساسِ وفا کچھ کم نہیں

(بند۷)

عام اس صحرا میں ہے گو موت کی غارت گری  
ایک راحت بھی نہیں، آمیزشِ غم سے بری

(بند۷)

موت کا دکھ اس کی دُنیا میں جو ہے عام اس قدر  
آدی قدرت کو ہے سمجھا ہوا بے داد گر

(بند۷)

مسلمان اور تعلیم جدید:

جو راہ پیا دشت کے آفات سے غافل رہے  
اب تک وہ اپنی شوئی تقدیر پر ہیں نوحہ گر ۵

بالِ جبریل

☆ کیا نہ پیر حرم نے مجھے شریکِ طواف  
مرے جنوں کی نگاہوں میں تھا حرم کا غلاف  
☆ حرم کے حق میں مری کافری مبارک ۹  
کہ متفق ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف  
(غزل ۶۰، ص ۷۸)

یہاں سکین صفحہ آئے گا

## ذوق و شوق:

- ☆ قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں  
 ۱۰ فکر و سکوت کا جہاں، نور کا بحر بے کراں
- ☆ زیرِ حجاب و آشکارا پردگیانِ ہست و بود  
 ۱۱ ماہِ صد ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
- ☆ ہیضمِ نیم سوزِ ادھر، ٹوٹی ہوئی طنابِ ادھر  
 ۱۲ اُکھڑے ہوئے خیام کے باقی ہیں اب تلک نشاں  
 (بند، ص ۱۱۱)°
- ۱ مشرقیوں کو پھر وہی جذبِ قلندرانہ دے  
 ۱۳
- ۲ جذبِ قلندرانہ دے، زورِ غضنفرانہ دے  
 ۱۴ فقر سے ننگ و عار کچھ، مردِ غیور کو نہیں  
 نانِ جوئی قبول ہے، ضربتِ حیدرانہ دے
- ۳ معجزہ نگاہ سے پست کو پھر بلند کر  
 سوزِ دروں زیادہ کر، قوتِ قاہرانہ دے
- ۴ چوبِ کلیم کر عطا، سحرِ فرنگیانہ توڑ  
 ۱۵ مومنِ پاک باز کو عزمِ پیہرانہ دے
- ۵ ہیں جو فسونی فرنگ، ان سے نگہ نہ رکھ درلغ  
 اور فقیہ شہر کو شیوہِ دلبرانہ دے
- ۶ غرب میں قتنہ یہود، شرق میں جنبشِ ہنود  
 مومنِ پاک باز کو عزمِ پیہرانہ دے

○ بالمقابل عکس میں، آخری تین اشعار (شوق یگانہ رو.....) کا متن، مضمون ماسبق میں ”ذوق و شوق“ کے تحت دیا جا چکا ہے۔

یہاں سکین صفحہ آئے گا

- ۷ آب و ہوائے شہر سے شعلہٴ زندگی ضعیف  
 ۶ خوگرِ کوہ و دشت کو طبعِ غنفرانہ دے  
 ۸ چشمِ کرشمہ ساز کھول، مجزہٴ نگاہ دیکھ  
 بزم میں ایک بار پھر گرمی لا الہ دیکھ

### ضربِ کلیم

ناظرین سے:

☆ لازم ہے تجھ کو نعمتِ شیریں سے اجتناب  
 جب تک ترا زُجاج نہ ہو محکمٰی میں سنگ

(شعر ۲)

جہاد:

☆ شیخِ حرم کو اہلِ کلیسا سے ہے نیاز کلا  
 آخر نموش کیوں ہے یہ نقادِ نیروشر؟ ۱۸

امامت:

☆ آہ، واقف نہیں تو سرِّ امامت سے ابھی  
 تیرے سینے کو خدا محرمِ اسرار کرے ۱۹

اشاعتِ اسلام، فرنگستان میں:

فرنگیوں میں اشاعت، زمانہ سازی ہے  
 یہ شاطرانِ سیاست کی مہرہ بازی ہے ۲۰

(آخری شعر)

حجاب: (یہ ایک مکمل متروک نظم یا قطعہ ہے)

فروغِ طبعِ نسوانی، خود آرائی و پیدائی اسی سے عالمِ تہذیب کی بڑھتی ہے پہنائی  
 رہے حدیں، تورشن ہے شبتانِ حیات اس سے گزر جائے اگر حد سے، تو ہے فطرت کی رسوائی

یہاں سکین صفحہ آئے گا

نہ ہو بے قید، بے قیدی فسادِ زندگی ہے  
یہ فطرت ہے تو زینت کا چھپانا عینِ دانائی

کارل مارکس کی آواز:

فرنگ کا علم و فن ہے خونی، تجھے بھی خونی بنا رہا ہے  
۲۱ کہ تیری عقلِ بہانہ جو سے، گناہ اپنے چھپا رہا ہے

محراب گل افغان کے افکار:

تہذیبِ فرنگی سے خدا تجھ کو بچائے  
شام اس کی ہے روشن، نہ سحرِ صاحبِ پرتو

(جزو ۵، شعر ۲)

☆ اس قوم سے مشکل ہے، مسجد کی نگہبانی ۲۲  
ہے جس کی نمازوں سے، محرابِ ٹرش اُبرو

(جزو ۱۲، شعر ۲)

آتا نہیں راس ان کو، نظارہٴ سرو و گل  
پلتے نہیں گلشن میں شیرانِ عینتانی

(جزو ۲۰، شعر ۴)

### ارمغانِ حجاز

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ:

عالمِ افکار میں، مثلِ سرافیل اس کا صُور  
عالمِ کردار میں یزداں فریب، آدمِ شکار

(پانچواں مشیر، شعر ۷)

تربیت جس کی کرے میری نگاہِ تند و تیز  
کون کر سکتا ہے اس تہذیب کو بے آبرو

(ابلیس اپنے مشیروں سے، شعر ۳)

## حوالے اور حواشی

۱- اس کی کسی قدر تفصیل اصلاحاتِ اقبال (مرتب: محمد بشیر الحق دیسوی۔ پٹنہ، ۱۹۵۰ء) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۲- کلیاتِ باقیات: واں بھی مقصود وہی..... (ص ۳۷۴)

۳- اس مصرعے کی ابتدائی صورت یہ تھی:

بُت شکن کے دل کی بہتی میں صنم خانے رہے

بت شکن کی دل..... (ص ۳۸۰)

۴- اس شعر نے بالآخر، نظم کے موجودہ معروف شعر (واے ناکامی متاع کارواں.....) کی صورت اختیار کی۔

۵- کلیات:..... میرے ہر ذرے اگر (ص ۳۸۱)

۶- اس شعر کی اولین صورت یہ تھی:

زندگی بلبل کی ہو جیسے چمن کے واسطے

جلتی ہے ہر شمع، اپنی انجمن کے واسطے

۷- اس شعر نے بالآخر یہ شکل اختیار کی:

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی

مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے

(بانگِ درا، ص ۲۱۹)

۸- کلیات:..... پر ہیں نوحہ گر (ص ۳۹۴)

۹- ان اشعار نے نظر ثانی میں یہ شکل اختیار کی: ۷

کمالِ جوش جنوں میں رہا میں گرمِ طواف

خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

یہ اتفاق مبارک ہو، مومنوں کے لیے

کہ یک زباں ہیں، فقہیانِ شہر میرے خلاف

(بالِ جبیریل، ص ۷۸)

۱۰- اس شعر کا مصرعِ اوّل، متداول کلام میں موجود ہے۔ (بالِ جبیریل، ص ۱۱۱)

۱۱- یہ، ”ذوق و شوق“ کے دوسرے شعر کی ابتدائی صورت ہے۔



- ۱۲- اس شعر نے مندرجہ ذیل متداول شعر کی صورت اختیار کی:
- آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر  
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں  
(بالِ جبریل، ص ۱۱۱)
- ۱۳- اوّلین صورت: راہِ نشیں فقیر کو طرح قلندرانہ دے  
دوسری صورت: مشرقیوں کو پھر وہی خوئے قلندرانہ دے  
۱۴- اوّلین صورت: جذبِ قلندرانہ دے، ہیبتِ نادرانہ دے  
۱۵- کلیات میں شعر ۳، اور ۴ کا متن اس طرح ہے:
- معجزہ نگاہ سے پست کو پھر بلند کر  
طفلیکِ نیمہ دوز کو ہیبتِ نادرانہ دے  
چوبِ کلیم کر عطا، سحرِ فرنگیانہ توڑ  
سوزِ دروں زیادہ کر، قوتِ قاہرانہ دے
- غالباً کلوروی صاحب نے یہ حصہ، بالِ جبریل کی کسی دوسری بیاض یا مسودے سے نقل کیا، جو مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ جس متن تک راقم کی رسائی ہوئی، وہ اقبال کا دستِ نوشت ہے (اس کا عکس آئینہ صفحے پر دیا جا رہا ہے) غالباً یہ متن کلوروی صاحب کی نظر سے نہیں گزرا۔
- ۱۶- بالِ جبریل کے ایک مسودے میں شعر ۶، اور ۷ موجود ہیں۔ غالباً بعد میں ایزاد کیے گئے۔
- ۱۷- نظر ثانی میں یہ مصرع یوں تبدیل کیا گیا: ”کیا مصلحت ہے شیخِ کلیسا نواز کی“۔ نظر ثالث میں اسے حتمی صورت دی گئی: ”ہم پوچھتے ہیں.....“ (ضربِ کلیم، ص ۲۸)
- ۱۸- یہ مصرع ابتدا میں اس طرح تھا: ”خاموش کیوں ہوا ہے یہ نقادِ خیر و شر“۔ آخر میں دوسرا مصرع قطعی ترک کر کے بالکل نیا (متداول) مصرع شامل کیا گیا: ”مشرق میں جنگ.....“
- ۱۹- بعد ازاں اس شعر نے نظم (امامت: ضربِ کلیم، ص ۴۹) کے شعراؤں کی صورت اختیار کی۔
- ۲۰- اس کی اوّلین صورت یہ تھی:
- یہ مسجدیں، یہ اشاعت؟ زمانہ سازی ہے  
یہ شاطرانِ سیاست کی شیشہ بازی ہے  
اس شعر کی اوّلین صورت یہ تھی:

میں جانتا ہوں یہ عصرِ خوئی، تجھے بھی خوئی بنا رہا ہے  
کہ فیضِ عقلِ بہانہ جو سے، گناہ اپنے چھپا رہا ہے

یہاں سکین صفحہ آئے گا

۲۲- اس مصرعے کی دوسری صورت یہ تھی:

کس منہ سے کریں دعوے، منبر کی حفاظت کا

(اورینٹل کالج میگزین، لاہور۔ شمارہ خاص، حصہ دوم، جلد ۵۸، شمارہ مسلسل ۳۳۰، مارچ

۱۹۸۳ء۔ نظر ثانی، اضافہ اور ترمیم و تصحیح: ۱۶ مئی ۲۰۰۰ء)



## غیر مطبوعہ رقعات بنام پرویں رقم

علامہ اقبال اپنے شعری مجموعوں کی کتابت و طباعت کے سلسلے میں خاصا اہتمام کرتے تھے۔ اسرارِ خودی (اشاعت: ۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء) اور رموزِ بے خودی (۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء) حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کی نگرانی اور اہتمام سے شائع ہوئیں۔ بانگِ درا (ستمبر ۱۹۲۳ء)، بالِ جبیل (جنوری ۱۹۳۵ء) اور ضربِ کلیم (جولائی ۱۹۳۶ء) کے پہلے ایڈیشنوں کے ناشر علی الترتیب ممتاز علی اینڈ سنز لاہور، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور اور کتب خانہ طلوع اسلام لاہور تھے۔ بعد ازاں اقبال نے اپنی جملہ تصانیف کی طباعت و اشاعت کا کام لاہور کے معروف ناشر شیخ مبارک علی کے سپرد کر دیا تھا۔ شعری مجموعوں کی کتابت بالالتزام وہ خود کراتے اور کاپیوں کی تصحیح کے بعد، انھیں ناشر کے سپرد کر دیتے۔ اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کی کتابت منشی فضل الہی مرغوب رقم نے کی، مابعد شعری مجموعوں کی کتابت کے لیے علامہ اقبال نے عبدالمجید کاتب [بعد ازاں پرویں رقم] کا انتخاب کیا۔ جنھوں نے رموزِ بے خودی (۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء) سے کلامِ اقبال کی کتابت کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ برس تھی۔

منشی عبدالمجید کا تعلق ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ کے ایک خطاط گھرانے سے تھا۔ والد مولوی عبدالعزیز اور دادا مولوی پیر بخش ایمن آبادی بھی معروف خوش نویس تھے۔ عبدالمجید ۱۹۰۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر فارسی کی بعض

کتا میں پڑھیں۔ خوش نویسی کی طرف بیٹے کا فطری میلان دیکھ کر والد نے انھیں لاہور کے نام ور خطاط نستعلیق حافظ نور احمد صاحب کے سپرد کر دیا۔

عبدالحمید خوش نویس نے اپنے میلان طبع اور محنت و شوق کے سبب بہت جلد خطاطی سیکھ لی اور باقاعدہ کتابت کرنے لگے۔ انھوں نے مرزا امام ویروی (م: ۱۸۸۸ء) کے کتبوں اور قطعات کے تنقح میں خط نستعلیق میں مہارت بہم پہنچائی۔ پھر اپنے خاندانی و شخصی اسلوب خط اور امام ویروی کے طرز نگارش کی آمیزش سے عبدالحمید نے ایک خاص اسلوب پیدا کیا۔ جسے اس دور کے خوش نویسوں کے ہاں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق نوآموز کاتب، ان کے لکھے ہوئے اشتہار، دیواروں سے اتار لے جاتے تھے اور انھیں سامنے رکھ کر خطاطی کی مشق کرتے۔۔۔ بقول سید انور حسین نفیس رقم: 'یہ حقیقت ہے کہ اس دور کا ہر چھوٹا بڑا خطاط، پرویں رقم کے اسلوب نستعلیق سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہے۔۔۔ اپنے دور کے اس بے مثل خطاط نے ۴/۱۱ اپریل ۱۹۲۶ء کو لاہور میں انتقال کیا۔'

اوپر ذکر آچکا ہے کہ رموزِ بے خودی (طبع اول: ۱۰/۱۱ اپریل ۱۹۱۸ء) علامہ اقبال کی پہلی کتاب ہے، جسے پرویں رقم نے کتابت کیا (اس وقت تک وہ پرویں رقم نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے کتاب پر نام 'عبدالحمید' لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اپنے نام کے ساتھ پرویں رقم، لکھنا شروع کیا۔ بانگِ درا کے تیسرے ایڈیشن (مارچ ۱۹۳۰ء) پر پہلی بار عبدالحمید کے ساتھ پرویں رقم نظر آتا ہے)۔ بعد ازاں پیام مشرق (۱۹۲۳ء)، بانگِ درا (۱۹۲۴ء)، مسافر (۱۹۳۴ء)، بالِ جبریل (۱۹۳۵ء) اور ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸ء) کے پہلے ایڈیشنوں کی کتابت بھی پرویں رقم نے کی، البتہ زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) اور ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) کے ایڈیشن بعض دوسرے خوش نویسوں کے قلم سے ہیں۔ غالباً پرویں رقم کی علالت، یا ان ایام میں لاہور میں ان کی غیر موجودگی کے سبب ایسا ہوا، ورنہ علامہ اقبال کے نزدیک وہ لاہور کے سب سے بہتر کاتب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متذکرہ بالائینوں مجموعوں کی دوسری اشاعتوں کی

غیر مطبوعہ رقعات بنام پرویں رقم

کتابت پرویں رقم ہی سے کرائی گئی۔ ان میں سے جاوید نامہ کی کتابت وہ مکمل نہ کر سکے۔ طبع دوم [فروری] ۱۹۴۷ء کے دو صفحات ان کے قلم سے ہیں۔ باقی صفحات غالباً بن پرویں رقم نے کتابت کیے۔

علامہ اقبال اپنے مجموعوں کی کتابت اپنی نگرانی میں، خصوصی ہدایات کے تحت کراتے تھے۔ ابتدا میں یہ ہدایات ناشر کے توسط سے دی جاتی تھیں۔ بعد ازاں براہ راست خوش نویس کو ہدایات دیتے۔ پرویں رقم کے نام ذیل کے تین رقعات اسی سلسلے میں تحریر کیے گئے۔

یہ رقعات، بالِ جبویل کے پہلے ایڈیشن کی کتابت کے موقع پر لکھے گئے۔ ان پر سنہ درج نہیں۔ تاریخ (۱۷ ستمبر) صرف دوسرے رقعے پر ہے۔ بالِ جبویل کی کتابت ۹ ستمبر ۱۹۳۴ء کو شروع ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے یہ تینوں رقعات ۱۹۳۴ء کے ہیں۔ پہلا رقعہ ۱۲، ۱۵ ستمبر کا ہے دوسرا ۱۷ ستمبر کا، اور تیسرا رقعہ اواخر ستمبر کا معلوم ہوتا ہے۔ تینوں رقعات علامہ اقبال میوزیم، جاوید منزل لاہور میں محفوظ ہیں۔

۱

علامہ اقبال نے بالِ جبویل کے مسودے کے ساتھ کاتب صاحب کو بعض رباعیات بھی دی تھیں، تاکہ جن غزلوں کے آخر میں جگہ بچ جائے، وہاں رباعیات لکھ دی جائیں۔ جب پہلی دو کا پیاں (۱۶ صفحات) کتابت ہو کر ان کے پاس آئیں تو دیکھا کہ غزل نمبر ۷ (۷ دگرگوں ہے جہاں.....) کے اختتام پر جگہ بچ گئی ہے، چنانچہ انھوں نے ایک اور رباعی اس ہدایت کے ساتھ ارسال کی کہ اسے صفحہ ۱۶ پر لکھ دیا جائے۔ یہ رقعہ اسی سلسلے میں ہے:

[ ستمبر ۱۹۳۴ء ]

جناب پرویں رقم صاحب

صفحہ ۱۶ پر جو جگہ رباعی کے لیے خالی ہے، وہاں مندرجہ ذیل رباعی لکھیے:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں  
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں  
جہاں بنی مری فطرت ہے لیکن  
کسی جشید کا ساغر نہیں میں

محمد اقبال

۲

بال جبریل کی کتابت شدہ تیسری کاپی (صفحات ۱۷-۲۴) واپس کرتے ہوئے اس رقعے کے ذریعے علامہ نے تین رباعیات ارسال کیں۔ غالباً اس وقت مزید کوئی رباعی موجود نہیں تھی، اور فوری طور پر موزوں بھی نہ ہو سکی۔ چوتھی رباعی (ب) عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر) بعد میں بھیجی گئی ہوگی۔

۱۷ ستمبر [۱۹۳۴ء]

جنابِ کاتب،

امید ہے کہ جو رباعی میں نے آپ کو ارسال کی تھی، وہ آپ نے صفحہ ۱۶ پر لکھ دی ہوگی۔ اس کاپی میں (جو واپس کر رہا ہوں) چار جگہیں خالی ہیں، ان کو بھی پُر کرنا ہے، اس واسطے مندرجہ ذیل تین رباعیاں بھیجتا ہوں۔ ان کو بھی اس کاپی میں لکھ دیں۔ اس خط کا جواب لکھیں۔ جو جگہیں اور خالی رہ جائیں، اُن کے لیے اور رباعیاں بھیجوں گا، کیونکہ خالی جگہ بُری معلوم ہوتی ہے۔

(۱)

وہی اصل مکان و لامکان ہے      مکان کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے  
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے      اگر ماہی کہے، دریا کہاں ہے



(۲)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق  
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

(۳)

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور و انجمن عشق  
کبھی سرمایہ محراب و منبر کبھی مولا علیٰ خیر شکن عشق  
محمد اقبال

۳

ذیل کا رقعہ چند یوم بعد کا ہے، اندازاً ۲۰، ۲۱ ستمبر کا۔ اس میں اُس چوتھی رباعی  
(۳ عطا اسلاف کا جذب دروں کر) کے علاوہ، جس کا وعدہ ۱۷ ستمبر کے رقعے میں کیا گیا  
تھا، مزید چار رباعیاں بھیجی گئیں، جو بالترتیب صفحہ ۲۶، ۲۸، ۳۲ اور ۱۲۵ پر درج کی گئیں۔

جنابِ کاتب،

میں اس سے پہلے شاید چار رباعیاں بھیج چکا ہوں۔<sup>۸</sup> پانچ آج بھیجتا ہوں کل نو  
رباعیاں ہوں، مگر ان میں سے آپ نے ابھی تک ایک بھی درج نہیں کی۔ مہربانی کر کے  
جب پہلا حصہ ختم ہو جائے، تو سب کا سب میرے پاس ارسال کریں، تاکہ میں دیکھ لوں  
کہ رباعیاں کہاں کہاں درج ہوئی ہیں۔ آپ کے لکھنے کی رفتار بہت سست ہے۔ ۲۶ یا ۲۷  
سطر یومیہ اوسط ہے۔ اگر یہ حال رہا تو کتاب مشکل سے ختم ہوگی۔ میرے خیال میں آپ کو  
کم از کم ایک کا پی روز لکھنی چاہیے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔<sup>۹</sup>

محمد اقبال

یہاں سکین صفحہ آئے گا

(۱)

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر شریکِ زمرہ لا یحزنون کر  
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(۲)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے  
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

(۳)

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے  
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے خرد بیزار دل سے، دل خرد سے

(۴)

یہی آدم ہے سلاطینِ بحر و بر کا کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا  
نہ خود ہیں، نئے خدا ہیں، نئے جہاں ہیں یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

(۵)

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے اسی سے ریشہٴ معنی میں نم ہے  
اگر کوئی شعیب آئے میسر شہانی سے کلیسی دو قدم ہے نہ  
محمد اقبال

مندرجہ بالا رقعات کے حوالے سے یہاں دو باتوں کی طرف مختصراً اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ اول: علامہ اقبال نے اپنے جن اشعار کو 'رباعیات' قرار دیا ہے، وہ رباعی کے مخصوص اوزان میں نہیں، اس لیے بعض اہل نقد کے نزدیک انھیں 'رباعیات' کے بجائے قطعات کہنا چاہیے۔<sup>۱۱</sup>

دوم: کلیاتِ اقبال، اُردو (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۳ء) کی کتابت کے موقع پر مذکورہ رباعیات یا قطعات کو غزلوں سے علاحدہ کر کے، ایک الگ حصے میں 'رباعیات' کے زیر عنوان جمع کر دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ترتیب میں یہ تبدیلی اور تصرف بالکل نامناسب ہے۔ بے شک علامہ نے پرویں رقم کے نام درج بالا رقعات میں قطعات کو 'رباعیات' کہا ہے، مگر بال جبریل میں انھوں نے یہ عنوان قائم نہیں کیا۔ قطعات [یا 'رباعیات'] کا حصہ بلا عنوان ہے۔ ضروری تھا کہ کلام کی وہی ترتیب برقرار رکھی جاتی، جو پرویں رقم کے کتابت کردہ نسخوں میں ہے، کیونکہ 'غزلیات' و 'رباعیات' [یا قطعات] کی یہ ترتیب علامہ اقبال کے حسب ہدایت تھی، اور ان کی وفات کے بعد، اس سے ہٹ کر متنِ اقبال کی ترتیب میں کسی طرح کی تبدیلی یا تقدیم و تاخیر قطعی جائز نہیں ہے۔

### حوالے اور حواشی

- ۱- 'پرویں رقم' کا خطاب غلام رسول نے تجویز کیا تھا، یہ ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔ (غیر مطبوعہ مکتوب محمد عالم مختار حق، ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۵ء، بنام رفیع الدین ہاشمی)
- ۲- شریف گلزار: 'خطاطی' در: کتاب لاہور، نومبر ۱۹۸۱ء، نیز، دیکھیے: "صوفی عبدالجید پرویں رقم" تحقیق: غلام سرور راہی، تحریر: وحید احمد۔ روزنامہ امروز لاہور، ۱۷ اپریل ۱۹۸۵ء۔
- ۳- دیکھیے: محمد عالم مختار حق کا مضمون: 'نوادیر پرویں رقم' در: ماہنامہ الرشید لاہور، اپریل ۱۹۹۵ء۔ موصوف نے کمال محنت و جاں فشانی سے پرویں رقم کی کتابت کردہ کتابوں، رسالوں، قطعات، کتبوں، اشتہاروں، پوسٹروں، بورڈوں، مخطوطوں، پتھروں وغیرہ کی ایک جامع اور مفصل فہرست مرتب کی ہے۔
- ۴- مفصل حالات کے لیے دیکھیے: محمد عالم مختار حق کے مضامین، الرشید لاہور، اکتوبر ۱۹۹۲ء اور دسمبر ۱۹۹۲ء۔
- ۵- ایک خط میں لکھتے ہیں: 'عبدالجید کا تب..... میرے نزدیک لاہور میں سب سے بہتر ہے'۔ (خطوطِ اقبال بنام بیگم گرامی، مرتب: حمید اللہ شاہ ہاشمی، محبوب بک ڈپو فیصل آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۶۱) تاہم اقبال سے منسوب یہ قول بے بنیاد ہے کہ: 'پرویں رقم میرے اشعار کی کتابت نہیں کریں گے، تو

غیر مطبوعہ رقععات بنام پرویں رقم

میں شاعری ترک کر دوں گا۔ (جنگ لاہور، کیم اکتوبر ۱۹۸۱ء) غلام سرور راہی نے یہی بات قدرے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے: 'اگر پرویں رقم میری کتابوں کی خطاطی چھوڑ دیں تو میں شاعری ترک کر دوں گا' (امروز لاہور، ۵ اپریل ۱۹۸۵ء)۔ پرویں رقم کو علامہ کے خراج تحسین کے ضمن میں ایک اور روایت شریف گلزار کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے انھیں 'خطاط مشرق' کا خطاب دیا تھا۔ (کتاب لاہور، نومبر ۱۹۸۱ء) بلاشبہ، اقبال پرویں رقم کے بہت مداح تھے مگر بلاسند کی یہ بات قبول کرنے میں ہمیں تاثر ہے۔

۶- ملاحظہ کیجیے: اقبال کے تین رقععات بنام شیخ مبارک علی، مضمولہ: انوارِ اقبال، ص ۱۷۱-۱۷۳۔ یہ رقععات پیام مشرق طبع دوم کی کتابت کے سلسلے میں لکھے گئے۔ بشیر احمد ڈار کا یہ قیاس درست نہیں کہ یہ طبع اول کی کتابت سے متعلق ہیں، کیوں کہ 'خردہ' طبع اول میں موجود نہیں، دوسری اشاعت میں شامل کیا گیا۔

۷- تصانیفِ اقبال، ص ۲۹۔

۸- جو پہلے دو رقععات میں مذکور ہیں۔

۹- ۲۶، ۲۷ سطر تقریباً پانچ صفحات بنتے ہیں۔ علامہ اقبال، پرویں رقم کی اس رفتار کار سے مطمئن نہ تھے، اور چاہتے تھے کہ کم از کم آٹھ صفحات (ایک کاپی) روزانہ لکھے جائیں۔

۱۰- اس آخری رباعی کے لیے کسی غزل کے آخر میں جگہ نہ نکل سکی، اس لیے یہ آگے چل کر نظم 'دعا' کے اختتام پر بیچ جانے والی جگہ (ص ۱۲۵) درج کی گئی۔

۱۱- دیکھیے: ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون: در: تنقید و تحقیق۔ قمر کتاب گھر کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۲-۱۶۸۔ نیز، بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر صدیق جاوید۔ القمر انٹرنیشنلز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۲۷-۲۳۲۔



## اقبال صدی کی سوانح عمریاں

علامہ اقبال کا اولین سوانح نگار کون ہے؟

اب تک کی دید و دریافت کے مطابق ان پر قدیم ترین مضمون شیخ عبدالقادر کا ہے جو مدیر خدنگ نظر کی فرمائش اور اصرار پر لکھا گیا اور مئی ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔<sup>۱</sup> یہ مضمون سوانحی ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی بھی ہے، اس میں اقبال کی شاعری کے کم و کیف پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ شیخ صاحب نے بعد ازاں بھی اقبال پر متعدد مضامین قلم بند کیے۔<sup>۲</sup>

دوسرا مضمون محمد دین فوق کا ہے جو اپریل ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں چھپا۔ فوق نے بعد ازاں اس میں اضافے کیے اور یہی اضافہ شدہ مضمون نیبرنگ خیال کے اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں شامل ہے۔<sup>۳</sup> اقبال کی سوانح نگاری کی بنیاد انھی دو مضامین پر اٹھائی گئی ہے۔

علامہ اقبال کی زندگی میں، اُن پر مضامین تو بہت شائع ہوئے، لیکن کوئی سوانحی کتاب یا باقاعدہ سوانح عمری نہیں لکھی جاسکی۔ اُن کی وفات کے کوئی ہفتہ بھر بعد، جاوید منزل میں ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کی صدارت میں منعقدہ ایک اجلاس میں، 'مجلس اقبال' کا قیام عمل میں آیا۔ غلام رسول مہر نے انقلاب (یکم مئی ۱۹۳۸ء) کے ادارے میں لکھا:

ہم اس مرحلے پر اس مجلس کے محترم ارکان کی خدمت میں کام کا پروگرام پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، لیکن ایک بات عرض کر دینا ضروری ہے۔

اقبال کے خیالات و افکار کی اشاعت کا پہلا بنیادی و اساسی کام یہ ہے کہ مرحوم کی ایسی سوانح عمری تیار ہو جائے، جو اُن کے خیالات و افکار اور تعلیمات و پیغام کی بنیادی حقیقتوں کا روشن آئینہ ہو۔

اگر ہماری گزارش کو غیر مناسب نہ سمجھا جائے تو ہم عرض کریں گے کہ اس کام کی بجآوری کا آج صرف ایک شخص حقیقی اہل ہے، وہ چودھری محمد حسین صاحب ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ ہیں۔ اُن سے بڑھ کر (اقبال مرحوم) کی معیت کسی دوسرے شخص کو نصیب نہیں ہوئی اور اُن سے بڑھ کر اقبال کے خیالات و افکار اور پیغام کی اساسیات سے معرفت کا کوئی دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ جو کام ہو، وہ یا تو چودھری صاحب ممدوح کے ہاتھوں انجام پائے یا براہ راست اُن کی نگرانی میں ہو۔

افسوس ہے، مہر صاحب کی تمنا بروے کار نہیں آسکی۔ نہ تو چودھری محمد حسین (م: ۱۶ جولائی ۱۹۵۰ء) سوانح اقبال لکھ سکے اور نہ مہر صاحب اس کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ البتہ بعض دیگر اہل قلم اس طرف متوجہ ہوئے اور اقبال کے سوانح پر متعدد کتابیں لکھی گئیں مثلاً: سوانح اقبال (طالب فارسی لکھنوی، لاہور، ۱۹۳۸ء) حیات اقبال [چراغ حسن حسرت] لاہور، ۱۹۳۸ء)۔۔۔۔۔ سیوت اقبال (محمد طاہر فاروقی، لاہور، ۱۹۳۹ء) اور اقبال کامل (عبدالسلام ندوی، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء) مگر یہ سب علامہ کی مطلوبہ سوانح عمری کی ضرورت پوری کرنے سے قاصر رہیں۔<sup>۵</sup>

## ۱

گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کی تحریک پر اگست ۱۹۵۱ء میں بزم اقبال لاہور نے تدوین سوانح کے لیے سعی و کوشش شروع کر دی اور اس سلسلے میں بزم اقبال نے غلام رسول مہر کی سربراہی میں تین چار اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی تاکہ وہ ایسے لوگوں سے



اقبال صدی کی سوانح عمریاں

مل کر معلومات جمع کرے، جو کبھی اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں۔ طے ہوا کہ روایات کو مہر صاحب بالفاظِ راویانِ قلم بند کریں گے۔ اس طرح روایات کی پانچ کاپیاں تیار ہو گئیں۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں تدوین سوانح کے لیے مہر کا نام تجویز ہوا، جنہوں نے ایک سال تک یہ کام انجام دینے کا وعدہ کیا مگر ان کی (نہایت معقول) شرائط منظور نہ کی گئیں۔ چند ماہ بعد لوازمے کی پانچوں کاپیاں عبدالمجید سالک کے سپرد کر دی گئیں جنہوں نے تقریباً ایک تہائی کم معاوضے پر، مہر صاحب کی مجوزہ ضخامت کے مقابلے میں نصف ضخامت کی سوانح، بہ عنوان ذکرِ اقبال چھ سات ماہ میں تیار کر دی۔<sup>۱۲</sup>

ذکرِ اقبال اقبال کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری ہے، مگر اس کی اشاعت پر شورش کاشمیری، بشیر احمد ڈار، فقیر سید وحید الدین، عبدالواحد معینی، اور خالد نظیر صوفی کے علاوہ، اقبال کے عام قارئین نے بھی شدید بے اطمینانی کا اظہار کیا۔<sup>۱۳</sup> ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے نام مولانا مہر کے بعض خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذکرِ اقبال ان کی نظر میں بھی نہیں چلے گی، اور اس سے سوانحِ اقبال کی تحریر و تسوید کے لیے، ان کا دیرینہ عزم تازہ ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

عزیزی جاوید اقبال کو میری دعا پہنچائیے۔ میں صرف ان کی مراجعت کے انتظار میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سوانحِ حیات کی تسوید روکے بیٹھا ہوں۔ خدا کرے وہ جلد آ جائیں، تاکہ ان کے مشورے اور استفادے کے بعد، میں کتاب مرتب کر دوں۔ افسوس ہے کہ اس عظیم الشان ہستی کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا جانا چاہیے تھا، نہیں لکھا جا سکا۔ چودھری محمد حسین خدا کو پیارے ہو گئے۔ جاوید نے لمبی مدتِ ولایت میں گزار دی۔ میرے سامنے جو کچھ ہے، اگر وہ پورا نہ ہو سکا، تو پھر اسے کون پورا کرے گا؟<sup>۱۴</sup> (۱۷ فروری ۱۹۵۶ء)

اقبال اور ابوالکلام کے متعلق --- بیسیوں کتابیں نکل چکی ہیں، اور ایک بھی ایسی نہیں، جس میں ایک حد تک حق ادا کیا گیا ہو، بلکہ میرے نزدیک تو ساری کتابیں مل کر بھی ادا نہیں کر سکتیں۔ جو شخص بھی پچاس ساٹھ سال بعد کچھ لکھے گا، وہ مواد کہاں سے لائے گا؟ اگر ہم معلومات کو سمیٹتے

ہوئے قبر میں لے جائیں گے تو کل اس کے لیے ماخذ کیا کام دے سکیں گے، جو بیشتر جعل و سخن طرازی کا ہدف بن چکے ہیں، اور اصلیت پر تو پردے ڈال دیے گئے ہیں۔ میرے پیش نظر دونوں کے متعلق لکھنے کی جو چیزیں ہیں، وہ اور ہیں، اور آپ یقین رکھیں کہ ان میں وہ بحثیں ہرگز نہ آئیں گی، جو آپ کے لیے نظر اول میں پریشان کن ثابت ہوئیں۔<sup>۱۴</sup> (۱۰ اپریل ۱۹۵۶ء)

خیال رہے کہ عین انھی دنوں ہفت روزہ اقدام میں ذکرِ اقبال کے متعلق بحث جاری تھی۔ مدیر اقدام نے اپنے ایک نوٹ میں ذکرِ اقبال پر تنقید کی تھی۔ یکم اپریل اور ۸ اپریل کی اشاعتوں میں قارئین کا ردِ عمل شائع ہوا۔ پانچ خطوط سالک کے خلاف اور تین حمایت میں تھے۔ ان میں ذکرِ اقبال کو ایڈٹ کرنے اور نئی سوانح عمری کے لیے نذیر نیازی، حکیم محمد حسن قرشی، راجا حسن اختر اور جاوید اقبال پر مشتمل ایک بورڈ بنانے کی تجویز کے ساتھ، ایک رائے یہ بھی تھی کہ: 'یہ کام مولانا غلام رسول مہر کے سپرد کیا جاتا تو بہتر تھا'۔<sup>۱۵</sup>

معلوم ہوتا ہے کہ خود مہر صاحب کے اپنے ذہن میں بھی کھد بکھد جاری تھی۔ سوانح اقبال کا موضوع برابر انھیں اُکساتا (اور haunt کرتا) رہا، اور وہ اس خیال کو رو بہ عمل لانے اور اس کام میں عملاً مصروف ہو جانے کے لیے تیار ہوتے رہے۔ تقریباً تین سال بعد، ۱۹۵۹ء میں مہر صاحب نے ایک بار پھر اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا:

اقبال کے سلسلے میں بہت سے گراں قدر کام ہیں..... ان میں سے ایک نہایت اہم اور ضروری کام ان کی سیرت کا بھی ہے..... اب تک اپنے علم و ہنر کی بے ماگی دامن کش رہی، لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ اگر سالہا سال اس دریائے فضائل و مکارم کے کنارے گزار چکنے کے بعد، استفادہ و استفاضہ کا اپنا حق بھی ادا نہ ہو سکا، تو یہ مجرمانہ کوتاہی ہوگی۔<sup>۱۶</sup>

بلاشبہ مولانا مہر، اقبال کے موزوں ترین سوانح نگار ہو سکتے تھے، مگر اسے اقبالیات کی بد قسمتی کہیں یا حالات کی ستم ظریفی کہ مہر صاحب کے اوقات اور صلاحیتیں جنرل سر عمر حیات ٹوانہ جیسے لوگوں کی سوانح (اشاعت ۱۹۶۵ء) لکھنے میں صرف ہوتی رہیں، اور سوانح اقبال کی تحریر و تسوید کے لیے ان کی دیرینہ تمنا، خیال سے عمل تک کا مرحلہ، کبھی طے نہ کر سکی۔

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

اقبالیات کی اس اہم ترین ضرورت، (سوانح اقبال) کے ضمن میں آئندہ بیس برسوں میں ایک سٹاٹے کی کیفیت طاری رہی۔ اقبال صدی (۱۹۷۷ء) کے موقع پر ایک بار پھر اس کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اقبال کی سوانح عمری کون لکھے؟ ”نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال“ نے کئی ناموں پر غور کیا، اور بالآخر یہ ذمے داری سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو سونپی گئی۔ بعض اصحاب نے اپنے طور پر، سوانح اقبال کے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کاوش کی۔ اس سلسلے میں اولیت کا اعزاز صابر کلوروی کی یادِ اقبال کو حاصل ہے۔ ازاں بعد، محمد حنیف شاہد کی مفکر پاکستان، ایم ایس نازکی حیاتِ اقبال اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی سرگذشتِ اقبال تقریباً ایک ہی زمانے میں تحریر کی گئیں۔

## ۲

اقبال صدی کے زمانے میں شائع ہونے والی سوانح عمریوں میں یادِ اقبال (صابر کلوروی) سب سے پہلے منظر عام پر آئی (اشاعت: اپریل ۱۹۷۷ء، شاہکار، لاہور)۔ حیاتِ اقبال سے متعلق واقعات و معلومات کے لحاظ سے یہ سوانح اقبال کا ایک خاصا جامع تعارف اور ان کی شخصیت کا ایک عمدہ نقش پیش کرتی ہے۔ مستقبل کے ایک اقبال شناس کی یہ اولین کاوش جریدی صورت میں چھپی، اس لیے اقبالیاتی حلقوں میں اس کا خاطر خواہ چرچا نہیں ہو سکا۔

یادِ اقبال کے بارے میں دو تین باتیں خوش آئند ہیں، اول: مؤلف نے اپنی تصنیف کسی ادعا یا بلند بانگ دعوے کے بغیر، بڑے انکسار کے ساتھ پیش کی ہے۔ دوم: مؤلف بعض تحقیق طلب روایات اور اختلافی امور سے سرسری نہیں گزرا اور محض انھیں دہرا دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تحقیق و تفحص سے کام لیتے ہوئے حتی المقدور کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، مثلاً: مسجد قرطبہ کی زیارت اور طوائف کے قتل کے واقعات وغیرہ۔ سوم:

علامہ اقبال سے مؤلف کی محبت و عقیدت واضح ہے، اور اس کا نقطہ نظر بھی ہمدردانہ ہے، مگر اس نے اپنے ہیرو کو فرشتہ نہیں بنایا اور نہ کوئی سانچا بنا کر اُس میں ہیرو کو فٹ کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم ناکافی معلومات اور بعض مآخذ تک رسائی نہ ہونے کے باعث سوانح نگار بعض الجھنوں کو دُور نہیں کر سکا، مثلاً: آرنلڈ کی شاگردی، داغ سے تلمذ اور ارشد گورگانی سے اصلاح، افغانستان کا سفر اور ایبٹ آباد کا سفر وغیرہ۔ صابر کلوروی نے یہ کتاب تحقیقی و تنقیدی نقطہ نظر سے نہیں لکھی، بلکہ اسے 'معمولی پڑھے لکھے آدمی کے لیے..... سیرت اقبال کو عام کرنے' کی ایک کوشش کے طور پر پیش کیا ہے، اور اس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ 'اختلافی مسائل' اہم ہے۔ صابر کلوروی کے ہاں اقبال سے عقیدت کے ساتھ، اُن پر محنت سے کام کرنے کی جو لگن نظر آتی ہے، اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر انھیں مناسب رہنمائی ملتی، اور وہ اس پر مزید کچھ عرصہ کام کرتے تو وہ اس سے کہیں بہتر کتاب لکھ سکتے تھے۔

### ۳

محمد حنیف شاہد کی مفکُو پاکستان پر سنہ اشاعت ۱۹۸۲ء درج کلا ہے مگر بعض قرائن، خصوصاً ان کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال صدی کے زمانے ہی میں اسے مکمل کر چکے تھے۔ مفکُو پاکستان کا محرک، علامہ سے مصتَف کی عقیدت، بلکہ 'عشق' ہے۔

'پیش لفظ' میں بتاتے ہیں کہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو خواب میں علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد، میں نے اقبال کے ایسے حالاتِ زندگی مرتب کرنے کا فیصلہ کر لیا، جو پہلے سے شائع شدہ کتابوں سے نہ صرف مختلف ہوں گے، بلکہ نہایت مستند، نہایت جامع اور نہایت مفصل ہوں گے۔۔۔ (ص ۹-۱۰)۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

یہ کتاب اس دعوے کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے کہ اب تک علامہ اقبال کی سوانح کے سلسلے میں

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

جو کتابیں چھپی ہیں، ان میں حالات و واقعات کے اعتبار سے مستند ترین، اور بالکل صحیح ماخذوں کو پہلی بار اپنے جلو میں لے کر نمودار ہو رہی ہے۔۔۔ علامہ اقبال کی زندگی کے وہ گوشے، جو ابھی تک ماہ و سال کی گردشوں کے باعث پردہٴ خفا میں تھے، ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی نجی زندگی (اور جملہ حالات، واقعات، اُن کی مختلف حیثیتوں اور خدمات وغیرہ) کا پس منظر، اور بے شمار ایسے واقعات، جو علامہ اقبال کے نام نہاد سیرت نگاروں، اور بہ زعم خود مصاحبوں کے علم ہی میں نہ تھے، صحیح حوالوں اور مستند تاریخوں کے ساتھ پہلی بار پیش کیے جا رہے ہیں..... یہ کوشش ملحوظ خاطر رہی ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کا کوئی پہلو، اور کوئی گوشہ نظر انداز نہ ہو۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سوانح عمری حرفِ آخر ہے، لیکن یہ کہنے میں باک نہیں کہ آج تک جتنی سوانح عمریاں چھپی ہیں، یہ ان سب سے منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

دیباچے سے یہ اقتباس ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ اس سے مصنف کے ذہن

اور رُزْم کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں مفکرِ پاکستان اقبال کی زیر نظر سوانح عمری کا موزوں نام نہیں بنتا۔ مفکرِ پاکستان ہونا علامہ کی محض ایک حیثیت ہے، اور وہ بھی اُن کی بعض دوسری حیثیات کے مقابلے میں کم تر اور ثانوی۔ اگر کتاب میں ان کی محض مفکرِ پاکستان کی حیثیت پر کلام کیا گیا ہوتا، تب یہ نام ٹھیک تھا۔ اگر کسی ایک حیثیت ہی کے پیش نظر نام رکھنا ہو، تو پھر اقبال: مفکرِ اسلام یا اقبال: ایک عظیم شاعر زیادہ موزوں نام ہے۔ بہر حال یہ سوانح عمری دس ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے چار ابواب کی حد تک مصنف نے ترتیبِ زمانی کو مد نظر رکھا ہے، مگر پانچویں باب سے آخر تک، عنوانات اور اُن کے تحت مباحث کی نوعیت موضوعاتی ہے۔ ان مباحث کے درمیان مصنف کہیں کہیں زمانی ترتیب بحال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً: پانچویں باب کا خاتمہ ۱۹۶۰ء کے ایک واقعے پر کرنے کے بعد، چھٹے باب کا آغاز وہ اقبال کے سفرِ حیدرآباد دکن سے کرتے ہیں، جو ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے، شاید اس لیے کہ پچھلے باب کا

ابتدائی حصہ (۱۹۰۹ء، ۱۹۱۰ء) کے واقعات پر مشتمل ہے۔ آٹھویں باب کا کوئی عنوان نہیں۔ اس میں وفاتِ اقبال کا ذکر کرنے کے بعد، کتاب میں سوانحِ اقبال کے متفرقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اگر ترتیب کی اس دورنگی یا دو عملی سے صرف نظر کر لیں، تو بلاشبہ مصنف کی محنت، کاوش و جستجو اور لوازم اور مسالے کی فراہمی، قاری کو متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے حیاتِ اقبال سے متعلق ذخیرہٴ اقبالیات میں موجود، جملہ معلومات اخذ و مقتبس کر کے، انھیں متعلقہ عنوانات کے تحت یکجا کر دیا ہے۔ ان کے ماخذ کا دائرہ وسیع ہے۔ سوانحِ اقبال میں انجمنِ حمایتِ اسلام کی قلمی رودادوں اور پنجاب گزٹ سے غالباً پہلی بار مدد لی گئی ہے۔ اس طرح بعض شواہد سے کچھ نتائج متعین کرنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ معلومات کی فراوانی، اقتباسات کی کثرت اور کوائف کی ثروت کے لحاظ سے مفکرِ پاکستان ایک پُر از معلومات کتاب ہے، مگر کیا سوانحِ عمری صرف معلومات و کوائف اور حقائق و واقعات کو جمع کر دینے کا نام ہے؟

ایک اچھی بیابگرانی میں حقائق و معلومات کی پیش کش بھی کسی نظم و ضبط کے تحت ہونی چاہیے۔ اگر ”زیادہ سے زیادہ“ کوائف کی جمع آوری اور تصنیف کو ”سیر حاصل اور جامع“ بنانے کے شوق میں، سوانح نگار ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم اور متعلق یا غیر متعلق میں تفریق و تمیز روا رکھنے کا قائل نہ ہو، اور نہ لوازم کی مناسب تدوین کی جائے تو ایسی کاوش نتیجہ خیز نہ ہوگی۔ اقبال کی وفات پر مصنف نے، اکابر کے تعزیتی پیغامات، ماتمی جلسوں کی خبروں اور قطعاتِ تاریخ و وفات کا بڑا حصہ کتاب میں شامل کر لیا ہے، جو بڑی تقطیع کے ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ حالانکہ یہاں زیادہ سے زیادہ دو چار صفحات میں، شعرا و اکابر کے جذبات کا ذکر کافی تھا۔

جناب محمد حنیف شاہد کی یہ کتاب پڑھتے ہوئے بسا اوقات کوئی تاثر نہیں بنتا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنی ذمہ داری کو فراہمی معلومات تک محدود رکھا ہے۔ طولِ طویل اقتباسات کے بعد تحلیل و تجزیہ، نقد و انتقاد اور اخذِ نتائج سے بالعموم گریز کیا گیا

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

ہے۔ مصنف کے بعض ریمارکس عجیب و غریب اور کچھ غیر ضروری ہیں، مثلاً: ص ۴۰۶ پر علامہ کے وصیت نامے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان کی عمر ۵۸ سال اور کچھ مہینے کی تھی۔ اس سن و سال کے آدمی کو ہمارے معاشرے میں بوڑھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ وصیت نامہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ علامہ اقبال کو مرنے سے کئی سال قبل، ان کے حادثہ رحلت کی جھلک شاید دکھادی گئی تھی۔ یہ دلیل ہے کہ ان کی فراست و بصیرت اور صفائے قلب کی ---

ص ۴۱۸ کی یہ عبارت کسی سوانح عمری میں نہیں کھپتی: ”مقام مسرت ہے کہ علامہ اقبال کے جشنِ ولادت کی صد سالہ تقریبات سرکاری طور پر جنرل محمد ضیاء الحق چیف مارشل لائیونسٹریٹ کی سربراہی میں منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ اس ضمن میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں“۔ ص ۶۲ پر لاہور کے کسی محلے کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں: ”اسی محلے میں محمد طفیل مدیر نقوش رہتے تھے۔ انھیں خوش نویسی کا شوق تھا۔ نقوش ان کے دل کی آواز ہے“۔ ظاہر ہے اس طرح کی باتیں سوانح سے غیر متعلق ہیں۔

محمد حنیف شاہد نے اپنے بقول: اس ”منفرد اور ممتاز اور مستند ترین“ سوانح عمری کو ’بالکل صحیح ماخذوں اور حوالوں کے ساتھ پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے، مگر کتاب ان کی خاطر خواہ توجہ اور محنت سے محروم رہی ہے۔ کتاب کا ۷۰، ۸۰ فی صد حصہ اقتباسات پر مشتمل ہے۔ اقتباسات، پوٹ چھوڑ کر نہیں دیے گئے، اس لیے بسا اوقات اقتباسات اور مصنف کے بیانات میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حوالوں کا نظام بھی ابتری، بے قاعدگی اور انتشار کا شکار ہوا ہے۔ ص ۳۶۶ پر ختم ہونے والے باب پر آخری حوالے کا شمار ۳۰۳ ہے مگر ’حواشی‘ کے تحت شمار ۳۰۰ کے بعد کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ حوالوں کے شمار نمبر کی اغلاط کو کتابت کی غلطیاں سمجھیں، تب بھی متعدد مقامات مصنف کی بے نیازی پر شکوہ کناں ہیں:

الف - ص ۶۵: م ش کے حوالے سے بیان کردہ ۱۸۹۴ء کی روایت، سر عبد القادر

کی ہے۔ م ش تو ۱۸۹۴ء میں پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔

ب - ص ۶۷۹: تصانیفِ اقبال کے ذیل میں 'خطبات مدراس' کے عنوان سے انگریزی لیکچروں کا تعارف کرایا گیا ہے، مگر پہلے چھ صفحاتوں میں لیکچروں کا اصل انگریزی نام (ٹائٹل) بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ ساتویں صفحے پر کہیں جا کر نام آتا ہے، اور وہ بھی ضمناً۔

ج - ص ۳۹۵: 'اقبال، بھوپال میں' کے زیر عنوان، اقبال اور علی گڑھ کی تفصیل درج ہے۔ پھر دو صفحات کے بعد، اچانک بلا عنوان ہی اقبال اور بھوپال کا موضوع شروع ہو جاتا ہے۔

د - ص ۴۲۶: 'سفر سرہند' کے زیر عنوان، اس سفر کی تفصیلات میں، ڈیڑھ صفحے کے بعد اچانک اقبال کی علالت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔

ہ - ص ۱۶۷: اقبال، علی بخش سے انگریزی میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں (کسی انگریزی ماخذ کے اقتباس کا اردو ترجمہ دینا چاہیے تھا۔)

و - ص ۱۰۳: مصنف نے اپنی کتاب اقبال اور عبدالقادر کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے جو شائع ہی نہیں ہوئی۔

ز - ص ۴۳۱: 'والدہ جاوید کی علالت اور وفات' کے زیر عنوان چوتھے مسلسل اقتباس میں یہ اطلاع درج ہے: 'کل شام بیچھے بجے والدہ جاوید اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں'۔۔۔ یہ اقبال کے ایک خط کا جملہ ہے، مگر یہ نہیں پتا چلتا 'کل شام' سے کیا مراد ہے؟ کس سنہ، تاریخ اور مہینے کا ذکر ہے؟

ح - دو جگہ غلام رسول مہر کی تصنیف: ارشاداتِ اقبال کا حوالہ آیا ہے (ص ۲۴، حوالہ ۱۰، ص ۴۲، حوالہ ۱) اس نام سے مہر صاحب کی کوئی کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔

ط - اقبال کی شعر گوئی کا آغاز کب ہوا، اور کیسے؟۔۔۔ یہ ایک اہم بحث ہے، مصنف نے اسے سوا چار سطروں میں نمٹا دیا ہے، مگر 'داغ کی شاگردی' کا بیان چار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

بعض اوقات مصنف کا اذعاً کھلتا ہے، مثلاً: 'بہت کم لوگ جانتے ہیں.....' (ص ۴۲۰)۔



اقبالِ صدی کی سوانحِ عمریاں

تمام تذکرہ نگار اس سلسلے میں خاموش ہیں، (ص ۱۵۷) 'یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے' (ص ۴۱۷)۔ تاریخِ ولادت پر بحث کے بعد: 'مندرجہ بالا حقائق، شواہد اور واقعات کی روشنی میں اب مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور بلاشک و شبہہ اور بلا تامل یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ.....' (ص ۳۸) 'بے شمار ایسے واقعات جو علامہ اقبال کے نام نہاد سیرت نگاروں اور بزعم خود مصاحبوں کے علم ہی میں نہ تھے، صحیح حوالوں اور مستند تاریخوں کے ساتھ پہلی بار پیش کیے جا رہے ہیں' (ص ۱۵)۔

مفکرِ پاکستان بلاشبہ اقبال کی ضخیم ترین سوانحِ عمری ہے، مگر اس کے جواہر کو خذف ریزوں سے الگ کرنا آسان نہیں ہے۔ اسے روانی سے پڑھنا مشکل ہے، اور اس سے اخذ و استفادہ کرنے والوں کی تعداد کم تر۔۔۔ مصنف کے غیر محتاط تا لینی رویے، اور دقتِ نظر کے فقدان نے مفکرِ پاکستان کے استناد کو مجروح کیا، اور اسی چیز نے کتاب کو قارئین اور اقبالیین میں مناسب پذیرائی سے محروم رکھا ہے۔

## ۴

ایم ایس ناز کی حیاتِ اقبال<sup>۱۸</sup> بھی اقبالِ صدی پر سوانحِ اقبال کی طلب کا نتیجہ ہے۔ ابتدائی حصے میں مصنف کا انداز تحقیقی ہے۔ تاریخِ ولادت کے مسئلے پر ایک طویل بحث کے بعد، انھوں نے خالد نظیر صوفی کی تحقیق کو زیادہ قرین صحت قرار دیا ہے جس کے مطابق اقبال ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے، مگر آگے چل کر دیگر مباحث کے سلسلے میں مصنف کا تحقیقی انداز برقرار نہیں رہا اور وہ مختلف عنوانات کے تحت، علامہ کے سوانحی ذخیرے سے مطلوبہ روایات اخذ کر کے، انھیں جمع کرتے چلے گئے ہیں۔ بیشتر تفصیل ذکرِ اقبال، اقبال درونِ خانہ اور روزگارِ فقیر سے لی گئی ہیں۔ اس اخذ و استفادے میں کسی چھان پھٹک یا تحقیق کے آثار نہیں ملتے۔ جس موضوع پر جتنا لوازمہ دستیاب ہوا، مصنف نے اُسے جمع کر دیا ہے۔ اسی لیے بیانِ واقعات میں توازن مفقود ہے۔ یورپ جانے سے قبل، اقبال

کے زمانہ معلّیٰ کے پانچ سالوں کو پانچ سطروں میں نمٹایا گیا ہے، مگر قیامِ یورپ کے تین سالوں کا تذکرہ نوصنحات میں پھیلا ہوا ہے۔ عطیہ بیگم سے تعلق کا ذکر بھی اتنی ہی ضخامت میں ہے۔ حیاتِ اقبال کے بعض امور کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے، مثلاً: خطباتِ مدراس، علی گڑھ، میسور، پانی پت، اور سرہند کے سفر وغیرہ --- آرنلڈ سے متاثر ہونے کی جس غلط فہمی کا آغاز ذکرِ اقبال سے ہوا تھا (کہ اقبال بی، اے کے زمانے میں آرنلڈ سے متاثر ہوئے اور انھیں کے زیر اثر، ایم، اے فلسفہ میں داخلہ لیا) وہ یہاں بھی برقرار ہے۔ (ص ۶۴)

البتہ اس کتاب کا ایک حصہ 'اقبال' عوامی عدالت میں، اہم ہے جس میں مصنف نے اقبال پر لگائے جانے والے چار الزامات (شراب نوشی، رنگ رلیاں، طوائف کا قتل، قادیانیت) پر بحث کی ہے اور اس ضمن میں جملہ دستیاب شہادتوں کی مدد سے اقبال کا دفاع کرتے ہوئے، ان الزامات کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ سوانحِ اقبال کے ذخیرے میں یہ ایک نیا اور قابل توجہ باب ہے۔

اگرچہ مصنف نے ذخیرہ اقبالیات کو بہت کچھ کھنگال کر خاصی تفصیلات فراہم کر دی ہیں، مگر ان کے ہاں کسی گہرے تاثر و کاوش کا فقدان ہے۔ شاید سببِ تجلّت یا قلتِ دقت، اس لوازم کی مناسب تدوین بھی نہیں ہو سکی۔ اپنی متعدد خامیوں اور غلطیوں کے باوجود، عام قارئین کی آگاہی کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

## ۵

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو نیشنل کمیٹی کی جانب سے حیاتِ اقبال لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، ان کی کاوش بہ عنوان سرگذشتِ اقبال<sup>۱۹</sup> ۷۷ء ہی میں شائع ہو گئی تھی۔ مصنف نے 'پیش لفظ' میں بتایا ہے: 'ڈاکٹر ایس اے رحمن نے پورا مسودہ غور سے پڑھا، بعض مقامات پر تصحیح فرمائی اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازتے رہے' --- ذکرِ اقبال کی اشاعت (۱۹۵۵ء) کے بعد سے، گذشتہ ۲۰، ۲۲ برسوں میں اقبالیات کے ذخیرے میں



۱۹۳۳ء کو پشاور سے کابل روانہ ہوا۔ بلاشبہ اقبال اور اس مسعود تو ۲۱ اکتوبر کو پشاور سے روانہ ہو گئے تھے، مگر وفد کے تیسرے رکن سید سلیمان ندوی بروقت پاسپورٹ نہ ملنے کے سبب ۲۵ اکتوبر کو پشاور سے چل سکے۔<sup>۱</sup>

۲- ڈاکٹر خورشید فیصلہ نہیں کر سکے کہ خطبہ علی گڑھ کا اصل انگریزی عنوان کیا تھا (ص ۹۹)۔ اگر وہ اپنے ہی ایک وضاحتی نوٹ (ص ۱۰۸، حوالہ ۱) کی روشنی میں عبدالواحد معینی کے مرتبہ انگریزی مجموعے میں شامل انگریزی عبارات (ص ۶ تا ۳۸۱) کا مُلّت بیضا پر ایک عمرانی نظر سے موازنہ کرتے تو واضح ہو جاتا کہ یہ The Muslim Community کا ترجمہ ہے۔

۳- ص ۴۱۹ پر ڈاکٹر خورشید بتاتے ہیں: 'سپین کے دورے کے بعد آپ روم پہنچے۔ اس کے بعد چار صفحات میں اٹلی کے آمر مسولینی سے ملاقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے حالانکہ یہ واقعہ تو (پہلی نہیں) دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر پیش آیا تھا، جیسا کہ مصنف نے ص ۳۷۰ پر بتایا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس سے لوٹتے ہوئے علامہ، اٹلی میں رُکے، بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں اور علمی گفتگو رہی۔۔۔ مسولینی سے ملاقات بھی اسی سفر میں ہوئی۔ سپین سے واپسی پر تو وہ براستہ فرانس، ہندستان روانہ ہو گئے تھے، اٹلی نہیں گئے۔'

۴- ص ۲۵۲ پر بتایا گیا ہے کہ: 'خطباتِ مدراس یا دوسرے لفظوں میں تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ، سات مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات ۱۹۲۹ء کے آغاز میں مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر پڑھے گئے۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ساتوں لیکچر مدراس میں پیش کیے گئے، حالانکہ وہاں صرف تین لیکچر دیے گئے تھے، (ص ۲۶۷ پر مصنف نے مدراس کے 'سہ روزہ' قیام کا ذکر کیا ہے۔ پھر تین روز میں جیسے یا سات لیکچر کیسے ہو گئے؟)

ایک اچھی سوانحِ عمری کا یہ وصف ہونا چاہیے کہ تلاش و تحقیق کے بعد، مختلف واقعات کے سنین اور تواریخ کا تعین کیا جائے۔ اسی طرح افراد و اشخاص کا ذکر، اُن کے اپنے مخصوص ناموں کے ساتھ ہونا چاہیے، مگر سرگذشتِ اقبال کے مصنف نے اس طرح

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

کے تردد سے بالعموم اجتناب کیا ہے۔ چنانچہ یہاں اس نوع کے بیانات بکثرت ملیں گے۔  
 ص ۲۶۳: 'اقبال مدراس پہنچے۔ ص ۲۶۵: 'مدراس میں سہ روزہ قیام کے بعد، علامہ بنگلور  
 پہنچے۔ ص ۵۶۶: 'علامہ کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی'۔ ص ۵۶۷: '۱۹۱۳ء میں جس  
 خاتون سے علامہ اقبال نے شادی کی'۔ ص ۵۶۷: 'چند سال بعد منیرہ سلطانہ [پیدا ہوئی]  
 --- علامہ کے مدراس پہنچنے اور پھر وہاں سے روانہ ہو کر بنگلور پہنچنے کی تاریخیں معلوم کرنا  
 کچھ مشکل نہ تھا، اسی طرح پہلی بیوی سے لڑکی اور علامہ کی بیوی کے نام اور منیرہ سلطانہ کی  
 تاریخِ پیدائش، حیاتِ اقبال کی اکثر کتابوں میں مذکور ہیں۔ بظاہر ایسے معمولی، مگر فی  
 الحقیقت نہایت اہم امور سے یوں سرسری گزر جانا، شاید ڈاکٹر خورشید کا صحافیانہ مزاج  
 ہے --- اس مزاج کا ایک پہلو یہ ہے (اور یہ اوّل الذکر پہلو سے زیادہ اہم، اور اسی لیے  
 مایوس کن ہے) کہ انہوں نے 'سیاست دان اقبال' کو، شخصیت کے باقی تمام پہلوؤں پر  
 حاوی کر دیا ہے۔ یہاں ہمیں وہ اقبال نظر آتا ہے، جو مسلمانوں کا دینی اور سیاسی راہنما تھا،  
 جو اہم ملکی، ملّی اور سیاسی مسائل پر بیان جاری کرتا تھا، جلسوں میں تقریریں کرتا تھا،  
 کانفرنسوں میں شریک ہوتا، سیاست دانوں سے صلاح و مشورہ کرتا، اور مذاکرات میں حصہ  
 لیتا تھا۔ یہ کتاب فقط اسی اقبال کی سرگذشت معلوم ہوتی ہے، مگر کیا اقبال یہی کچھ تھا؟ یقیناً  
 اس کی شخصیت اور زندگی کے اور بھی بہت سے پہلو تھے۔

وہ شاعر بھی تھا۔ سرگذشتِ اقبال میں ہمیں شاعرِ اقبال، خواب دیکھنے والا  
 اقبال، کہیں نظر نہیں آتا؟ اقبال کی پہلی شادی کیوں ناکام رہی؟ اور اس ناکامی پر اس نے  
 کیا اذیت محسوس کی؟ وہ کیا ذہنی کیفیت تھی جس سے اس نے شراب نوشی میں پناہ  
 ڈھونڈنے، یا سپیرا بن کر جنگلوں میں نکل جانے یا خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر  
 دیا؟ مصنف نے اقبال کی یاسیت کا چند سطرے ذکر تو کیا ہے (وہی سرسری پن) مگر قاری کو  
 اُن کی داخلی دنیا میں اٹھنے والے ہنگاموں اور اس کرب و اضطراب کا کچھ پتا نہیں چلتا،  
 جس کے نتیجے میں، یورپ سے واپسی پر کئی سال تک وہ ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا  
 رہے؟ ممدوح کی شخصیت کے ایسے اہم پہلو سے صرف نظر، کیا سوانح نگار کی کوتاہی نہیں؟

شاید ڈاکٹر خورشید کو خود بھی احساس تھا کہ یہ محض اقبال کے خارج کا کوائف نامہ ہے، اور اس سے ”مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر“ سامنے نہیں آتی، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے معمولات، معاشرت، عادت و اطوار، نشست و برخاست، اندازِ شعر گوئی، مطالعہ، طعام و کلام، سفر و حضر، عائلی زندگی اور پسند و ناپسند کیا تھی۔ چنانچہ انھوں نے خاتمہ کتاب پر ”اقبال کے شب و روز“ کے عنوان سے ایک باب (نمبر ۳۸) کا اضافہ کیا مگر کیا اس پیوند سے اُس کمی کی تلافی ہو سکتی ہے، جو مجموعاً اس کتاب میں نمایاں طور پر موجود ہے؟

سطور بالا میں ہم نے عبدالمجید سالک سے صاحبِ سر گزشتہ اقبال کے نسبی تعلق کا ذکر کیا تھا۔ بظاہر یہ ایک غیر متعلق اور بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا حوالہ دینے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ ڈاکٹر خورشید کی زیر نظر تصنیف پر ذکرِ اقبال (اور سالک صاحب) کے اثرات واضح ہیں، مثلاً:

۱- اس کتاب کا ظاہری ڈھانچا ذکرِ اقبال پر استوار ہے۔

۲- آخری باب ”اقبال کے شب و روز“ ذکرِ اقبال کے باب چہارم: ”اقبال کا اسلوبِ زندگی“ کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید نے سالک کی مہیا کردہ معلومات کو، کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ذکرِ اقبال سے ایک طویل اقتباس دیا ہے، اور اس باب کی فہرست ماخذ میں ذکرِ اقبال سر فہرست ہے۔

۳- ذکرِ اقبال میں سالک نے قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبال کا واضح موقف بیان نہیں کیا۔ بقول شورش کاشمیری وہ قادیانیوں کے باب میں ’فیاضانہ‘ رویہ رکھتے تھے شاید اس لیے کہ: ’اُن کے والد قادیانی المذہب تھے۔ اُن کے بھائی بھی قادیانی تھے، اور وہ خود بھی مرزا بشیر الدین محمود سے ملتے ملا تھے۔‘<sup>۱۲</sup> ڈاکٹر خورشید کے ہاں بھی اس کے اثرات موجود ہیں، مثلاً:

الف- لکھتے ہیں: ’قادیانی احمدی عام مسلمانوں کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کرتے، اور نہ اُن سے رشتے ناطے کرتے ہیں۔ اس پالیسی کی وجہ سے ان کے [اور] عام مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ طویل فاصلے رہے ہیں‘ (ص ۴۶۶)۔ یہاں ’عام مسلمانوں‘

کی بجائے صرف ’مسلمانوں‘ کا استعمال مناسب تھا۔ موجودہ صورت میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خورشید قادیانیوں کو بھی مسلمانوں ہی کی کوئی قسم سمجھتے ہیں، جو عام مسلمانوں سے معاشرتی مقاطعے کے قائل ہے۔

ب۔ ایک اور بات انھوں نے یہ کہی ہے کہ: ’جہاں تک مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا تعلق تھا، اس کے ابتدائی دور میں قادیانی احمدی بھی شامل تھے‘ (ص ۴۶۶)۔  
 کون سی سیاسی جدوجہد؟ مصنف نے وضاحت نہیں کی۔ یہ امر یوں بھی قرین قیاس نہیں کہ انگریزوں سے وفاداری، قادیانیوں کے ایمانیات میں شامل رہی ہے۔ کیا ہندوستان میں کسی طرح کی ’سیاسی جدوجہد‘ ممکن تھی، جس کی براہ راست یا بالواسطہ زد، انگریزوں پر نہ پڑتی ہو؟ لہذا قادیانی ایسی کسی جدوجہد کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

ج۔ مسئلہ قادیانیت پر پنڈت نہرو سے اقبال کے قلمی مناظرے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید لکھتے ہیں: ’پوری بحث کو سمیٹنا تو ہمارے لیے ممکن ہے، نہ یہ کتاب اس کی متحمل ہو سکتی ہے، لیکن علامہ کے جوابی مضمون میں سے یہ اقتباس خصوصی اہمیت رکھتا ہے، (ص ۴۶۹)۔ عجیب بات ہے کہ ’خصوصی اہمیت‘ کا جو اقتباس، مصنف نے نقل کرنا ضروری سمجھا، اس میں مسئلہ قادیانیت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اور پنڈت نہرو کے نام ایک خط میں، علامہ نے قادیانیوں کے بارے میں جو دو ٹوک بات کہی تھی، (احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں<sup>۲۳</sup>) ڈاکٹر خورشید کی اس بحث میں اس کا سرے سے کہیں ذکر ہی نہیں آیا۔

۴۔ اقبال کی بیڑ بازی سے متعلق ذکر اقبال کی ایک روایت کو بعض اصحاب نے بے بنیاد قرار دیا تھا۔<sup>۲۴</sup> عبدالسلام خورشید نے سالک صاحب کا دفاع کیا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اس روایت کو بائیں الفاظ بیان کرتے ہیں: ’یہ روایت بھی عام ہے کہ ایک دفعہ مولانا [میر حسن] نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں، اور ایک ہاتھ میں بیڑ تھام رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: کم بخت! اس میں تجھے کیا مزاملتا ہے؟ تو اقبال نے اسی وقت جواب دیا: حضرت، ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے‘۔ اس اقتباس میں ’یہ روایت بھی عام ہے‘ کے الفاظ

قابلِ غور ہیں۔ یہ لطیفہ، سالک صاحب کا ایجاد کردہ ہے، کسی اور راوی نے بیان نہیں کیا، پھر یہ 'عام' کیسے ہو گیا؟۔ ڈاکٹر خورشید یہ روایت بھی عام ہے، کہہ کر شاید اس روایت پر اعتراضات کی سگینی کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ روایت (یا لطیفہ) نقل کرنے کے بعد انھوں نے سالک کے دفاع میں، پہلے تو یہ کہا ہے کہ اس واقعے کے راوی خود حضرت علامہ تھے (ص ۲۲)۔ مگر اقبال نے یہ روایت کب، کہاں اور کس سے بیان کی؟ اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ پھر اپنی چشم دید گواہی کا ذکر ہے کہ ایک بار علامہ نے بے تکلف دوستوں کے سامنے ہاتھ سے بیٹر کو 'مٹھیا'، کا طریقہ بتایا، مگر 'مٹھیا' نے، گاگر جاننے سے کہاں یہ لازم آتا ہے کہ اقبال نے مولوی میر حسن ایسے استاد کے سامنے متذکرہ بالا شوخ چٹشی یا جسارت بھی کی ہوگی۔ سالک کے دفاع میں وہ مزید کہتے ہیں کہ اگر شاگرد کی 'جسارت' اتنی ہی قابلِ اعتراض ہے تو اس واقعے کو کیوں خوشی سے بیان کر دیا جاتا ہے کہ اُستاد نے اسکول میں دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو اقبال بولے کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے (ص ۲۳)۔ سوانح نویس غور فرمائیں، دونوں 'جسارتوں' کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ اقبال دیر سے آتا ہے اور حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے، میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سالک مرحوم کا دفاع کرتے کرتے، جناب عبدالسلام خورشید، دو تین سطریں آگے چل کر خلطِ مجت کا شکار ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں: 'مصتف کو بیٹر بازی کے الزام' پر اعتراض تھا (ص ۲۳)۔ حالاں کہ اعتراض 'بیٹر بازی کے الزام' پر نہ تھا، اقبال کی مبدیہ شوخی پر تھا کہ: 'حضرت، ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے'۔

۵- سالک صاحب نے بتایا کہ تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر علامہ ہسپانیہ گئے، اور وہاں سے اٹلی آ کر مسولینی سے ملاقات کی۔ ذکر اقبال (ص ۱۸۲) سرگذشتِ اقبال میں بھی یہی غلطی دہرائی گئی ہے۔ (ص ۴۱۹)

جناب مصتف کی مجبوری تھی کہ ان کے سامنے ذکرِ اقبال کے علاوہ اقبال کی باقاعدہ سوانحِ عمری کا کوئی اور نمونہ موجود نہ تھا، مگر یہ بھی کسی سوانح نگار کی کمزوری ہے کہ وہ کسی ایک کتاب پر ایک حد سے زیادہ بھروسا کر کے رہ جائے۔ اگر خورشید صاحب



ذکرِ اقبال کے سحر سے آزاد ہو کر لکھتے تو شاید زیادہ کامیاب رہتے۔ بایں ہمہ انھوں نے برعکس جو کچھ لکھا، اس سے بھی اقبال کے سوانحی ذخیرے میں پیش رفت ضرور ہوئی۔

## ۶

نیشنل کمیٹی نے اقبال کی سوانح عمری لکھنے کا ایک کام سید نذیر نیازی کے سپرد بھی کیا تھا۔ دانامے راز کے عنوان سے ان کی کاوش ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آئی<sup>۲۵</sup>۔۔۔ ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل، اس کتاب کے آغاز میں عنوانات کی کوئی فہرست یا ابواب کی تفصیل نہیں دی گئی، لہذا آپ کتاب کے مباحث و موضوعات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ بظہر غائر کتاب کی ورق گردانی کے بعد پتا چلتا ہے کہ دانامے راز دو فصلوں پر مشتمل ہے۔

۱- ایک سو نو صفحات پر محیط فصل اوّل میں آغاز سے ۱۸۹۵ء تک کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

۲- دوسری فصل میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک اقبال کی سرگرمیوں کا احوال درج ہے۔

ہر فصل کے تحت متعدد ضمنی عنوانات ہیں، مثلاً: محمد اقبال، خاندان، تعلیم و تربیت، طالب علمی، پدر و مرشد اقبال، اُستاد اقبال۔ نوجوان اقبال، شاعر اقبال، ازدواج۔۔۔ ان عنوانات پر نیازی صاحب نے نہایت سیر حاصل اور بھرپور بحث کی ہے۔ ایسی بھرپور، کہ کہیں کہیں تو غیر ضروری طوالت کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ ان کے خیال میں ۱۸۹۵ء تک کا دور، حیاتِ اقبال میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، مگر اقبال کے اکثر سوانح نگاروں نے اس سے بے اعتنائی کی ہے۔

چنانچہ سید نذیر نیازی نے حیاتِ اقبال کے اس تشکیلی دور پر اس مربوط انداز میں نظر ڈالی ہے کہ اقبال کا ذہن اور شاعرانہ ارتقا واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں وہ

اقبال کے والدین، ان کے استاد علامہ سید میر حسن، شہر سیالکوٹ اور اُس کے علمی و ثقافتی ماحول اور اس کی تعلیمی روایات کو زیر بحث لائے ہیں۔ حیاتِ اقبال کے اس تشکیلی دور میں دو عنوانات ایسے ہیں جن کی طرف اقبال کے دیگر سوانح نگاروں کے برعکس، نیازی صاحب نے بطور خاص توجہ دی ہے، اول یہ کہ اقبال کو کبوتروں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس ضمن میں نیازی صاحب نے اقبال کا یہ قول نقل کیا ہے: 'جب میں کبوتروں کو پہننے فضا میں پرواز کرتے دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں جیسے میں بھی، اُن کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں اڑ رہا ہوں، افلاک کی سیر ہو رہی ہے۔۔۔' پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'معلوم ہوتا ہے کبوتروں کی اڑان اور آسمان پر وازی محمد اقبال کی شاعرانہ اور فلسفہ پسند طبیعت کو بڑی مرغوب تھی..... کبوتروں سے اُن کا ذہن دُحوش و طُور کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ ان کی عادات و خصائل کا مطالعہ کرنے لگے، تا آنکہ یوں انھوں نے ایک ایسا نظامِ علامات وضع کر لیا، جو ان کے خیالات و تصورات کے ابلاغ کا نہایت مؤثر ذریعہ ثابت ہوا' (ص ۶۸-۶۹)۔

دوسرا موضوع اقبال کی پہلی شادی کا ہے، جو ناکام رہی۔ نیازی صاحب نے جامعیت و اختصار کے ساتھ اور متوازن انداز میں اس موضوع کو سمیٹا ہے، لکھتے ہیں:

محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں طرح طرح کی افسانہ طرازیوں کی گئیں، جو سب کی سب غلط ہیں۔ بے شک یہ شادی ناکام رہی لیکن اس کی ایک ہی وجہ تھی اور وہ طبائع کی عدم مناسبت، علی ہذا، خاندانی حالات میں تفاوت۔ میں سمجھتا ہوں رشتہ عجلت میں طے ہوا۔ طرفین نے اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ محمد اقبال نے لاکھ کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے، مگر بات نہ بنی۔ ایک تو والدہ آفتاب کا اندازِ طبیعت، دوسرے آفتاب اقبال کی روش، حالات بگڑتے چلے گئے۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ کی کوششیں بھی، کہ اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نکل آئے، ناکام رہیں۔ محمد اقبال چونکہ اس معاملے میں حق بجانب تھے، لہذا شاہ صاحب اور اُن کے دوستوں نے، ان کی انصاف پسندی کو دیکھتے ہوئے پھر کبھی اس میں دخل نہیں دیا، (ص ۹۶-۹۷)۔

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

اقبال کی پوزیشن اس امر سے اور بھی زیادہ واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ وفات تک، اقبال اپنی پہلی بیوی کو گزارے کے لیے ماہ بہ ماہ ایک مقررہ رقم باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے رہے۔ اقبال میوزیم میں محفوظ اقبال کے روزنامچے آمد و خرچ<sup>۱</sup> سے پتا چلتا ہے کہ پہلے تو پچاس روپے ماہوار بذریعہ منی آرڈر روانہ کیے جاتے تھے، مگر والدہ جاوید کی وفات کے بعد اس میں کمی کر کے تیس روپے بھیجے جانے لگے۔

فصل دوم: (ص ۱۱۰-۱۴۵) کے ضمنی عنوانات اس طرح ہیں: گورنمنٹ کالج، آرنلڈ، پروفیسر اقبال، علمی مشاغل، علم الاقتصاد - حلقہ احباب، ارباب سخن - انجمن حمایت اسلام - مخزن، شاعری، وطنیت --- ان میں سے بیشتر مباحث غیر ضروری طور پر بے حد طویل ہیں۔ شاید اپنے مخصوص مزاج کے سبب، نیازی صاحب کے لیے اس طوالت سے بچنا ممکن نہ تھا، مگر اس سے قاری کو بار بار اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ 'حلقہ احباب' کے ضمن میں اُن اکابر کا ذکر کرتے کرتے، جن سے اقبال متاثر ہوئے، نیازی صاحب نے اقبال کے نیاز مندوں اور عقیدت مندوں کی فہرست مفصل بھی مرتب کر ڈالی ہے، جس کے نتیجے میں یہ حصہ چوالیس صفحات پر پھیل گیا ہے۔ اسی طرح علم الاقتصاد کا تعارف بھی غیر ضروری تفصیل اور تبصرے پر مشتمل ہے --- مجموعی اعتبار سے فصل دوم میں ربط و جامعیت اور استنباطِ نتائج کی وہ صورت مفقود ہے، جو فصل اول میں نظر آتی ہے۔

نیازی صاحب نے دانامے راز کی تیاری میں اقبال کے سوانحی ذخیرے کے ساتھ ساتھ ذاتی یادداشتوں سے بھی مدد لی ہے، چنانچہ کئی مقامات پر مختلف حضرات سے ملاقاتوں کے حوالے ملتے ہیں۔ اسی طرح زیر طبع اقبال کے حضور جلد دوم کا بھی کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے --- بعض مقامات پر نیازی صاحب کو تسامح ہوا ہے، مثلاً:

۱- یہ بات درست نہیں کہ جب اقبال نے وکالت ترک کی تو منشی طاہر الدین نے تنخواہ لینا ترک کر دی۔ بلاشبہ آخری زمانے تک، حساب کتاب کا اہتمام و اندراج منشی صاحب ہی کے ذمے تھا، مگر ان خدمات کے عوض، علامہ انھیں پچاس روپے ماہوار تنخواہ دیتے تھے، جسے آخری زمانے میں کم کر کے تیس روپے کر دیا گیا تھا۔ (دیکھیے: محولہ بالا

روزنامچہ آمد و خرچ)

۲- یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے کہ بشیر ضیائی کی تیار کردہ بیاض ہی کو، بعد میں مہر مرحوم نے عبداللہ قریشی صاحب کے مزید اضافے کے ساتھ سُروِدِ رفتہ کے نام سے شائع کیا (ص ۳۱۱-۳۱۲، صحیح سُروِدِ رفتہ ہے نہ کہ سرورِ رفتہ) اس کی ترتیب میں صادق علی دلاوری، غلام سول مہر کے ساتھ شریک تھے۔

عبداللہ قریشی صاحب، سید عبدالواحد معینی کی مرتبہ باقیاتِ اقبال کے تیسرے ایڈیشن میں شریک مرتب رہے۔ مزید یہ کہ سُروِدِ رفتہ واضح طور پر مرتبین کی اپنی کاوش ہے، اس کی بنیاد بشیر ضیائی یا کسی اور کی قلمی بیاض پر نہیں ہے۔

نیازی صاحب اپنی اس کاوش کے بارے میں دیباچے میں لکھتے ہیں:

راقم الحروف بوجہ اس سے مطمئن نہیں..... اس جزو کی تحریر و تسوید حسبِ مشائ نہ ہو سکی۔ کچھ حصہ ایک نچ پر لکھا، کچھ اس خیال سے کہ اب پابندی وقت کی قید نہیں، دوسری نچ پر۔۔۔ گو اساساً اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یوں متن میں کچھ ناہمواری سی پیدا ہو گئی ہے۔ بعض عبارتیں شاید غیر مربوط یا غیر متوازن سی معلوم ہوں گی۔ کہیں اطناب ہے، کہیں بمقابلہ اس کے طوالت۔ یہ تو راقم الحروف کا ذاتی احساس ہے۔ نہیں معلوم قارئین اس پر کس کس پہلو سے گرفت کریں۔ ان کے نزدیک شاید کئی معلومات تشنہ ہوں گی، کئی مفروضے خود ساختہ، کئی بیانات محل نظر..... (ص ۸)۔

نیازی صاحب نے یہ سب کچھ بجا لکھا ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ انھوں نے یہ سارا کام تنہا انجام دیا ہے، جس میں ان کے بقول: 'دشواریاں بہت تھیں' (ص ۷)۔ راقم کے نزدیک یہ ناشر کی ذمہ داری تھی کہ وہ اشاعت سے پہلے اس کی مناسب تدوین کراتے، نامکمل اور ادھورے حوالے مکمل کیے جاتے، ابواب بندی ہوتی، اسی طرح آغاز میں ایک مکمل فہرست مباحث اور آخر میں اشاریے کا اضافہ کیا جاتا۔ یوں یہ کتاب بہتر علمی انداز میں سامنے آتی اور اس سے استفادہ کرنا زیادہ آسان ہوتا۔

دانامے راز علامہ اقبال کی جزوی سوانح عمری ہے، اس کا عرصہ زیر بحث ۱۹۰۸ء

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

تک ہے۔ مصنف نے دیباچے میں، ۱۹۷۹ء ہی میں حصہ دوم شائع ہو جانے کی خبر دی تھی، مگر موعودہ جلد تاحال منظر عام پر نہ آسکی۔ (معلوم نہیں اس کی تحریر و تسوید بھی ہو سکی یا نہیں؟)۔ اگر ہوئی تو مسودہ کہاں اور کس حال میں ہے؟) نیازی صاحب کا منصوبہ سات آٹھ جلدوں کا تھا۔ وہ ۱۹۸۱ء میں فوت ہو گئے اور منصوبہ ناتمام رہا، اللہ بس باقی ہوس۔

## ۷

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس پورے عرصے میں بھارتی اقبالین کی طرف سے، حیاتِ اقبال کے ضمن میں کوئی کاوش نہیں کی گئی۔ علی سردار جعفری نے ۱۹۷۸ء میں ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ سوانحِ اقبال کے لیے مواد جمع کر رہے ہیں مگر وہ عملاً وہ کچھ نہیں کر سکے۔ اس لحاظ سے جگن ناتھ آزاد کی محمد اقبال، ایک ادبی سوانح حیات<sup>۲۸</sup> (۱۹۸۳ء) بھارت سے، اس موضوع پر شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے (عبداللطیف اعظمی کی قابل قدر تصنیف اقبال: دانامے راز<sup>۲۹</sup> کا ایک حصہ علامہ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، جو مصنف نے خاصی کاوش سے جمع کیے ہیں مگر یہ مستقل سوانحِ عمری نہیں ہے)۔

پروفیسر آزاد نے یہ مختصر سی سوانحِ حیات، اس قاری کے لیے لکھی ہے جو اٹھارہ سال کی عمر سے آگے نکل چکا ہے، یعنی ایک عام قاری کے لیے۔ (اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ مصنف نے اقبال کے حالات پر مشتمل ایک کتاب بچوں کے لیے بھی لکھی تھی)۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں حیاتِ اقبال کے ضروری کوائف اور دستیاب و موجود لوازمے کو زیادہ تر زمانی ترتیب سے بیان کر دیا گیا ہے۔ کتاب چودہ چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل ہے، اور ہر باب بعض ضمنی عنوانات میں منقسم ہے۔ مصنف نے تحقیقی یا تنقیدی بحثوں سے گریز کیا ہے، کیونکہ اس نوع کی کتاب میں نہ تو اس کی ضرورت تھی اور نہ گنجائش۔

جناب جگن ناتھ آزاد کے ماہر اقبالیات ہونے میں کلام نہیں۔ اقبال کے مطالعے

میں اُن کی عمر گزری ہے۔ زیر مطالعہ کتاب، اقبالیات کے تعلق سے اُن کی دسویں تصنیف ہے۔ بلاشبہ عام قارئین، خصوصاً بھارتی قارئین کے لیے اس کی افادیت مسلم ہے، تاہم اس کے چند ایک تسامحات کی نشان دہی ضروری ہے:

۱- چند ناموں کی تصحیح: ص ۲۱، صحیح نام میروزری علی ہے۔۔۔ ص ۴۰: ادبی محفل کا نام 'اُردو بزم مشاعرہ' تھا اور ماہنامے کا نام شورِ محشر۔ ص ۴۱ اور ۴۲ پر ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کو 'نذیر احمد خاں' لکھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ 'خان' نہیں تھے۔  
۲- بعض واقعاتی تسامحات کی تصحیح:

الف- ص ۳۶: یہ درست نہیں کہ اقبال بی اے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔  
ب- ص ۵۴: آزاد صاحب لکھتے ہیں: '۱۹۰۵ء میں لندن پہنچ کر آپ نے کچھ روز، اپنے چند احباب کے ساتھ ۱۹- ایڈولفس روڈ، فنیسبری نارٹھ لندن میں قیام کیا، اس کے بعد کیمبرج روانہ ہو گئے'۔۔۔ یہ 'کچھ روز' والی بات درست نہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: 'اقبال' ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو لندن پہنچے، اور ایک رات شیخ عبدالقادر کے ساتھ گزارنے کے بعد، ۲۵ ستمبر کو کیمبرج روانہ ہو گئے۔' ۳

ج- ص ۵۴: آزاد لکھتے ہیں: میونخ یونیورسٹی نے ۱۹۰۷ء میں اقبال کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ یہ مقالہ کیمبرج یونیورسٹی پہنچا، تو کیمبرج یونیورسٹی نے اس پر اقبال کو ایک امتیازی سرٹیفکیٹ عطا کیا،۔ اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ مقالہ پہلے، کیمبرج سے بی اے کے امتحان کی تکمیل کے لیے لکھا گیا تھا۔ بعد ازاں میونخ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کے لیے بھی یہی موضوع منظور کر لیا، اقبال نے اپنے مقالے میں بعض ترامیم کر کے، اسے ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کر دیا، اور اسی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔

د- ص ۵۵: اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ اقبال نے، لکنز ان میں زیر تعلیم ہونے کے ساتھ، سوشیالوجی اور پالیٹکس کی مزید تعلیم کے لیے لندن سکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس میں بھی داخلہ لیا تھا۔

ہ- ص ۵۸: پہلی بیوی (کریم بی بی) سے 'علاحدگی' ہو گئی۔ اگر یہاں 'علاحدگی'

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

سے مراد طلاق ہے، تو یہ درست نہیں، کیونکہ اقبال نے پہلی بیوی کو کبھی طلاق نہیں دی۔ وہ انھیں اپنی وفات تک ماہوار اخراجات بھیجتے رہے۔

و- ص ۸۸: تاریخ ہند پر شریک مصنف کی حیثیت سے اقبال کا نام ضرور درج ہے، مگر اس میں شبہہ نہیں کہ یہ ان کی تصنیف ہرگز نہیں۔<sup>۳</sup>

ز- ص ۱۱۹: مسولینی سے ملاقات، دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ہوئی، نہ کہ تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر۔

۳- کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کتاب لکھتے لکھتے مصنف کو اچانک 'طوالت' کا احساس ہوا یا کسی مجبوری کے تحت انھیں اختصار کی ضرورت درپیش ہوئی، چنانچہ انھوں نے 'کٹ شارٹ' کرتے ہوئے باقی حصے کو مختصر کر کے ختم کر دیا ہے۔ ہمارا یہ تاثر اس بنیاد پر ہے کہ ابتدا سے ۱۹۰۸ء تک کے واقعات ۵۹ صفحات (ص ۱۹ تا ۷۷) میں بیان ہوئے ہیں، لیکن ۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۸ء کا زمانہ صرف اُنچاس صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ زمانہ اقبال کی بھرپور علمی، ادبی، سیاسی، ملی، شاعرانہ اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا زمانہ ہے، اور اسی لیے اجمال کے بجائے تفصیل کا طالب تھا۔ موجودہ صورت میں کتاب کا توازن مجروح ہوا ہے۔ باب ۶ (عطیہ فیضی) نسبتاً طویل تر ہے، اور دورہ افغانستان کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

بحیثیت مجموعی، یہ کتاب عام قارئین کے لیے ایک مفید سوانح حیات ہے۔ علامہ کے بارے میں مثبت تاثرات پیدا کرنے والی یہ سوانح عمری، بھارت میں اقبال فہمی کے فروغ میں معاون کتابوں میں شمار ہوگی۔

## ۸

متذکرہ بالا کتابوں کے باوجود، علامہ اقبال کی ایک مفصل، معیاری اور مستند سوانح عمری کی ضرورت بدستور باقی تھی، چنانچہ علامہ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال اس طرف

متوجہ ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں ان کا آغاز کردہ یہ کام نو برس کی تحقیق اور محنت کے بعد ۱۹۸۴ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ زندہ رود اقبال کی سب سے مفصل سوانح عمری ہے (۱۱ صفحات)، جسے مصنف نے تین الگ جلدوں میں پیش کیا ہے۔<sup>۳۲</sup>

پہلی جلد ۱۹۰۸ء تک کے حالات پر مشتمل ہے، جسے مصنف نے 'حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور' قرار دیا ہے۔ ابواب کے عنوانات یہ ہیں: سلسلہ اجداد، خاندان، سیالکوٹ میں۔ تاریخِ ولادت کا مسئلہ، بچپن اور لڑکپن، گورنمنٹ کالج لاہور، تدریس و تحقیق، یورپ۔۔۔ دوسری جلد (حیاتِ اقبال کا وسطی دور، ستمبر ۱۹۰۸ء تا دسمبر ۱۹۲۵ء) بھی سات ابواب پر مشتمل ہے: فکرِ معاش، ازدواجی زندگی کا بحران، ذہنی ارتقا، تخلیقی کرشمہ، قلمی ہنگامہ، خانہ نشینی، ہندو مسلم تصادم کا ماحول۔۔۔ تیسری جلد (حیاتِ اقبال کا اختتامی دور، ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۸ء) کے سات ابواب اس طرح ہیں: عملی سیاسیات کا خارزار۔ دورہ جنوبی ہند، مسلم ریاست کا تصور، گول میز کانفرنسیں، افغانستان، علالت، آخری ایام۔۔۔ یہ عنوانات مباحث کی نوعیت کے مطابق قائم کیے گئے ہیں۔ ایک طرح سے یہ عنوانات اقبال کے اہم مراحلِ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جلد اول کے مباحث کا انداز، باقی جلدوں کے مقابلے میں، نسبتاً تحقیقی ہے۔ ان مباحث کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ان پر خاطر خواہ تحقیقی نظر ڈالے بغیر کوئی نتیجہ اخذ کرنا گمراہ کن ہو سکتا تھا۔ اقبال کے اجداد کون تھے؟ ان کے کس جذبے نے سب سے پہلے، کب اور کیوں اسلام قبول کیا؟ سیالکوٹ کی طرف ہجرت کس زمانے میں اور کن عوامل کے تحت ہوئی؟ اقبال کی تاریخِ ولادت کیا ہے؟۔۔۔ یہ سب اور بہت سے دیگر مسائل ابتدائی تین ابواب میں زیر بحث آئے ہیں۔ جاوید صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ ان کے ایک جد بابا لول ج نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور ان کا تعلق برہمنوں کی گوت سپرو سے تھا۔ ان کے قبولِ اسلام کا واقعہ پندرہویں صدی کا ہے۔ کشمیر سے ہجرت اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں عمل میں آئی، اور اقبال کی صحیح تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ باب ۴ میں اقبال کی طالب علمانہ زندگی، گھریلو ماحول، شیخ نور محمد کے



اقبال صدی کی سوانح عمریاں

اندازِ طبیعت، مولوی میر حسن کی شخصیت، اقبال کی شعر گوئی، داغ سے تلمذ، اور شادی کے موضوعات پر مصنف نے جو تفصیل مہیا کی، وہ قدرے تشنہ محسوس ہوتی ہے۔ ان موضوعات پر مزید تفصیل ممکن تھی۔

اقبال نے کئی سال سکاچ مشن اسکول، پھر دو سال انٹرمیڈیٹ کالج میں گزارے۔ یہ ماحول کیسا تھا؟ اساتذہ کس قابلیت اور صلاحیت کے تھے، اور اس ماحول نے اقبال کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کیے؟ اس سے بالکل صرف نظر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سرسید پر خاصا مفصل نوٹ (ص ۵۲ تا ۶۰) دیا گیا ہے، حالانکہ مختصر اظہار خیال بھی کافی تھا۔ اسکول میں اقبال کا تعلیمی سلسلہ کب شروع ہوا؟ مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں: 'اس بات کا تو کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اقبال نے کس عمر میں اسکول کی کون سی جماعت میں داخلہ لیا' (ص ۵۱)۔ اس ضمن میں سلطان محمود حسین کی تحقیق یہ ہے کہ اقبال ۱۸۸۳ء میں پہلی کچی جماعت میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں پہلی کچی جماعت میں ان کا داخلہ ہوا۔<sup>۳۳</sup>

گذشتہ صفحات میں سالک صاحب کی ایک روایت (بٹیر بازی کے حوالے سے، میر حسن کے سامنے اقبال کی شوخ چٹھی) کا ذکر آیا تھا۔ جاوید اقبال صاحب نے اس متنازع فیہ روایت پر سرے سے کوئی رائے نہیں دی، مگر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اقبال، میر حسن کا اس حد تک احترام کرتے تھے کہ ان کے سامنے شعر گوئی کی جرأت نہ تھی، اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ انھوں نے شاعری میں میر حسن سے اصلاح لی ہوگی۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ جو شاگرد، استاد کے سامنے شعر گوئی کو گستاخی سمجھتا ہو، وہ: 'حضرت! ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے، کہنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے؟'۔۔۔ یہاں بالواسطہ سالک کی روایت کی تردید ہوتی ہے۔ اسی طرح مصنف نے سوانح نگاروں کی اس روایت کو فرضی قرار دیا ہے، جس کے مطابق شیخ نور محمد کے ترک ملازمت کی وجہ، ڈپٹی وزیر علی کی شرعاً ناجائز آمدنی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈپٹی صاحب کے ہاں حیاطی سے زیادہ حاضر باشی اور مصاحبت کا کام ہوتا تھا، اس پر شیخ نور محمد کو خلش رہتی کہ پارچہ دوزی کے عوض ملنے والی تنخواہ کا بیشتر

حصہ رزقِ حلال نہیں (ص ۵۱)۔

باب ۵ میں لاہور کے زمانہ طالب علمی، گورنمنٹ کالج کے ماحول، اور لاہور کی شعری مجالس میں اقبال کی شمولیت کا ذکر ہے۔ یہاں آرنلڈ کی شخصیت اور اقبال پر ان کے گہرے اثرات اور لاہور کے مشاعروں کا ذکر مزید مفصل ہوتا تو بہتر تھا۔ باقی دو ابواب اور نیٹل کالج اور گورنمنٹ کالج کی ملازمتوں، اور قیامِ یورپ کی تعلیمی زندگی کے ادوار سے بحث کرتے ہیں۔ یہ جلد ۱۹۷۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ (شاید ۱۹۷۸ء میں تحریر کی گئی ہوگی)۔ گذشتہ دس سالوں میں حیاتِ اقبال کے ان ادوار پر خاصاً نیا لوازمہ دریافت ہو چکا ہے، اس کی روشنی میں، زندہ دود کے ان ابواب میں تفنگی کا احساس ایک قدرتی امر ہے۔

اس جلد کی اشاعت پر، راقم نے اپنی معلومات و بساط کے مطابق، فاضل مصنف کو بعض امور کی طرف متوجہ کیا تھا، مثلاً: طبعِ اوّل میں تھا: کیمبرج سے بی اے کی ڈگری لینے کی بات درست نہیں (ص ۱۱۳)۔ راقم نے عرض کیا کہ یہ غلط فہمی ہے۔ ان کے مطبوعہ تحقیقی مقالے *The Development of Metaphysics in Persia* پر، نام کے ساتھ واضح طور پر (B.A. Cantab) درج ہے۔ طبعِ دوم میں اس کی اصلاح ہو گئی، مگر ایک دو باتیں اب بھی اصلاح طلب ہیں۔

ص ۳۳: فہرست میں کتاب نمبر ۱۳ کے مصنف کا صحیح نام ڈاکٹر محمد صادق ہے۔ نمبر ۱۵ کتاب، دراصل وہی ہے، جو نمبر ۱ پر درج ہے۔ (یعنی حیاتِ اقبال از چراغِ حسن حسرت)۔ کتاب پر مصنف کا نام درج نہیں، لیکن ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے مطابق یہ حسرت کی تحریر ہے۔) تاجِ کمپنی کے عنایت اللہ اس کے ناشر تھے۔<sup>۳۲</sup>

ص ۱۱۲، سطر ۱۰: کیمبرج پہنچ کر، اقبال ۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء میں مقیم ہوئے (نہ ۱۰، کیسل سٹریٹ<sup>۳۵</sup>) اسی صفحے پر آخری سطروں میں بتایا گیا ہے کہ کیمبرج میں رہائش اختیار کرنے کے فوراً بعد، اپنے موضوعِ تحقیق کے متعلق ضروری رجسٹریشن میونخ یونیورسٹی میں کروا دی تھی؛ فوری رجسٹریشن کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، وہ بی اے کے اختتام پر یا آخری

مرحل میں پی ایچ ڈی کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔

اقبال نے ایم اے کے بعد ۱۹۰۵ء تک ملازمت اختیار کیے رکھی مگر یہ ایک عبوری دور تھا۔ یورپ سے واپسی تک کے دور کو، ان کے زمانہ طالب علمی ہی میں شمار کرنا چاہیے۔ یوں بھی ۱۹۰۸ء تک اُن کے افکار و نظریات ارتقا پذیر رہے۔ ۱۹۰۸ء میں، جب وہ پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی اسناد لے کر ہندستان لوٹے تو حقیقی معنوں میں ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ فکری، ذہنی، جذباتی اور شاعرانہ اعتبار سے یہ دور اضطراب انگیز اور ہنگامہ خیز تھا۔ ان کی مصروفیات اور نوع بہ نوع ذمہ داریاں بڑھ گئیں اور علاقہ میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اس دور میں حیاتِ اقبال کا کیسوس زیادہ وسیع ہے۔ اسی نسبت سے زندہ رود کی دوسری جلد مباحث اور ضخامت، دونوں طرح ضخیم تر ہے۔ یہ جلد ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی، گویا اس کا زمانہ تحریر ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۱ء ہے۔ مصنف کو بعض نئے مآخذ سے بھی استفادے کا موقع ملا، جیسے سید نذیر نیازی کی دانامے راز وغیرہ۔

باب ۸ میں فکرِ معاش کے لیے اقبال کی تگ و دو، اور ملی اور قومی معاملات میں ان کی دلچسپی اور شرکت کا ذکر ہے۔ انھوں نے وکالت کو معطلی پر ترجیح دی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: 'قیامِ یورپ کے دوران غالباً ۱۹۰۷ء کے آخری حصے میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے استعفادے دیا تھا' (ص ۱۳۹)۔ استغفے کی صحیح تاریخ ۲۲ جنوری ۱۹۰۸ء ہے۔<sup>۳۶</sup>

اقبال کی درسی تالیفات (ص ۱۸۷) کے ضمن میں یہ تصحیح ضروری ہے کہ لالہ رام پرشاد کے اشتراک سے مرتبہ کتاب تاریخ ہند پر ان کا نام غلط طور پر درج ہے۔ اس کتاب کے بعض مباحث کی روشنی میں، اسے اقبال سے منسوب کرنا صحیحاً غلط ہوگا۔ ص ۱۶ پر حکیم احمد شبانچہ کے اشتراک سے اُردو کورس کی تین کتابوں (برائے ششم، ہفتم اور ہشتم) کا ذکر ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اُردو کورس جماعت پنجم کے لیے بھی مرتب ہوا تھا۔<sup>۳۸</sup> نظم 'جواب شکوہ باغِ بیرون موچی دروازے میں پڑھی گئی تھی۔ اس کا سنہ ۱۹۱۳ء بتایا گیا ہے (ص ۱۵۶، دوم)۔ راقم کی نظر سے نظم کے دو ایسے نسخے گزرے ہیں، جن پر جلسے کی تاریخ ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء درج ہے۔<sup>۳۹</sup>

’ازدواجی زندگی کا بحران‘ اس حصے کی نہایت اہم بحث ہے۔ مصنف کے نزدیک اقبال کی پہلی شادی کی ناکامی کا سبب فریقین کے طبائع میں اختلاف اور دونوں کی معاشرتی اور مالی حیثیت میں تفاوت تھا، مگر بچوں پر اس کا برا اثر پڑا، خصوصاً آفتاب اور اقبال کے درمیان حائل خلیج وسیع ہوتی گئی۔۔۔ لیکن عطیہ فیضی نے اس کا جو نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ناکام ازدواجی زندگی نے ان کی صلاحیتوں کو گھن لگا دیا، ان کی ذکاوت و طباعی ختم ہو گئی اور ان کی علمی شخصیت نشوونما پانے کے بجائے گھٹ کر رہ گئی وغیرہ، ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کے نزدیک یہ کہنا درست نہیں کہ اقبال اضطراب کے اس مرحلے سے نہ گزرتے تو بہت کچھ بن سکتے تھے۔ وہ بالکل بجا کہتے ہیں کہ اقبال خواہ اس مرحلے سے گزرتے یا نہ گزرتے، بننا انھوں نے وہی کچھ تھا، جو بالآخر بنے (ص ۱۶۵)۔ ہمارے خیال میں تو اس دور کی ذہنی کش مکش اور اضطراب نے اقبال کو مزید نکھار دیا۔ اس کرب و اضطراب اور شخصیت کے نکھار میں ’اچھی اور سچی لڑکی‘ ایما ویگے ناست کا بھی خاصا دخل ہے، جن کے نام اقبال کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔<sup>۱۱</sup> یوں اس موضوع پر سب سے اچھا تجزیہ افتخار احمد صدیقی نے کیا ہے۔<sup>۱۲</sup>

اس باب میں اقبال پر عائد کیے جانے والے دیگر الزامات (شراب نوشی، طوائف کا قتل، عیاشانہ زندگی) کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اقبال پر یہ سب الزامات ان کی کردار کشی کی مہم کا حصہ تھے، اور اس مہم میں مخالفین کے کئی گروہ شامل تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان، تنگ نظر علماء، قادیانی، بعض مشائخ، کمیونسٹ، حاسدین اور متعصب ہندو۔۔۔ اقبال کے خلاف متذکرہ بالا الزامات پر، خالد نظیر صوفی، ایس ایم ناز اور نذیر نیازی نے بھی بحث کی ہے، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال نے زیادہ تفصیل سے کلام کرتے ہوئے بڑے مدلل انداز میں انھیں رد کیا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن نے بجا کہا ہے کہ: ’ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے پاؤں کے چھالوں میں بہت سے کانٹے پڑے تھے، ان کو ان کے فرزند ارجمند نے نوکِ سوزن سے نکالا ہے‘۔<sup>۱۳</sup>

اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ جلد دسمبر ۱۹۲۵ء تک کے حالات و واقعات اور اقبال کی

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

زندگی میں پیش آمدہ نشیب و فراز پر مبنی ہے۔ اس دور میں ان کے خیالات و افکار میں زیادہ وسعت، پختگی اور ہمہ گیری آئی۔ اپنے پہلے تخلیقی کارنامے اسرارِ خودی پر انھیں ایک چوکھی لڑائی لڑنا پڑی۔ سیاسیات میں وہ اپنے موقف پر قائم رہے اور احیائے اسلام کے لیے خطوں، گفتگوؤں اور تقریروں میں اپنی دلی تمنا کا اظہار کرتے رہے۔ بقول پروفیسر اسلوب احمد انصاری:

حصہ دوم کے پڑھنے سے اقبال کی شخصیت کے وہ نقوش، جو حصہ اول میں قائم ہوئے تھے، اور گہرے ہو جاتے ہیں، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنا توانا ذہن، کتنا حساس دل، اور کتنی غنی اور کشادہ طبیعت کے مالک تھے اور ہر مسئلے پر خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، غیر جانب داری اور معروضیت کے ساتھ دو ٹوک اظہارِ رائے میں خوف، لالچ، تعصب، کوئی شے اُن کے آڑے نہیں آتی تھی۔ چونکہ وہ اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں جرمی، کھرے اور غیر مقلد تھے، اسی لیے سیاسی، مذہبی اور عام سماجی زندگی کی ہر سطح پر انھیں مطعون کرنے کی کوشش کی گئی، یہاں تک کہ کردار کشی کی ناپاک مہم اتنے عرصے تک چلائی گئی کہ اس کے اثرات شاید اب تک باقی ہیں، اور اس تالیف کے مطالعے ہی سے اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔۔۔ بحیثیت مجموعی زندہ رود کی دوسری جلد بھی، پہلی جلد کی طرح سیر حاصل بحث اور منصفانہ محاکمے اور مواد کی تنظیم اور تنقیح کے اعتبار سے ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔<sup>۱۲</sup>

’حیاتِ اقبال کا اختتامی دور‘ جنوری ۱۹۲۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اسی سال انھوں نے مجلسِ قانون ساز پنجاب کے انتخاب میں حصہ لیا، اور اس طرح عملی سیاسیات کے خازن میں اُترے۔۔۔ تین سال بعد اسمبلی کی مصروفیت ختم ہوئی تو ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں انگریزی خطبات تیار کیے، اور معاً بعد تاریخ ساز خطبہ الہ آباد پیش کیا۔ پھر گول میز کانفرنسوں کے سلسلے میں دو بار یورپ کا سفر، اور بعد ازاں افغانستان کا سفر۔۔۔ یہ اُن کی فعال زندگی کا آخری دور تھا۔ ۱۹۳۴ء میں جس طویل علالت کا آغاز ہوا، اس نے انھیں رہوڈز لیکچرز، یورپ میں علاجِ معالجے اور حجاز مقدس کے سفر کی مہلت نہیں دی، مگر ذہنی اور فکری طور پر وہ آخر تک بیدار اور متحرک رہے، زندہ رود کی تیسری جلد، اقبال کی

زندگی کے آخری تیرہ برسوں پر محیط ہے، مگر ان تیرہ برسوں کی کہانی، پہلے دونوں ادوار سے زیادہ طویل ہے۔ اس تیسری جلد کو پڑھتے ہوئے 'میں تو اس قوم کا قوال ہوں' اور 'قطب از جانبی جبند' کا تاثر زائل ہو جاتا ہے، اور علامہ کی بھرپور، توانا اور متحرک و فعال اور بیدار ذہن شخصیت سامنے آتی ہے، جو علمی، دینی، سیاسی، ملّی اور بین الاقوامی سطح پر نہایت مستعدی کے ساتھ اپنا حصہ ادا کرنے میں سرگرم عمل ہے، اور حقیقی معنوں میں اس شعر کی عملی تفسیر ہے:۔

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں

کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

زندہ رود کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ایک بڑے آدمی (Great man) کی زندگی تھی۔ اس حصے میں مصنف نے اقبال کی نجی زندگی سے متعلق بہت سی نادر معلومات فراہم کی ہیں۔ خاص طور پر جاوید منزل کے شب و روز کے بارے میں وہ تفصیل، جو انھوں نے اپنی یادوں کے حوالے سے قلم بند کی ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے لیے، علامہ کی زندگی پر قلم اٹھانا، بیک وقت آسان بھی تھا، اور مشکل بھی --- آسان یوں کہ جو بنیادی مآخذ اور دستاویزات و مسودت ان کی دسترس میں تھے، اُن تک کسی اور کی رسائی تقریباً ناممکن تھی، اور مشکل اس لیے کہ اپنی نسبی حیثیت کی وجہ سے حیاتِ اقبال کے بعض امور پر بلا خوف لومنتہ لائم، کچھ لکھنا خاصی نازک ذمہ داری تھی۔ اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک سوانح نگار کی ذمّے داریوں سے انحراف نہیں کیا۔ اقبال کے سوانح نگار، اپنے مخصوص تاثرات و تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں یا بعض مقامات سے سرسری گزر جاتے ہیں، زندہ رود کے مصنف کے ہاں ہمیں ایک توازن اور معروضیت نظر آتی ہے۔ وہ کسی امر کی پردہ پوشی یا آنکھیں بند کر کے سرسری گزر جانے کے بجائے، اسے زیر بحث لا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔

زندہ رود میں حیاتِ اقبال کے کوائف و حقائق اور واقعات مکمل پس منظر و پیش منظر اور تفصیلات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہ حکایت طویل ضرور ہے، مگر اس کی لذت میں کلام نہیں۔ گو، اب بھی حیاتِ اقبال کے بعض پہلو تفصیل طلب اور بعض امور تحقیق

اقبال صدی کی سوانح عمریاں

طلب ہیں، مگر اقبال کے دوسرے سوانح نگاروں کے ہاں پائی جانے والی تشنگی یہاں خاصی حد تک دُور ہو جاتی ہے، اور علامہ کی نجی زندگی کے ساتھ ان کی فکری، فلسفیانہ، ذہنی، سیاسی اور شاعرانہ زندگی کے تمام رُخ سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید قانون دان ہیں اور تاریخ و علم سیاسیات سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حیاتِ اقبال کے جملہ ادوار اور پہلوؤں کا وسیع سیاسی، تاریخی اور علمی و معاشرتی پس منظر بھی بیان کر دیا ہے۔ اس بیان میں کہیں کہیں طوالت کا احساس ضرور ہوتا ہے، مگر بالعموم ایسے بیانات معتدل اور متوازن ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک بار اپنی ذہنی و دماغی سرگزشت لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، کیونکہ ان کے خیال میں، ان کے ”خیالات کا تاریخی انقلاب سبق آموز“ ہو سکتا ہے۔ علامہ کی یہ خواہش نامتاً رہ گئی، مگر زندہ رود کو ہم بلا تامل، ان کی ذہنی و دماغی سرگزشت کہہ سکتے ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے زندہ رود کی ایک اہم خوبی کی طرف متوجہ کیا ہے کہ مصنف نے: ’کہیں بھی جذباتی، جارحانہ یا متعصبانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ مواد کا تجزیہ بے لاگ پن اور بہت بے جھپک انداز سے کیا ہے۔ یہی اس سوانح عمری کا سب سے بڑا امتیاز ہے، جس کی بنا پر اسے اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھنا بے جا نہ ہوگا۔‘<sup>۱۵</sup>

زندہ رود حیاتِ اقبال پر حرفِ آخر نہیں ہے۔ اقبالیات پر ہر سال نئی چیزیں اور نیا لوازمہ سامنے آتا ہے، جس کی روشنی میں اچھی سے اچھی کتاب میں بھی ترمیم و اضافے اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آنے والے زمانوں میں اس ’مردِ خود آگاہ‘ کی زندگی اور کارناموں پر مزید تحقیق ہوگی، اور تجزیے بھی، مگر مستقبل میں اقبالیات کا کوئی بھی طالب علم، مصنف یا مورخ، جو اقبالیات پر کچھ کہنا یا لکھنا پڑھنا چاہے گا، زندہ رود سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔



اقبال صدی کے زمانے میں بہت سی ایسی کتابیں شائع ہوئیں، جنہیں سوانح عمری کے ذیل میں تو شمار نہیں کیا جاسکتا، مگر ان میں حیاتِ اقبال کے متعلق قیمتی لوازمہ ملتا ہے۔

بعض کتابوں کو ہم جزوی سوانح کہہ سکتے ہیں جیسے: اقبال کی ابتدائی زندگی یا عروج اقبال۔ بعض کتابوں میں سوانحی مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ چند ایک، اقبال سے ملاقاتوں کی یادداشتوں پر مشتمل مضامین و تاثرات کے مجموعے ہیں۔ یہ سارا مواد اس قدر اہم اور اس لائق ہے کہ حیاتِ اقبال پر قلم اٹھاتے ہوئے اسے پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ اس نوع کی کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱- علامہ اقبال کا سالِ ولادت ۱۸۷۳ء یا ۱۸۷۷ء: نظیر صوفی، سیالکوٹ، ۱۹۷۶ء، ۲۶+۶ ص۔

۲- اقبال کی صحبت میں: محمد عبداللہ چغتائی۔ لاہور، ۱۹۷۷ء، ۵۷ ص۔

۳- روایاتِ اقبال، مرتب: عبداللہ چغتائی۔ لاہور، ۱۹۷۷ء، ۲۲۴ ص۔

۴- اقبال اور پنجاب کونسل، مرتب: محمد حنیف شاہد۔ لاہور، ۱۹۷۷ء، ۱۶۰ ص۔

۵- حیات و پیام علامہ اقبال: نظیر صوفی۔ سیالکوٹ، ۱۹۷۹ء، ۹۶ ص۔

۶- حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں: محمد عبداللہ قریشی۔ لاہور، ۱۹۸۲ء،

۳۶۴ ص۔

۷- اقبال اور بھوپال: صہبا لکھنوی۔ لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۲ء، ۴۰۸ ص۔

۸- اقبال اور ممنون: اخلاق اثر۔ بھوپال، ۱۹۸۳ء، ۱۶۴ ص۔

۹- اقبال، یورپ میں: سعید اختر درانی۔ لاہور، ۱۹۸۵ء، ۶۴+۳۳۸ ص۔

طبع دوم، لاہور، ۱۹۹۹ء، ۵۳۹ ص۔

۱۰- مظلوم اقبال: شیخ اعجاز احمد۔ کراچی، ۱۹۸۵ء، ۳۷ ص۔

۱۱- اقبال کے ہم نشین، مرتب: صابر کلروی۔ لاہور، ۱۹۸۵ء، ۲۸۳ ص۔

۱۲- اقبال، نئی تحقیق، مرتب: بشکیل احمد۔ حیدرآباد دکن، ۱۹۸۵ء، ۱۸+۷۲ ص۔

۱۳- اقبال کی ابتدائی زندگی: ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین۔ لاہور،

۱۹۸۶ء، ۶۳ ص۔

۱۴- Iqbal As I Knew Him: ڈورس احمد۔ لاہور، ۱۹۸۶ء، ۵۴ ص۔



- ۱۵- عروجِ اقبال: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ لاہور، ۱۹۸۷ء، ۳۳۳ ص۔
- ۱۶- حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، مرتب: محمد حمزہ فاروقی۔ لاہور، ۱۹۸۸ء، ۵۸۸ ص۔
- ۱۷- سفر نامہ اقبال، مرتب: محمد حمزہ فاروقی۔ کراچی، طبع دوم: ۱۹۸۹ء، ۲۸۳ ص۔
- ۱۸- اقبال، حیاتِ عصر: عبدالجبار خاں ساجد۔ ملتان، ۱۹۹۴ء، ۵۲۴ ص۔
- ۱۹- اقبال اور گجرات: محمد منیر سلیم۔ گجرات، ۱۹۹۸ء، ۳۱۶ ص۔
- ۲۰- دما دم رواں ہرے ہم زندگی [اؤل]: خرم علی شفیق۔ اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ۲۸۹ ص۔

۲۱- اقبال درونِ خانہ [دوم]: خالد نظیر صوفی۔ لاہور، ۲۰۰۳ء، ۳۲۵ + [۳۱] ص۔

سوانحی اور علامہ اقبال سے ملاقاتوں کی رودادوں اور یادداشتوں پر مبنی کچھ نئے پرانے مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں، مثلاً: علامہ اقبال، اپنوں کی نظر میں، مرتب: مصباح الحق صدیقی۔ حیاتِ اقبال، مرتب: طاہر تونسوی۔ اقبال کے ہم صفیر، مرتب: ایم ایس ناز۔ مجالسِ اقبال، مرتب: جعفر بلوچ۔ اقبال اور عطائی از غلام قاسم مجاہد بلوچ، وغیرہ۔ محمد عبداللہ قریشی نے محمد الدین فوق کے مضامین کا مجموعہ تذکارِ اقبال شائع کیا۔ بیگم رشیدہ آفتاب اقبال کی کتاب علامہ اقبال اور ان کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال میں، بہت کچھ رطب و یابس کے ساتھ، کچھ سوانحی مواد بھی مل جاتا ہے۔ مزارِ اقبال (مرتبین: غلام رسول عدیم + محمد رفیق خالد) اور وفات نامہ اقبال (سجاد حسین شیرازی) میں بھی بعض نکات پراگھی بحث کی گئی ہے۔

اس عرصے میں اقبال کے خطوں کا ایک مجموعہ (اقبال، جہان دیگر۔ مرتب: محمد فرید الحق۔ کراچی، گردیزی پبلشرز، ۱۹۸۳ء) شائع ہوا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔ محمد صدیق ظفر [حجازی] نے اس مجموعے کو ایم فل اقبالیات (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، [۱۹۹۶ء]) کے تحقیقی مقالے کا موضوع بناتے ہوئے، نہایت کاوش و محنت سے متنِ خطوط کی تصحیح کی اور ضروری حواشی و تعلیقات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ عنوان: اقبال، جہان

دیگر (اردو/انگریزی)۔ ملک حسن اختر کا مضمون 'علامہ اقبال اور پنجاب یونیورسٹی' (سہ ماہی اردو، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۸۷ء) اقبال کی تعلیمی اور معلمانہ زندگی کے بارے میں تفصیل فراہم کرتا ہے۔ ان کا ایک اور مضمون 'علامہ کا سلسلہ ملازمت (اقبال ریویو، لاہور، جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء) بھی اس سوانحی سلسلے کا معلومات افزا مضمون ہے۔ سوانح اقبال کی 'غلطی ہاے مضامین' کے سلسلے میں صدیق جاوید کے بعض مضامین بے حد اہم ہیں، دیکھیے ان کا مجموعہ: اقبال پر تحقیقی مقالے، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

حیات اقبال، اقبالیات کا اہم اور بنیادی موضوع ہے۔ گو، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر ابھی بعض پہلوؤں پر تحقیق مزید کی ضرورت ہے۔ بعض روایات تصدیق طلب ہیں، اور بہت سی جزئیات کی مزید تفصیل مطلوب ہیں۔ مزید تلاش و تفتیش سے اقبال کے سوانحی ذخیرے میں یقیناً اضافہ ہوگا، اور نقد و تنقیح سے موجودہ ذخیرے کو زیادہ استناد و اعتبار کا درجہ حاصل ہوگا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (م: ۲۴ جولائی ۲۰۰۳ء) کئی برسوں سے علامہ اقبال کی ایک مفصل سوانح حیات (روداد اقبال) پر کام کر رہے تھے، اور غالباً تین چار جلدیں تیار کر چکے تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ سات جلدوں میں اقبال کی مفصل سوانح عمری تیار کی جائے۔ اس سے کم از کم یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالیاتی تحقیق کا یہ موضوع امکانات سے خالی نہیں۔ وقت بذات خود نئے امکانات کی تخلیق کرتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا، علامہ اقبال کی مزید سوانح عمریوں کی گنجائش پیدا ہوگی، اور اس طرح ان کی 'کتاب دل' کی مزید 'تفسیریں' سامنے آئیں گی۔ ۱۷

## حوالے اور حواشی

۱- یہ مضمون عتیق صدیقی کی اقبال، جادوگر ہندی نژاد (مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۰ء) میں شامل ہے۔

۲- اقبال پر شیخ عبدالقادر کے مضامین کا مجموعہ محمد حنیف شاہد نے نذر اقبال کے نام سے مرتب کیا

ہے۔ (ناشر: بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۷۲ء)۔ اقبال سنگھ کی رائے قابلِ توجہ ہے، لکھتے ہیں:

It is an even greater pity that his friend and contemporay, Sheikh Abdul Qadir, who was with him during his stay in the West, has been hardly more communicative. He might have been Iqbal's Boswell, might have been, but not to be. (*The Ardent Pilgrim*; Calcutta, Orient Longmans 1951, p 34).

۳- اب یہ مضمون مثنیٰ محمد الدین فوق کے مجموعے تذکارِ اقبال (مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء) میں شامل ہے۔

۴- بحوالہ: حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، مرتبہ: محمد حمزہ فاروقی۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۱۹۸۸ء ص ۵۷۶۔

۵- اس امر پر راقم نے اپنے مضمون 'اقبال کی سوانحِ عمریاں' (مشمولہ: اقبالیاتی جائزے، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء) میں بحث کی ہے۔

۶- اس کی تفصیل ایک تو، بزمِ اقبال کمی رو دادیں (بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء) میں ملتی ہے۔ صفحات ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۳۲، ۱۳۵ وغیرہ۔ مزید برآں دیکھیے: اس قصبے کے بارے میں مولانا مہر کا وضاحتی بیان، مشمولہ: اقبال درونِ خانہ [دوم]، مرتب: خالد نظیر صوفی۔ اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۸۵-۸۷۔

۷- اقبالی مجرم: شورشِ کاشمیری۔ مطبوعات چٹان، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۳ تا ۳۷۔

۸- مجلہ اقبال لاہور۔ اپریل ۱۹۷۵ء، ص ۹۳۔

۹- روزگارِ فقیر، اوّل۔ لائن آرٹ پریس کراچی، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۳۸ تا ۲۴۳۔

۱۰- نقشِ اقبال: سید عبدالواحد معینی، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۱۔

۱۱- اقبال درونِ خانہ: خالد نظیر صوفی۔ بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۷۔

۱۲- سالک صاحب کے بارے میں پروفیسر خورشید کمال عزیز (کے کے عزیز) نے اپنے والد کی بیگرنی حوادثِ آشنا میں لکھا ہے: 'پڑھے لکھے تھے مگر ساری زندگی اُردو اخبار نویس اور انگریزی سے اُردو میں کتابیں ترجمہ کرنے میں بسر کی۔ ٹھوس علمی کام نہ کیا، حالانکہ اس کے اہل تھے۔ (حوادث آشنا: تفصیل لاہور، مارچ ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۵)۔

۱۳- چند یادیں، چند تاثرات، دوم: ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۱۴- ایضاً، ص ۱۳۵۔

- ۱۵- چودھری فرزند علی: ہفت روزہ اقدام لاہور۔ ۱۸ اپریل ۱۹۵۶ء۔
- ۱۶- سر وید رفتہ، مرتبین: غلام رسول مہر + صادق علی دلاوری۔ کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۴۴۔
- ۱۷- سنگ میل پہلی کیشنز لاہور، ۲۰ ص۔
- ۱۸- شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۷۷ء، ۳۷۱ ص۔
- ۱۹- اقبال اکادمی، لاہور، ۶۱۱ ص۔
- ۲۰- یہ تفصیل اقبال اور بھوپال (صہبا لکھنوی، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۳ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔
- ۲۱- اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں، مرتب: اختر راہی۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۲۲۸۔
- ۲۲- اقبالی مجرم، ص ۳۴۔
- ۲۳- علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کے نام ایک خط میں لکھا تھا: The Ahmadis are traitors both to Islam and to India دیکھیے: خطوط اقبال، مرتب: رفیع الدین ہاشمی، ص ۲۵۸۔
- ۲۴- اقبال درون خانہ، ص ۱۳۶۔ روزگار فقیر، اوّل، ص ۲۴۳۔
- ۲۵- اقبال اکادمی لاہور، ۴۵۱ ص۔
- ۲۶- روزنامہ پیم، ۳۳۸/۱۹۷۷ء، مخزنہ اقبال میوزیم، جاوید منزل، لاہور۔
- ۲۷- انٹرویو علی سردار جعفری از افتخار امام صدیقی: شاعر بھٹی، ۱۹۷۸ء، ج ۴۹، ش ۴، ص ۷۲۔
- ۲۸- موڈرن پبلسٹنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۳ء، ۱۳۱ ص۔
- ۲۹- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۸ء، ۲۴۰ ص۔
- ۳۰- زندہ رود، اوّل، ص ۱۱، دیکھیے، حوالہ ۳۲۔
- ۳۱- رفیع الدین ہاشمی: تصانیف اقبال ص ۴۳۳ تا ۴۳۹، نیز: زیر نظر کتاب میں شامل مضمون "تاریخ ہند: چند تصریحات" بھی دیکھیے۔
- ۳۲- حصہ اوّل: ۱۹۷۹ء، شیخ غلام علی، لاہور۔ ۱۶۰ ص۔
- حصہ دوم: ۱۹۸۱ء، شیخ غلام علی، لاہور۔ ۱۷۶ ص۔
- حصہ سوم: ۱۹۸۴ء، شیخ غلام علی، لاہور۔ ۴۲۸ ص۔
- ۳۳- اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۶ء، ۱۱۷ ص۔
- ۳۴- حیات اقبال کے متعدد ادیشن شائع ہوئے مگر کسی پر مصنف کا نام درج نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے سب سے پہلے، اسے چراغ حسن حسرت کی تصنیف قرار دیا تھا (کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۰۶) ڈاکٹر طیب منیر نے اپنے تحقیقی مقالے (چراغ

حسن حسرت، احوال و آثار: ادارہ یادگار غالب کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۵۳ میں اس پر صاد کیا۔ حال ہی میں ہمیں جناب محمد احسن خاں صاحب کی عنایت سے اصل حوالہ دستیاب ہوا ہے۔ عبداللہ خوبشکی کے مرتبہ مجموعہ مکاتیب بوستان خیال، (کراچی، ۱۹۶۲ء) میں شامل، اپنے ایک خط (مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۴۳ء) میں حسرت نے اس کتاب کو واضح طور پر اپنی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: 'حیات اقبال --- طلبہ کے لیے اقبال کے حالات آسان زبان میں'۔ (ص ۹۳)

- ۳۵- ڈاکٹر سعید اختر درانی: اقبال، یورپ میں، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۵۳۔
- ۳۶- استغنیٰ کا خط بنام ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، مطبوعہ: Journal of Research Society of Pakistan ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۷ء۔
- ۳۷- دیکھیے: زین نظر کتاب میں مضمون: 'تاریخ ہند: چند تصریحات'۔
- ۳۸- رفیع الدین ہاشمی: تصانیف اقبال، ص ۴۲۷-۴۳۰۔
- ۳۹- (۱) ناشر: سید اکبر علی، علمی کتب خانہ، لاہور، مسلم پرنٹنگ پریس لاہور، (۲) مرغوب انجمنی لاہور، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور۔
- ۴۰- عطیہ فیضی کے متعدد بیانات مبالغہ آمیز ہیں۔ ان پر ایک گرفت افتخار احمد صدیقی نے کی ہے، دیکھیے: عروج اقبال، ص ۳۱۱ تا ۳۲۰۔
- ۴۱- مشمولہ: اقبال، یورپ میں، ص ۱۰۹ تا ۱۲۱۔
- ۴۲- عروج اقبال، ص ۳۱۱ تا ۳۲۰۔
- ۴۳- زندہ رود پرتبرہ۔ مجلہ اقبال ریویو لاہور، جنوری ۱۹۸۶ء۔ مزید دیکھیے: پروفیسر محمد ایوب صابر کی کتاب اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ: کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۳ء۔
- ۴۴- مجلہ نقد و نظر، علی گڑھ، ج ۵، ش ۱، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۶-۱۱۷۔
- ۴۵- مجلہ مذکور، ج ۶، ش ۲، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۶۔
- ۴۶- اقبال کی سوانح عمریوں پر مزید تنقیدی مباحث کے لیے دیکھیے: حسب ذیل تحقیقی مقالے:
- الف: علامہ اقبال پر ۱۹۷۶ء تک مطبوعہ سوانحی کتب کا تحقیقی جائزہ از سجاد حسین شاہ، مقالہ برائے ایم فل اقبالیات، ۱۹۹۲ء، مخزنہ: کتب خانہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔
- ب: علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کا جائزہ، مطبوعہ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء از خورشید احمد شکوری، مقالہ برائے ایم فل اقبالیات، ۱۹۹۳ء، مخزنہ: کتب خانہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔
- (سہ ماہی اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۹ء، نظر ثانی: جولائی ۲۰۰۴ء)



## ☆ کلامِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

تصانیفِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت، اقبالیات کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ برسوں سے راقم کے لیے وجہ اضطراب رہا ہے۔ راقم نے اپنے تحقیقی مقالے (تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، لاہور، ۱۹۸۲ء) میں تفصیل کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور کلامِ اقبال کے متداول کلیات (شیخ غلام علی اڈیشن ۱۹۷۳ء و مابعد) کا تجزیہ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ یہ کلیات، میسوں اغلاط کے ساتھ بار بار چھپ کر پھیل رہا ہے اور دہلی، علی گڑھ اور حیدرآباد دکن سے اسی نسخے کے عکسی اڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ پھر یہ تجویز پیش کی تھی کہ:

علمائے اقبالیات کا ایک بورڈ، کلیاتِ اُردو (اور اسی طرح سے فارسی کلیات) کا ایک مستند اور صحیح نسخہ تیار کرے جسے معیاری نسخہ قرار دے کر رائج کیا جائے، اور باقی تمام نسخے متروک قرار دے دیے جائیں۔<sup>۱</sup>

---

☆ راقم کی یہ تحریر بعنوان 'استدراک' جناب رشید حسن خاں کے ایک مضمون: 'کلامِ اقبال کی تدوین' (رسالہ سیارہ لاہور) کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس میں خاں صاحب کے مذکورہ مضمون کا بار بار ذکر آیا ہے جو زیر نظر کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کیا جا رہا ہے۔ (یہ مضمون خاں صاحب کے مجموعہ مضامین تدوین: تحقیق، روایت --- دہلی ۱۹۹۹ء میں شامل ہے۔) مسئلے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے دونوں مضامین کا ایک ساتھ مطالعہ مفید ہوگا۔

لیکن افسوس کہ یہ آواز صدائِ صبحِ اثابت ہوئی۔ کئی سال بعد راقم نے سیارہ کے اقبال نمبر ۱۹۹۲ء میں پھر یہ مسئلہ اٹھاتے ہوئے لکھا:

راقم السطور اقبالیاتی اداروں اور اقبالیین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ تصانیفِ اقبال کا اشاعتی معیار اقبال کے لیے ہمارے جذبوں اور محبتوں کے معیار سے کہیں فروتر ہے۔ تصانیفِ اقبال کی اشاعت کئی پہلوؤں سے متعدد مسائل کا شکار ہے اور آنے والے برسوں میں جو صورت پیدا ہوتی نظر آتی ہے، وہ تشویش ناک ہے۔

اس مضمون میں اس طرف بھی توجہ مبذول کرائی گئی تھی کہ ۲۱ اپریل ۱۹۸۸ء کو اقبال کی وفات پر پچاس سال مکمل ہو گئے ہیں۔ کاپی رائٹ ایکٹ کی رو سے اشاعتِ کلامِ اقبال کے حقوق واگزار ہونے پر اب مختلف ناشرین، کلامِ اقبال چھاپ رہے ہیں مگر ان کے شائع کردہ نسخوں کا متن قطعی غیر تسلی بخش ہے۔ ایجوکیشنل پبلسرز لاہور کی شائع کردہ بانگِ درا میں ایک تو ترتیبِ کلام ہی یکسر بدل دی گئی ہے، دوسرے: اس میں تین غزلیں اور ایک نظم محذوف ہیں اور کچھ عنوانات پر بھی حذف و ترمیم کی قینچی چلائی گئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ آگے چل کر اس طرح کی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی کا سلسلہ بڑھتا جائے گا۔

ان معروضات پر سامنے آنے والا واحد ردِ عمل جناب رشید حسن خاں کا تھا۔ راقم کو آٹھ صفحات پر مشتمل ان کا ایک مفصل خط (مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۹۲ء) موصول ہوا۔ یہی وہ خط ہے جس کا ذکر، خاں صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اُس خط میں اُردو اور فارسی کلیاتِ اقبال کے نسخے اقبال اکادمی پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر مجھے خوشی ہوئی کہ نقارخانے میں طوطی کی آواز کسی نے تو سنی۔ مذکورہ خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

سیارہ کے حالیہ شمارے میں اقبالیات سے متعلق مطبوعات پر آپ کا مضمون پڑھا۔ میں نے پہلے بھی مختصر سا ایک خط اس سلسلے میں آپ کو لکھا تھا، جو غالباً آپ کے پاس محفوظ نہیں رہ سکا۔ ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ سے مکمل اتفاق ہے کہ 'اقبال اکادمی پاکستان نے اُردو فارسی کلیات جو شائع کیے ہیں، کلامِ اقبال کے ایسے دیدہ زیب ایڈیشن کبھی شائع نہیں ہوئے'..... دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا دیدہ زیبی، صحتِ متن اور



کلامِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

معیارِ تدوین کا بدل ہو سکتی ہے؟ آپ سے یوں پوچھ رہا ہوں کہ میری نظر میں اس وقت اس معاملے میں جس وقتِ نظر سے آپ کام لیتے ہیں، دوسروں کے یہاں وہ انداز نہیں پایا جاتا۔ میں کسی اور سے یہ سوال کرتا بھی نہیں۔ آپ کو مخاطب صحیح مانتا ہوں، یوں پوچھ رہا ہوں، ۵۔

میں اس خط کو سیارہ میں شائع کرانا چاہتا تھا لیکن بوجہ ایسا نہ ہو سکا اور یہ اچھا ہوا کیونکہ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر خاں صاحب نے اس موضوع پر دوبارہ قلم اٹھایا۔ مذکورہ خط بیش تر اُنھی نکات پر مشتمل ہے جو نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے مضمون میں شامل ہیں۔<sup>۱</sup>

جناب رشید حسن خاں کا زیادہ تر تحقیقی کام اصولِ تحقیق و تدوین، زبان، قواعد، لغت اور املا پر ہے۔ اُردو زبان و ادب سے متعلق اُنھوں نے بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اب اقبالیات کی طرف اُن کی توجہ اور اعتنا، مجھ جیسے اقبالیات کے طالبِ علم کے لیے قلبی مسرت کا باعث ہے، بلکہ اُن کے اس اعتنا کو اقبالیات کی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ خاں صاحب نے اُردو زبان و ادب، خصوصاً تدوین و تحقیق کے شعبے میں ناقابلِ فراموش کام انجام دیے ہیں۔ اُن کی مرتبہ کلاسیکی ادب کی کتابیں (باغ و بہار، فسانہ عجائب، گلزارِ نسیم، سحر البیان اور مثنویاتِ شوق اور زلٹ نامہ) اُردو میں تحقیق و تدوین کا ایک معیاری اور بے مثل نمونہ ہیں۔ کلاسیکی ادب کی فوہنگ اور مصطلحاتِ ٹھگی ان کے تازہ کارنامے ہیں۔

جناب رشید حسن خاں، جاہِ طلبی، شہرتِ پسندی اور نفسِ پرستی کے اس دور اور منافقت کے اس ماحول میں (جس کا ذکر خاں صاحب نے ایک بار اس طرح کیا تھا کہ میں ۲۲، ۲۳ سال سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہاں کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے؟) حق گوئی و بے باکی کے راستے پر گامزن ہیں۔ اگر وہ مصلحتِ کوشی یا خوشامدِ پرستی کا راستہ اختیار کرتے تو حصولِ جاہ و دولت اُن کے لیے مشکل نہ تھا۔ ہمارے دور کے بیشتر نام و ر، قابل اور ذہین و فطین لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ اُن کی ساری صلاحیتیں اور ذہانتیں، مصلحتِ اندیشی کے کھونٹے کے گرد گھومتے

گھومتے نہڑ جاتی ہیں۔

جناب رشید حسن خاں میرے نزدیک بڑے آدمی ہیں، اور اُن کی بڑائی یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی ذات اور اپنے ضمیر سے جو محکم تعہد (commitment) کیا تھا، وہ اُس سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ اگر وہ رابع صدی (یا شاید اس سے بھی زائد عرصے) تک گائراہل، دہلی یونیورسٹی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں گوشہ گیر نہ رہتے، تو اُردو کا تحقیقی سرمایہ چند اعلا پاپے کی تصانیف سے ہی دامن رہتا۔

اس طویل جملہ معترضہ کی معذرت چاہتا ہوں۔

خاں صاحب نے اکادمی کے شائع کردہ ڈی لکس اڈیشن پر بحث کی ہے۔ اس اڈیشن کے 'خراج عقیدت' والا نسخہ ('نقش اول' کہہ لیجیے) شہرت بخاری صاحب کے دورِ نظامت میں شائع ہوا تھا۔ وہ رخصت ہوئے تو خراج عقیدت والے صفحات نکال کر اُن کی جگہ کچھ دوسرا لوازمہ شامل کیا گیا، مگر اُس 'نقش دوم' میں اُن تبدیلیوں کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، اسی لیے یہ تبدیلیاں قاری کے لیے اُلجھن کا باعث بنتی ہیں۔ اُردو اور فارسی کلیات کے 'نقش اول' اور 'نقش دوم' میں بہت سے اختلافات ہیں، راقم نے اپنی زیر ترتیب کتابیات اقبال میں جملہ اختلافات کی نشان دہی کر دی ہے۔ خاں صاحب نے متذکرہ بالا خط میں اُن پر بار بار حیرانی و پریشانی کا اظہار کیا ہے:

'اب صحیح معنوں میں حیرت ہوئی'.....

.....'جو اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہے'.....

.....'مجھے حیرت اور بہت حیرت ہے کہ'.....

.....'تعجب ہے اور بہت'.....

۱۹۹۰ء کے ڈی لکس اڈیشن میں (اسے یہ نام اکادمی کے عوامی اڈیشن ۱۹۹۴ء کے

'پیش لفظ' از ڈاکٹر وحید قریشی میں دیا گیا ہے، ص ۷) ترتیبِ کلام، شیخ غلام علی اڈیشن

(= نسخہ 'غ ع') کے مطابق ہے۔ نسخہ 'غ ع' میں علامہ اقبال کی قائم کردہ ترتیب میں متعدد

تصریحات کیے گئے تھے۔ راقم نے اس کی نشان دہی بھی کی مگر افسوس ہے کہ اُن کی اصلاح

کلامِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

نہیں کی گئی، مثلاً: بالِ جبیریل کی قدیم اشاعتوں میں کچھ قطعے [یا رباعیات] مختلف غزلوں کے آخر میں درج ہیں۔ نسخہٴ غ ع میں اُن قطعات کی ترتیب قطعی من مانے طریقے سے بدل دی گئی ہے، مثلاً: نمبر ۱ کے آخر کا قطعہ (ترے شیشے میں ..... ) نمبر ۲ کے آخر میں، نمبر ۳ کے آخر کا قطعہ (دلوں کو مرکز ..... ) نمبر ۵ کے آخر میں اور باقی اشعار [یا قطعات] کو نظموں سے ما قبل حصے میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس حصے میں علامہ نے جو قطعات یکجا دیے تھے، ان پر کوئی عنوان نہیں تھا، اب نسخہٴ غ ع میں بالکل ناروا طریقے سے ان سب پر 'رباعیات' کا عنوان جڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض منظومات (ہسپانیہ، روحِ ارضی آدم کا ---، پیر و مرید، جبریل و ابلیس) کے آخر کے قطعات میں سے، کچھ تو 'رباعیات' کے تحت دے دیے گئے ہیں اور بعض کو کتاب کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔ نظم 'لالہ صحرا' کے آخر کے دو بلاعنوان شعروں (اقبال نے کل ..... ) کو نظم 'دعا' (ص ۹۰) سے پہلے خود ساختہ عنوان 'قطعہ' کے تحت درج کیا گیا ہے۔

اپنے شعری مجموعوں کی کتابت، علامہ خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے۔ کلامِ اقبال کی بیاضیں اور مختلف مجموعوں کے مسودے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ غزلوں، نظموں اور قطعات کی ترتیب اور اشعار کو بالمقابل یا اوپر نیچے لکھنے کے بارے میں کاتب کو واضح طور پر تحریری ہدایات دیتے، مثلاً: بالِ جبیریل کے ایک مسودے میں غزل ۱۴ (اپنی جولاں گاہ ..... ) کے مصرعے نقل نویس نے آمنے سامنے لکھ دیے تھے، اس پر علامہ کی حسب ذیل دست نوشت ہدایت، درج ہے:

ہدایت برائے کاتب

(ایک مصرع دوسرے مصرع کے نیچے لکھو)

نہ کہ بالمقابل

اسی طرح بالِ جبیریل کے ایک مسودے میں نظم 'الارض للہ' کے ساتھ بخطِ اقبال

یہ ہدایت درج ہے:

ایک مصرع دوسرے مصرع کے نیچے لکھو

پرویں رقم کو تو بذریعہ رقعات واضح ہدایات دیتے رہے کہ کون سا قطعہ [یا رباعی] کہاں، کس غزل کے آخر میں درج کی جائے گی۔ (دیکھیے: زیر نظر کتاب میں شامل مضمون: 'غیر مطبوعہ رقعات بنام پرویں رقم')

اب جو شخص اپنے کلام کی کتابت تک کے بارے میں ایک واضح تصور رکھتا ہو اور اس سلسلے میں حساس بھی ہو، اس کے کلام کی ترتیب میں متذکرہ بالا نوعیت کی تبدیلیاں، تقدیم و تاخیر اور ایک حصے پر رباعیات کا نیا عنوان قائم کرنا بالکل بے جواز اور ناجائز ہے بلکہ، اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی ہے۔ چنانچہ مرتبین یا ناشر کو کسی صورت بھی علامہ اقبال کی قائم کردہ ترتیب کلام کو بدلنے کا حق نہ تھا۔<sup>۵</sup>

کسی خرابی کی اصلاح بروقت نہ کی جائے تو اس سے مزید خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ راقم نے ۱۹۸۲ء میں نسخہ غ غ میں، ترتیب کلام میں تحریف، املا، کتابت اور لفظی غلطیوں کی نشان دہی کی تھی۔ مگر ناشر کی بے نیازی، بے اعتنائی اور تغافل خوب ہے کہ ابھی تک ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ۱۹۹۰ء کے نسخہ اقبال اکادمی میں املا، کتابت اور لفظی اغلاط تو درست کر دی گئیں، مگر ترتیب کلام کو بدلنے کی جو بدعت، پہلی بار نسخہ غ غ میں اختیار کی گئی تھی، نسخہ اکادمی میں بھی اسی کی پیروی کی گئی۔ نسخہ اکادمی کے مقدمے میں کہا گیا ہے کہ ہم نے بال جبریل کی دو بیٹیوں کو مناسب مقامات پر منتقل کر دیا..... حالانکہ یہ انتقال، تو نسخہ غ غ ہی میں ہو چکا تھا، آپ نے تو صرف اس کی پیروی کی ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ اس باب میں ہم نے معیاری رواج کو ترجیح دی۔ سوال یہ ہے کہ نسخہ غ غ کیسے 'معیاری رواج' ہو گیا؟ اور کیا علامہ اقبال کی قائم کردہ ترتیب کلام پر 'معیاری رواج' مقدم ہے؟

نسخہ اکادمی میں، افسوس ہے کہ، ترتیب کلام کی اصل صورت بحال نہ ہو سکی۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر، بال جبریل کے پہلے اور دوسرے حصے پر، فہرست میں اور متن کے صفحات پر بھی 'غزلیات' کا عنوان لگا دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کیوں؟ علامہ نے بانگِ درا کی غزلیات پر تینوں حصوں میں 'غزلیات' کا عنوان لگایا تھا۔ ضربِ کلیم میں

کلامِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

بھی جگہ جگہ 'غزل' کا عنوان ملتا ہے۔ آخر وہ بالِ جبیریل میں عنوان لگانا کیوں بھول گئے؟ جناب شمس الرحمن فاروقی کا خیال ہے کہ اقبال نے اپنے کلام کے اس حصے پر صرف نمبر (ایک تا سولہ، پھر ایک تا اکٹھ) اس لیے لگائے ہیں کہ اسے غزل کی طرح نہ پڑھا جائے۔ حصہ اول کا نمبر پانچ تو غزل کی ہیئت میں بھی نہیں ہے،<sup>۹</sup> علامہ اقبال کے بیشتر نقاد انھیں غزلیات کہنے میں متامل ہیں۔

بالِ جبیریل کی ایک بیاض سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ان 'غزلیات' میں سے بعض کو علامہ نظمیں سمجھتے تھے، مثلاً: بیاض میں، حصہ اول کے نمبر ۵ کے اشعار، سب سے پہلے بطور ایک نظم بعنوان: 'زندگی درج ہیں۔ بعد ازاں انھیں 'عشق' کا عنوان دیا گیا ہے۔ پھر علامہ نے ان اشعار کے لیے تیسرا عنوان: 'دعا' تجویز کیا۔ آخر میں یہ عنوان بھی قلم زد کر دیا۔ اور (بقول شمس الرحمن فاروقی) یہ 'منظومہ بلا عنوان ہی پہلے حصے میں شامل ہوا۔ اس 'غزل' کی ظاہری ہیئت بھی غزل کی نہیں ہے، آخری شعر کی ردیف اور قافیہ، پہلے چار شعروں سے مختلف ہیں۔

ایک اور مثال: دوسرے حصے میں نمبر ۷ کے اشعار کے لیے، سب سے پہلے علامہ نے 'لندن' کا عنوان تجویز کیا، پھر اسے کاٹ کر 'فرنگ' سے تبدیل کیا گیا۔ آخر میں صرف اس وضاحت پر اکتفا کیا کہ: 'یورپ میں لکھے گئے'۔ بذاتِ خود یہ عنوان بتا رہا ہے کہ لکھنے والا، ان اشعار کو 'غزل' نہیں سمجھتا، ورنہ یہ وضاحت یوں ہوتی: [یہ 'غزل'] 'یورپ میں لکھی گئی'۔ یہی صورت نمبر ۵ (لندن میں لکھے گئے) ۸ (کابل میں لکھے گئے) ۱۳ (قرطبہ میں لکھے گئے) ۱۷، ۲۸ (یورپ میں لکھے گئے) اور ۳۱ (فرانس میں لکھے گئے) کی ہے۔<sup>۱۰</sup>

لہذا حصہ اول اور دوم کی متذکرہ نمبروں والی ان غزل نما نظموں یا 'منظوموں' پر 'غزلیات' کا عنوان قائم کرنا علامہ اقبال اور کلامِ اقبال کے ساتھ ایک زیادتی ہے۔

نسخہ اکادمی کی تیاری کے لیے غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ مقدمے میں کلامِ اقبال کی خطاطی اور پرویس رقم کے 'حسنِ کتابت' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ موجودہ خوش نویسی جمیل احمد قریشی کے 'مخصوص اور منفرد اسلوب' اور ان کی 'تخلیقی اچھ' کا نمونہ ہے۔ بجا،

مگر سوال یہ ہے کہ کلیاتِ اُردو کی کتابت باعتبارِ قلم ہموار و یکساں کیوں نہیں ہے؟ بانگِ درا کا قلم خفی ہے، بالِ جبیریل کے بعض حصوں کا ذرا جلی اور ضربِ کلیم کا واضح طور پر جلی، اور اگر آپ فارسی مجموعوں (پیامِ مشرق، جاوید نامہ وغیرہ) کی فہارس کا اُردو مجموعوں (بانگِ درا وغیرہ) کی فہارس سے موازنہ کریں تو قلم کی ناہمواری اور زیادہ کھلے گی۔ راقم کے نزدیک تو خصوصی اہتمام سے تیار کیے جانے والے خاص الخاص اڈیشنوں کی یہ بھی ایک خامی ہے۔

ڈی لکس اڈیشن (۱۹۹۰ء) کے بعد، اُسی کتابت کی بنیاد پر دو نئے اڈیشن چھپے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں 'سپر ڈی لکس اڈیشن' اس اڈیشن کو یہ نام اکادمی کی تازہ فہرستِ مطبوعات میں دیا گیا ہے۔ یہ، ڈی لکس اڈیشن سے مختلف اڈیشن ہے۔ (اس پر نکین حاشیے کے بجائے ایک رنگ میں سادہ حاشیہ ہے، اسی لیے اکادمی نے دونوں کے الگ الگ نام رکھے ہیں) سپر ڈی لکس اڈیشن کو 'اشاعت دوم' قرار دیا گیا ہے۔ اس کی توجیہ کیا اور کیسے کی جائے؟ ایک اور اشاعت نسبتاً چھوٹی تقطیع (۱۴×۲۲ س م) پر موسوم بہ 'عوامی اڈیشن' (بمطابق پرنٹ لائن) سپر ڈی لکس اڈیشن سے قبل سامنے آئی ہے۔ اُس پر بھی 'اشاعت دوم' کے الفاظ درج ہیں۔ گویا سپر ڈی لکس اڈیشن بھی 'اشاعت دوم' ہے اور عوامی اڈیشن بھی 'اشاعت دوم'۔

۱۹۹۴ء کے عوامی اڈیشن پر ڈاکٹر وحید قریشی کے 'پیش لفظ' کی دوسطریں [اگر اسے پذیرائی ملی تو ان شاء اللہ اگلا اڈیشن قیمت کے لحاظ سے مزید سستا اور کاغذ کے لحاظ سے بہتر ہوگا۔۔۔] ۱۹۹۵ء اور مابعد اڈیشنوں سے حذف کر دی گئی ہیں، مناسب ہوتا کہ انھیں جوں کا توں رہنے دیا جاتا اور ۱۹۹۵ء کے اڈیشن کے لیے، ایک نیا مختصر دیباچہ شامل کیا جاتا۔ ہر دیباچے پر تاریخ بھی ہونی چاہیے۔ بعد ازاں ۲۰۰۰ء کے اڈیشن سے ڈاکٹر وحید قریشی کا 'پیش لفظ' بالکل ہی اڑا دیا گیا۔

ماسوا ڈی لکس اڈیشن کے 'نقش اول' کے، تمام اڈیشنوں پر مجلسِ مشاورت کے تحت دس اصحاب کے نام درج ہیں۔ سرِ فہرست جناب رشید حسن خاں کا نام ہے اور

کلام اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

پانچویں نمبر پر راقم آثم کا بھی۔ مقدمے میں کہا گیا ہے کہ اُس نسخے میں سابق ترتیب اور املا میں کہیں کہیں کچھ تبدیلیاں نظر آئیں گی جو ہمارے زمانے کے سربرآوردہ اقبال شناسوں اور زبان دانوں کی باہمی مشاورت کا نتیجہ ہیں‘ (ص ۱۲)۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے ایک جگہ یوں وضاحت کی ہے: ’مجلس مشاورت میں میرا نام بھی ہے اُس کا علم تو مجھے اُس وقت ہوا جب اقبال اکادمی نے چھپا ہوا نسخہ کَلّیات ڈاک سے بھیجا۔ کسی جلسے میں شریک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا‘۔<sup>۱۱</sup>

راقم کو اُس قدر علم ہے کہ مجلس مشاورت کا جو واحد اجلاس اکادمی میں ہوا تھا، اُس میں خاں صاحب شریک نہیں تھے۔ باقی سب اصحاب موجود تھے اور جناب شان الحق حقی خصوصی دعوت پر شریک ہوئے تھے۔ اُس اجلاس میں زیادہ تر بعض الفاظ کے املا پر بحث ہوئی تھی، ترتیب کلام میں تبدیلی کا مسئلہ زیر غور نہیں آیا۔

علامہ اقبال کے فارسی اور اُردو کَلّیات میں بہت سی خامیوں اور ناہمواریوں کا ایک سبب تو یہ ہے کہ رشید حسن خاں جیسے لوگ جس باریک بینی اور دقتِ نظر کے عادی ہیں، اِلّا ماشاء اللہ پیشتر نام و ر لکھنے والوں، نقادوں اور تحقیق کاروں اور ناشرین خصوصاً سرکاری اداروں کے ہاں اُس کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس ہر شے کو ایک طائرانہ نظر اور ظاہری اور نمائشی زاویے سے دیکھنے کا رجحان غالب ہے (نسخہ اکادمی کے مقدمے میں ’آرائشی فضا‘ اور ’آرائشی پہلو‘ کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے)۔ جن چیزوں پر خاں صاحب نے گرفت کی ہے، ناشرین اور مرتبین کے نزدیک اُن کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ نسخہ شیخ غ ع اور اب نسخہ اکادمی کی تمام اشاعتوں میں ’بیئر سٹریٹ لاء‘ (ص ۳۵) لکھا ہے۔ اسی طرح سے نسخہ اکادمی کے مقدمے میں لفظ املا کو ہر جگہ ’املاء‘ لکھا گیا ہے۔ اب لطیفہ یہ ہے کہ اِس مقدمے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے ’املا کی اساس‘ رواج کی بجائے استناد، پر رکھی ہے۔<sup>۱۲</sup>

رشید حسن خاں صاحب نے کَلّیاتِ اقبال، فارسی کے نسخہ اکادمی میں لفظوں کی صورت نگاری میں تضادات اور املائی نظام کے انتشار کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ اِس کا

ایک سبب اُن کے الفاظ میں یہ ہے کہ اُس میں جدید ایرانی املا کو اختیار کیا گیا ہے..... راقم اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ اس نسخے کو ایرانیوں ہی کے لیے (نہ کہ برعظیم کے قارئین کے لیے) تیار اور شائع کیا گیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں بلکہ ایرانیوں کے لیے پاکستان کی جانب سے ایک اچھا ارمان ہے۔ اس کا ثبوت (کہ یہ نسخہ ایرانیوں کے لیے ہی تیار کیا گیا ہے) کئی طرح سے ملتا ہے، مثلاً: پیام مشرق کے اُردو دیباچے (از علامہ اقبال) کی جگہ اُس کا فارسی ترجمہ دیا گیا ہے۔ بعض مختصر حواشی کو بھی فارسی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ سرورق پر پیام مشرق کے بعد اُس کے ضمنی عنوان 'در جواب دیوان شاعر المانوی گوئے' میں تحریف کر کے اُسے اس طرح بدل دیا گیا ہے: 'در جواب دیوان گوئے شاعر آلمانی'۔ یہ تحریف (جب علامہ اقبال کے الفاظ کو تبدیل کیا جائے گا تو یہ 'تحریف' ہی کہلائے گی) مفہوم کو غالباً جدید ایرانی روزمرہ کے مطابق ادا کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ [پھر تو اقبال کا بہت سا فارسی منظوم کلام بھی جدید ایرانی روزمرہ اور لب و لہجے کے مطابق بدلنے کی ضرورت ہے۔]

پیام مشرق کے سرورق کا ذکر آیا تو یہاں ایک فاش اور سخت قابلِ اعتراض غلطی کی گئی ہے۔ پیشانی پر قدیم اشاعتوں میں اور نسخہ 'غ' پر بھی سورہ البقرہ کی آیت ۱۱۵ کا یہ ٹکڑا درج چلا آ رہا ہے: 'وللہ المشرق والمغرب - زیر بحث کلمات میں واو حذف کر دی گئی ہے (ص ۱۷۷)۔ اگرچہ آیت کے اس جزو کو واو کے بغیر بھی لکھنے کی گنجائش موجود ہے، کیوں کہ سورہ البقرہ کی آیت ۱۴۲ میں یہ واو کے بغیر بھی ہے، لیکن جب علامہ اقبال نے آیت ۱۱۵ کا جزو لکھا تو یہاں سے واو اڑانا قطعاً غلط ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، یہ تو مسلم ہے (اور مستحسن بھی) کہ یہ نسخہ ایرانیوں کے لیے ہے۔ اب یہ باعثِ تعجب ہے کہ اس کا پیش لفظ، پیش گفتار اور مقدمہ، تینوں اُردو میں ہیں۔ اس کی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر پیام مشرق کا اُردو دیباچہ، اُردو کے بجائے فارسی میں دینا ضروری تھا تو پورے کلمات کا پیش لفظ وغیرہ (بلکہ پرنٹ لائن کے اندراجات بھی) فارسی ہی میں دینا مناسب تھا۔ اس نسخے کا قاری ایرانی ہے جو اُردو سے نابلد ہے۔



کلامِ اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

نسخہ اکادمی کے بارے میں کہنے کی باتیں کچھ اور بھی ہیں، مگر دو ایک باتوں کی نشان دہی کر کے سرد دست اپنی معروضات ختم کرتا ہوں۔ ص ۲۲ پر اقبال کے سوادِ خط میں یہ تحریر درج ہے:

مثنوی

پیامِ سروش

از

محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا، لاہور

درفروزی ۱۵ اہتمام یافت

سامنے کے ص ۲۳ سے مثنوی اسرارِ خودی شروع ہو رہی ہے۔ ایرانی قاری تو چکرا جائے گا کہ یہ مثنوی پیامِ سروش کہاں سے آگئی؟ پورے کلیات میں کہیں اس کا ذکر یا وجود نہیں ہے؟ --- یہ علم اُس کے فرشتوں کو بھی نہ ہوگا (اور ہمارے قارئین میں سے بھی کتنوں کو اس کا علم ہے؟) کہ اسرارِ خودی کا ابتدائی نام پیامِ سروش تھا۔ یہاں حاشیے میں اس کی وضاحت از بس ضروری تھی۔

فارسی کلیات کا ایک اور پہلو ہے، جس کا ذکر رشید حسن خاں صاحب کے مضمون میں نہیں آسکا، مگر راقم کے نام اُن کے متذکرہ بالا خط میں اُس کا ذکر ہے، لہذا خط کا متعلقہ حصہ یہاں نقل کرتا ہوں، لکھتے ہیں:

میرے پاس پہلے کے چھپے ہوئے نسخے کلامِ اقبال کے موجود ہیں۔ اُن کو دیکھتا ہوں اور اس جدید نسخے کو دیکھتا ہوں تو بعض مقامات پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سمجھوں۔ میں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، مگر یہ عرض ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی مثالیں اس میں متعدد ہیں اور خاصی پریشان کن۔

ص ۳۳۲ پر ایک عنوان ہے 'جلال و گوئنہ'۔ پہلے تو یہی سمجھے میں دیر لگی کہ یہ 'گوئنہ' کیا بلا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ 'گوئنہ' کی مسخ شدہ صورت ہے۔ خیر، میرے پاس پیامِ مشرق کا بارہواں ایڈیشن ہے جس کے آخر میں یہ مرقوم ہے کہ 'پاکستان ٹائمز پریس لاہور میں چھپوا کر ڈاکٹر جاوید اقبال بار

ایٹ لاء نے جاوید منزل علامہ اقبال روڈ لاہور سے شائع کی۔ اس اڈیشن میں مذکورہ نظم کا عنوان ہے: 'جلال و گونے'۔۔۔ دونوں ناموں پر خط کھینچے ہوئے ہیں، جس سے بیک نظر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام لفظ نہیں، نام ہیں۔ اسی صفحے پر ایک فٹ نوٹ ہے، جس میں ساڑھے تین سطریں ہیں، جو یہاں سے شروع ہوتا ہے: 'نوٹ: مکتبہ دان المنی سے مراد گونے ہے.....' یہ نوٹ اس نسخے میں موجود نہیں اور کہیں بھی اس کا ذکر اس نسخے میں نہیں ملتا۔ سوال یہ ہے کہ فٹ نوٹ کی یہ عبارت کیا اقبال کی نہیں، کسی دوسرے کی لکھی ہوئی ہے؟ اس صورت میں اس کی صراحت واجب تھی۔ اگر اقبال کی ہے تو اس کی شمولیت لازم تھی۔ اسے شامل نہیں کیا گیا تو صراحت ضروری تھی۔ یہ صرف ایک فٹ نوٹ کی بات نہیں، کئی ایسے فٹ نوٹ ہیں۔ مثلاً بازن، میٹھے، پٹونی،۔۔۔ 'پٹونی' کے عنوان کے نیچے ایک فارسی عبارت ہے۔ اصل متن میں یہ عبارت اس جدید نسخے میں شامل نہیں۔ کیا یہ عبارت اقبال کی نہیں، کسی اور کی ہے؟ پھر ناموں کو جس بری طرح مخ کیا گیا ہے مذاق ایرانی کی پیروی میں، وہ عبرت طلب ہے، مثلاً (نسخہ قدیم) کے 'میٹھے' نے نسخہ جدید میں 'مچھے' کی صورت اختیار کر لی ہے (ص ۳۲۹)۔ ہندستان میں 'مچھے' تو حقے کا ہوا کرتا ہے۔ اقبال نے نظم کا عنوان 'حکیم آئن اسٹائن' رکھا تھا (نسخہ قدیم) اب وہ 'حکیم ایٹسٹین' بن گیا (ص ۳۲۸)۔ معلوم نہیں بن گیا یا بگڑ گیا، مگر یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ اقبال نے اس طرح نہیں لکھا تھا۔

رشید حسن خاں نے مفضل حواشی کو بھی تحقیقی اڈیشن کی ضرورت بتایا ہے۔ اکادمی کے ۱۹۹۰ء اڈیشن، نقش دوم کے 'پیش لفظ' میں مطبوعہ حواشی کا ذکر بایں الفاظ ملتا ہے: کلیات میں کئی مقامات توضیح طلب ہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حواشی لکھوائے گئے اور ان کی ایک الگ جلد بنا دی گئی، (ص ۱۲)۔ مذکورہ 'پیش لفظ' ۱۵ جون ۱۹۸۹ء کو لکھا گیا تھا۔ راقم کے علم میں ہے کہ حواشی کا ایک حصہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (م: جون ۲۰۰۰ء) سے لکھوایا گیا تھا۔ یہ پیش لفظ، نسخہ اکادمی کے عوامی اڈیشن ۱۹۹۵ء تک میں شامل رہا ہے۔ گویا اس وقت تک ناشر، حواشی کی الگ جلد چھاپنے کے وعدے پر قائم تھے۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا؟ اب ۲۰۰۰ء کے اڈیشن میں وہ پیش لفظ موجود نہیں ہے، تو کیا یہ سمجھا جائے کہ ناشر نے موعودہ حواشی چھاپنے کی ذمہ داری سے ہاتھ کھینچ لیا ہے؟

## حوالے اور حواشی

- ۱- تصانیف اقبال، ص ۵۸۔
  - ۲- سیارہ، لاہور، اقبال نمبر ۱۹۹۲ء، ص ۴۵۷۔
  - ۳- ایضاً، ص ۲۵۹-۲۶۰۔
  - ۴- یہ مضمون زیر نظر مجموعے کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل ہے۔
  - ۵- غیر مطبوعہ خط بنام راقم۔
  - ۶- دیکھیے حوالہ ۴۔
  - ۷- ذہانت اور صلاحیت تو وہی ہے، انسان کی آزمائش تو اس میں ہوتی ہے کہ وہ اپنی وہی صلاحیت کو کس 'کسب' میں صرف کرتا ہے۔ صلاحیت کے استعمال کا رُخ مثبت اور تعمیری ہو اور انسان خدا یا کم از کم اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہی کے احساس سے غافل نہ ہو تو وہ 'عروج آدم خاکی' کی مثال بن جاتا ہے، بصورت دیگر پستی اور زوالِ علم و عرفان کا عبرت ناک نمونہ۔۔۔!
- علی گڑھ سے محبت مکرّم پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا ارسال کردہ نقد و نظر کا تازہ شمارہ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، سیاست، دانش وری اور تعلیم کے شعبوں میں اس دور کا ایک بڑا نام ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز ہو کر وہ ترقی اور عروج کی انتہا کو پہنچ گئے۔ بڑے عظیم میں کوئی شخص، خصوصاً ایک بھارتی مسلمان، اس سے بڑے عہدے کا تصور نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا سیاسی گراف تو بہت اونچا چلا گیا، مگر تعلیم (جو اُن کا اصل میدان تھا) یا دانش وری، تہذیب یا انسانیت کے بارے میں ان کی آدرشیں کیا ہوئیں؟۔۔۔ اُن کے قریبی رفیق اور دانش ور پروفیسر محمد مجیب نے ان کی سوانح عمری لکھی ہے۔ نقد و نظر میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، اسلوب صاحب نے ذاکر صاحب کی بہت سی شخصی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس مصلحت اندیشی اور ذاکر صاحب کے ذہن و فکر کی اس سنج پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کی بنا پر، اپنے تئیں بلند ترین منصب پالینے کے باوجود، بھارتی مسلمانوں کے نزدیک، اُن کی زندگی ایک 'الیے' پر منتج ہوئی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:
- 'حکمتِ عملی اور مصلحتِ اندیشی، ان کی زندگی کے دو بنیادی تشکیلی اصول تھے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ مفاہمت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور کسی طرح کے محکم تعہد (commitment) کی نفی کرتا ہے۔ مصلحتِ اندیشی، حق شناسی اور حق گوئی کے راستے میں، ان کے لیے عمر بھر زنجیر پابنی رہی۔

ذاکر صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مولانا محمد علی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مہاتما گاندھی کی منشا کے عین مطابق، علی گڑھ کالج کے خلاف بغاوت کا علم اٹھایا۔ اس بغاوت کا مقصد سر تا سر علی گڑھ کی مرکزیت پر ضرب کاری لگانا تھا..... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے بڑے قابل قدر کام کیے [مگر]..... بعض اوقات صاحبان جاہ و منصب کے زیر اثر اور ان کے دباؤ میں آکر نامنصفانہ طور پر اور جانب داری کے ساتھ، ایسے لوگوں کو آگے بڑھایا جو اس اعزاز اور ترقی کے کسی طرح بھی مستحق نہیں تھے،۔

ایک بار پنڈت نہرو یونیورسٹی میں آئے تو ذاکر صاحب نے کہا: یونیورسٹی کے طلبہ کو آپ سے ایسا پریم ہے گو یا وہ آپ کی پوجا کرتے ہیں۔ اس پر اسلوب صاحب کا تبصرہ: 'تمہلق اور چا پوسی کی بھی بہر حال ایک حد ہونی چاہیے'۔

اس کے بعد اسلوب صاحب بتاتے ہیں کہ ذاکر صاحب کی دوسری مدت میں چار سال باقی تھے کہ وہ مستعفی ہو گئے۔ چند ماہ بعد بہار کے گورنر بنے اور پھر تو برابر ان کے درجات بلند ہی ہوتے چلے گئے۔ علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت وہ یہ کہہ کر گئے تھے کہ وہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام جامعہ کی پرسکون فضا میں رہ کر علمی کاموں کی انجام دہی میں صرف کریں گے، مگر شاید حالات نے اس کی اجازت نہیں دی اور انہیں اپنی اس خواہش اور فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ اگر وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کی گھڑیاں علمی کاموں کی نذر کر دیتے تو قومی خدمت کے سنہری مواقع کہاں ہاتھ لگتے۔ علمی اور ادبی کام تو بیشتر صورتوں میں بے مصرف ہی ہوتے ہیں،۔۔۔۔

یہاں اسلوب صاحب نے 'قومی خدمت' کا جو ذکر کیا ہے اس کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ لکھتے ہیں: 'صدر جمہور یہ ہو جانے کے بعد سادہ لوح مسلمان انہیں اپنا سمجھ کر اپنے دکھ درد کا مداوا اُن سے چاہتے تھے۔ ذاکر صاحب کے طبع نازک پر یہ بات گراں گزرتی تھی کہ ان سے اس بارے میں رجوع کیا جائے..... نہ انہوں نے اُردو کی حمایت میں کچھ کہا اور نہ فسادات میں مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان کے سلسلے میں لب کشائی کی..... ذاکر صاحب کے ذہن اور فطین اور اعلیٰ فن کار ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن اُن کا کوئی کارنامہ نہیں ہے'۔

ذاکر صاحب کی اس مثال سے یہ واضح ہے کہ انسان کی ذہانت و فطانت، مصلحت کوشی کو راہ نمابا لے تو حاصل حیات کیا ہوتا ہے۔

محض ترتیب کلام میں تبدیلی سے گمراہ کن نتائج نکل سکتے ہیں، مثلاً شمس الرحمن فاروقی کے سامنے بال جبریل کا قدیم نسخہ موجود نہ تھا، انہوں نے نسخہ غوغ کی تبدیل شدہ ترتیب سے کچھ نتائج اخذ

کلام اقبال کی معیاری تدوین و اشاعت

کے، جو ظاہر ہے، درست نہیں (اقبال اور غزل، مرتب: محمد امین اندرانی۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر، ۱۹۸۸ء، ص ۳۷-۳۸)

۹- مضمون: 'اردو غزل کی روایت اور اقبال'، مشمولہ: اقبال اور غزل، ص ۳۶-۳۷۔

۱۰- ڈاکٹر محمد صدیق جاوید نے بھی یہی دلیل دی ہے، دیکھیے: بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ، القمر انٹرنیشنل پرائز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۸۰۔

۱۱- تدوین: تحقیق، روایت، ص ۱۲۳۔

۱۲- نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان و ادب سے متعلق ہمارے بیش تر ادارے زبان اور املا کی صحت سے بے نیازی دکھا رہے ہیں، بلکہ غفلت برت رہے ہیں۔ اپنے مذاکروں میں بحث و مباحثے کے بعد، وہ جن اصولوں پر اتفاق کرتے ہیں اور جنہیں وہ اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں، انہی اداروں کی مطبوعات میں ان کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ایک دل چسپ مثال ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کی شائع کردہ کتاب اردو میں فنی تدوین: تعارف و تجزیہ ہے، جس پر ڈاکٹر عطا خورشید کا مفضل تبصرہ مجلہ تحقیق حیدرآباد (شمارہ ۸، ۹، فروری ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا ہے۔

ہائڈل برگ یونیورسٹی میں اردو کی استاد ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہلڈ کا ایک خط اخبارِ اردو اسلام آباد (مئی ۱۹۹۶ء) میں چھپا تھا۔ لکھتی ہیں: 'میرے پاس رشید حسن خان [جی ہاں، اخبارِ اردو نے 'خان' کو 'خان' لکھا ہے] کی لکھی ہوئی اردو املا اور گوپی چند نارنگ کا مرتب کیا ہوا املا نامہ ہے' لیکن مجھے اکثر و بیش تر اردو کتابوں، اخبارات اور رسالوں میں لکھنے کے ایسے طریقے نظر آتے ہیں جو دونوں کتابوں کے مطابق غلط ہیں، مثلاً: 'کے ذریعے'؟ 'کے ذریعہ' وغیرہ، یعنی محرف شکل میں بھی 'ہ' لکھا جاتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں کسی نے کچھ لکھا ہے؟ ہماری مشکل تو یہ ہوتی ہے کہ اپنے طلبہ کو آخر کیا پڑھائیں؟ اگر آپ اس سلسلے میں کوئی کتاب یا مقالہ تجویز کر سکیں تو عنایت ہوگی، --- اڈیٹ صاحب نے کرسٹینا صاحبہ کا یہ خط تو چھاپ دیا، مگر ان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ [اور جواب دیتے بھی کیا؟ املا اور لکھاؤ کے جو اصول کتابوں میں درج ہیں، ان پر عمل اخبارِ اردو میں بھی نہیں ہوتا] ممکن ہے اڈیٹ نے موصوفہ کو براہ راست خط لکھ کر جواب دے دیا ہو۔ اگر وہ جواب اخبارِ اردو میں بھی چھاپ دیتے تو بہتوں کا بھلا ہوتا۔ بس یہی بے نیازی اور easy going رویہ اور happy go lucky انداز ہر جگہ نظر آتا ہے۔

(ماہ نامہ سیتارہ، لاہور، اقبال نمبر ۱۹۹۲ء، نظر ثانی: جنوری ۲۰۰۳ء)



## کلام اقبال کی تدوین

رشید حسن خاں

اقبال کی اُردو اور فارسی شاعری کا ایسا کوئی مجموعہ اب تک مرتب نہیں ہو سکا ہے، جسے اصولِ تدوین کے لحاظ سے تحقیقی اڈیشن کہا جاسکے۔ اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں ترتیبِ متن کے معیاری نمونے سامنے آچکے ہیں اور اصولِ ترتیبِ متن سے بھی اہل نظر بے خبر نہیں، اس صورت میں شاعرِ مشرق کے کلام کا معیاری اڈیشن مرتب نہ کیا جانا جس قدر حیرت ناک ہے، اُس سے کہیں زیادہ افسوس ناک ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم آسان پسندی کے خوگر ہوتے جا رہے ہیں اور یہ بھی کہ احتساب کی روایت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ اقبال کے افکار و خیالات سے متعلق تو قابلِ رشک تحریری سرمایہ موجود ہے اور اس بات کو ہر شخص مانے گا کہ اُن کے افکار و خیالات کا تعلق اُن کی شاعری سے ہے، اس صورت میں کیا یہ بات قابلِ تعجب اور اُس سے زیادہ قابلِ تاَسف نہیں کہ اُن کے کسی ایک مجموعے کا ایسا کوئی اڈیشن موجود نہیں جسے تحقیق کی زبان میں معیاری کہا جاسکے۔ اصل موضوع پر کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اقبالیات سے متعلق ایک مقتدر ادارے اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے ۱۹۹۰ء میں کلبیاتِ اقبال دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ [اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے]۔

اُس سے پہلے ۱۹۷۳ء میں جاوید اقبال کا مرتبہ کَلّیات اقبال شائع ہو چکا ہے۔<sup>۱</sup> یہ دونوں کَلّیات پیش نظر ہیں۔ اقبال اکادمی کا نسخہ کَلّیات، حُسن طباعت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ اُس کے صفحات کے حواشی ایسی گل کاری اور رنگ آمیزی سے مزین ہیں کہ کچھ دیر کے لیے تو محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہو، لیکن جیسے ہی یہ سیمیا کی سی نمود ختم ہوتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ تحقیق اور تدوین کی روایت شاید اُردو میں موجود ہی نہیں۔ ایسا کوئی کام اب تک ہوا ہی نہیں جو تدوین کے سلسلے میں مثال بن سکتا اور معیار کی تشکیل ہوتی۔ نہ حافظ محمود خاں شیرانی نام کے کوئی صاحب گزرے ہیں اور نہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کوئی متن مرتب کیا ہے، نہ قاضی عبدالودود نے کچھ لکھا ہے اور نہ مولوی محمد شفیع نے کچھ کیا ہے۔ کَلّیات اقبال کے انھی نسخوں کو دیکھ کر، کلام اقبال کی تدوین کے موضوع پر اظہارِ رائے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

پہلے ایک مثال کے واسطے سے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ مرزا غالب کا اُردو دیوان، جسے ایک زمانے میں تاج کمپنی نے چھاپا تھا، آرٹ پیپر پر، رنگین مرصع حاشیوں کے ساتھ۔ ہر خوش ذوق اُسے خوب صورت اور خوش نما کہے گا۔ اگر دیوان غالب کے اُس اڈیشن کو پیش کیا جائے جسے مرقع چغتائی کہا جاتا ہے، تو اُسے مصوٰری کے کمال کا آئینہ دار کہا جائے گا۔ ان دونوں نسخوں کے حُسن کا اعتراف کرنے کے باوجود، ان میں سے کسی نسخے کو تحقیق اور تدوین کی بحثوں میں بہ طور ماخذ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس کے لیے دیوان غالب نسخہ عرشی سے کام لیا جائے گا، جو خوب صورتی میں ان دونوں نسخوں کے مقابلے میں کم تر ہے، لیکن اصول تدوین کے لحاظ سے برتر ہے۔ مرزا غالب کی عظمت کے لحاظ سے ضرورت دونوں طرح کے اڈیشنوں کی تھی، اور ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ خوش نما اڈیشن

۱۔ اس مضمون میں خاں صاحب نے کئی جگہ جاوید اقبال کے مرتبہ کَلّیات کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد شیخ غلام علی اڈیشن ہے۔ یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ جاوید اقبال نے اس کَلّیات کا دیباچہ ضرور لکھا ہے، مگر وہ اس کے مرتب نہیں ہیں۔ (رہا شی)



کتنے ہی زیادہ شائع کیے جائیں، اُن کا متن اصولاً اُس نسخے پر مبنی ہو جسے تدوین کے اصولوں کی پابندی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہو۔ کیا کلام اقبال کا ایسا کوئی مجموعہ مرتب کیا گیا ہے جسے باقی مرصع اور غیر مرصع اڈیشنوں کی بنیاد بنایا جاسکے؟ نہایت اعتماد کے ساتھ اس کا جواب نفی میں دیا جائے گا۔

مرزا غالب ہی کے واسطے سے ایک اور بات کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معلوم ہے کہ مرزا غالب کی زندگی میں اُن کا اُردو دیوان پانچ بار چھپا تھا۔ ان پانچوں اشاعتوں میں چوتھا اڈیشن سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو کانپور کے مطبع نظامی میں چھپا تھا۔ اگر اسی چوتھے اڈیشن کو ضروری تفصیلات یعنی مفصل مقدمے اور جامع حواشی کے بغیر اب پھر چھپا دیا جائے، تو اُس نسخے کو نسخہ نظامی پریس کانپور کی نقل کہا جائے گا۔ اُسے متداول دیوان غالب کا ایسا اڈیشن نہیں کہا جائے گا جسے اصول تدوین کے مطابق مرتب کیا گیا ہو۔

اقبال کے اُردو فارسی مجموعے بھی اُن کی زندگی میں بارہا چھپے ہیں اور اُن کے بعد بھی چھپتے رہے ہیں۔ اب اگر کوئی صاحب اُن متفرق مجموعوں کو یک جا کر کے کلیات کے نام سے چھاپ دیں، تو اُس بڑے مجموعے کو اُن چھوٹے متفرق مجموعوں کی نقل تو کہا جاسکتا ہے، مگر اُسے کلام اقبال کا ایسا مجموعہ نہیں کہا جائے گا جسے اصول تدوین کے تحت مرتب کیا گیا ہو۔ اس وقت تک صورت حال یہ ہے کہ 'کلیات' کے نام سے کلام اقبال کے جو مجموعے چھپے ہیں، وہ پچھلے متفرق مجموعوں کی محض نقلیں ہیں، اور یہ نقلیں بھی اغلاط سے خالی نہیں (مگر اس پر ذرا آگے چل کر گفتگو کی جائے گی) ان میں وہ کلیات بھی شامل ہے جسے جاوید اقبال نے شائع کیا تھا اور یہ کلیات بھی جسے اقبال اکادمی نے چھاپا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ کلام اقبال کا کوئی ایسا اڈیشن مرتب کیا جاسکے جو تحقیق کی نظر میں اصول تدوین کے مطابق ہو، تو بہ طور تمہید پہلے ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اقبال کو بہت کچھ ماننے کے باوجود، اُن کے کلام کا کوئی تحقیقی اڈیشن اب تک مرتب نہیں ہو پایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی تسلیم کیا جائے کہ جب تک ایسا مجموعہ مرتب نہیں

ہوگا، اُس وقت تک کلامِ اقبال، یعنی متن سے متعلق سارے سوالات محرومِ جواب رہیں گے۔ یہ اعتراف یوں ضروری ہے کہ جب تک ہم یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ اقبال کے کلام کا معیاری اڈیشن موجود نہیں، اُس وقت تک بہ لحاظِ تدوین معیاری اڈیشن مرتب کرنے کی ضرورت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

تحقیقی اڈیشن مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مجموعے کا مکمل خاکہ بنایا جائے جس میں تنقیدی مباحث شامل نہ ہوں اور خراجِ عقیدت قسم کی فضولیات بھی نہ ہوں۔ تحقیقی اڈیشن کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شعری مرتبے کا تعین کیا جائے یا عظمت کا اعتراف کیا جائے۔ اُس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ صحیح متن، متعلقاتِ متن کی ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ شروع میں مفصل مقدمہ ہو، جس میں یہ بتایا جائے کہ اس مجموعے کی ترتیب میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور کیا طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ تدوین کے ضابطے کے مطابق منشائے مصنف کا تعین کیا جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ جو کلام پیش کیا جا رہا ہے، یہ معتبر ماخذ پر مبنی ہے اور جس طرح پیش کیا جا رہا ہے، وہ منشائے مصنف کے مطابق ہے۔ اگر کہیں کسی وجہ سے اس سے انحراف کیا جائے تو اُس کی نشان دہی کی جائے اور وجہ بتائی جائے۔ ایک ضمنی عنوان کے تحت یہ بتایا جائے کہ کلامِ اقبال کے کس قدر معتبر نسخے موجود ہیں اور اُن کے کوائف کیا ہیں۔ اسی طرح اقبال کی خطی تحریروں کی بھی نشان دہی کی جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ معتبر مطبوعہ نسخوں کے ساتھ ساتھ اُن خطی تحریروں کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔

کلامِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں ایک خاص وجہ سے ایسے تحقیقی التزامات کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں اُن کے جو مجموعے چھپے تھے، اُن کی پلیٹیں بہت دنوں تک اچھی حالت میں نہیں رہ سکیں، یوں نئی کتابت کرائی گئی [یا کسی اور وجہ سے نئی کتابت کرانا پڑی] اور ایک ایسا مجموعہ بھی ہے جو پہلی بار اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوا ہے۔ ایسے سارے مجموعوں کا متن تقابلی کا متقاضی ہے۔ تدوین کے اصولوں کے مطابق اب یہ لازم ہے کہ ایسے جملہ مجموعوں کا مکمل طور پر اصل ماخذ سے [جن میں اقبال

کے ہاتھ کی تحریریں بھی شامل ہیں] مقابلہ کیا جائے اور اختلافات متن کی نشان دہی کی جائے۔ چونکہ اس سلسلے کی کچھ باتیں آگے چل کر بھی لکھی جائیں گی، اس لیے یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کون سی نظمیں کب کہی گئی تھیں اور پھر ان میں کیا ترمیمیں ہوئیں، تحقیقی اڈیشن میں ان سب کی نشان دہی بھی لازم ہے۔ یہ کس طرح کی جائے، یہ بحث بھی آگے چل کر آئے گی۔

جب مختلف خطی اور مطبوعہ تحریروں کو سامنے رکھا جائے گا اور تقابلی مطالعے کی روشنی میں ترجیحات کی صراحت کے ساتھ متن کا تعین کیا جائے گا، تو اختلاف نسخ سے بہت سی تفصیلات یک جا ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی وجہ ترجیح کے تعینات کی تفصیلات بھی ہوں گی۔ یعنی یہ بات کہ کسی شعر میں اگر اختلاف متن ہے (کسی بھی وجہ سے) اور تقابلی متن کے بعد کسی ایک صورت کو ترجیح دی گئی ہے، تو اس ترجیح کی وجہ کیا ہے۔ غرض کہ ایسی جزئیات بہت ہوں گی، اس لیے یہ لازم ہوگا کہ آخر میں تعلیقات (یا یوں کہیے کہ مختلف ضمیموں) کا اضافہ کیا جائے اور ساری تفصیلات کو وہاں یک جا کر دیا جائے۔

متن کے متعلقات بہت ہوتے ہیں، ان میں ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے الفاظ کے تعین کا۔ اس تعین میں الفاظ کی صورت نگاری کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ متن کے تعین میں بہت سی بحثیں املاے الفاظ سے متعلق ہوتی ہیں۔ یوں بھی تدوین میں املا کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ کلمات اقبال شائع کردہ جاوید اقبال میں ایک مصرع ہے: ”بدہ ایں کشت را خونابہ خویش“ [ص ۹۸۶]۔ اقبال اکادمی کے کلمات (فارسی) میں یہ اس طرح ہے: ”بدہ ایں کشت را خونابہ خویش“ (ص ۸۳۷)۔ ارمغان حجاز طبع نہم کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اس میں یہ اول الذکر کے مطابق ہے [بلکہ یوں کہیے کہ جاوید اقبال والے کلمات میں یہ ارمغان حجاز طبع نہم کے مطابق ہے]۔ بہ لحاظ لغت صحیح لفظ ”خونابہ“ ہے (بہارِ عجم)۔ ارمغان حجاز کے پُرانے اڈیشنوں میں ”خونابہ“ ہے (جب کہ ”خونابہ“ ہونا چاہیے تھا۔) نئے تحقیقی اڈیشن میں اسے کس طرح لکھا جائے؟ اس کے متعلق مرتب یا مرتبین کو طے کرنا ہوگا اور

اس شعر سے متعلق حاشیے میں اس لفظ سے متعلق ضروری تفصیلات لکھنا ہوں گی اور جس املا کو اختیار کیا جائے گا، اُس کی ترجیح (یا صحت) کی وضاحت کرنا ہوگی۔ [حقیقت یہ ہے کہ کاتبوں کی بے امتیازی اور کم سوادگی نے ”خوناب“ کو ”خوناب“ بنا دیا۔ ”خوناب“ اور ”خوناب“ دو مختلف لفظ ہیں۔ ”خوناب“ مقلوب ہے ”آبِ خوں“ کا۔ اُسی سے ”خونابہ“ بنا ہے۔ اقبال اکادمی کَلّیات میں اسی بنا پر زیر بحث مصرعے میں ”خونابہ“ لکھا گیا ہے]۔ اگر اقبال کی کسی تحریر میں اُن کے قلم سے اس لفظ کا یہی املا (خونابہ) ملتا ہے، اُس صورت میں اس کی بھی صراحت کی جائے گی۔ اس سلسلے میں مرتبین کو اپنے طریقہ کار کا تعین کرنا ہوگا کہ ایسے مقامات پر، جہاں یہ صورت سامنے آئے، کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا اور ایسے لفظوں کو کس طرح لکھا جائے گا۔ ہر صورت میں حواشی میں ایسے مقامات کی وضاحت کی جائے گی۔ اس لفظ کے تحت یہ وضاحت بھی کی جانا چاہیے کہ اُردو کے بعض لغات میں غلطی سے ”خوناب“ اور خوناب“ (مع اضافت) کو گڈ ٹڈ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً اُردو لغت (ترقی اُردو بورڈ کراچی) میں یہ غلط بحث موجود ہے۔ یہ کاتبوں کے طریق نگارش کو مستند مان لینے کا کرشمہ ہے۔ [اس لغت میں اس طرح کی غلطیاں سیکڑوں سے بھی کچھ زیادہ ہیں]۔

اب ایک مثال، اوپر والی مثال سے مختلف انداز کی: جاوید اقبال والے کَلّیات میں ایک مصرع ہے: ”خرے را اسب تازی گو، نگویم“ (ص ۸۹۲)۔ اقبال اکادمی کے کَلّیات میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے۔ قدیم فارسی اور ہندستانی فارسی میں بہ طورِ عموم ”اسب“ ملتا ہے [بہارِ عجم، برهانِ قاطع]۔ جدید فارسی میں ”اسب“ (مع بے موحدہ) لکھتے ہیں [فرہنگ فارسی از ڈاکٹر معین، جلد اول، امثال و حکم از دہخدا، جلد اول]۔ ایسے الفاظ خاص طور پر وضاحت طلب ہوتے ہیں۔ حواشی میں لازماً یہ وضاحت کی جانا چاہیے کہ اس لفظ کی دو صورتیں ہیں اور جس صورت کو اختیار کیا گیا ہے، اُس کا احوال کیا ہے۔ اقبال کی اپنی تحریر میں یہ لفظ کس طرح ملتا ہے۔ کیا کلام اقبال میں کہیں اور یہ لفظ آیا ہے۔ اگر آیا ہے تو وہاں اسے کس طرح لکھا گیا ہے۔ وجہ ترجیح کا تعین بہر صورت کرنا ہوگا۔

الفاظ کی صورت نویسی کا تعین کیوں ضروری ہے، اس کی وضاحت ایک اور مثال

سے بہتر طور پر ہو سکے گی۔ بالِ جبریل کی اشاعتِ شانزدہم کا نسخہ میرے سامنے ہے، اُس میں ص ۴۱ پر یہ مصرع ہے:

وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسین وہی طاہا

جاوید اقبال والے کلیات میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ بالِ جبریل میں ”یس“ ہے [ی کے نطقے صرف ایک جگہ ہیں] اور اس میں ”یسین“ ہے۔ یعنی ی کے نطقے دو جگہ ہیں اور لفظ پر خط کے بجائے تخلص کا نشان (س) ملتا ہے۔ اس نشان کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ یہ نام نہیں، تخلص ہے [اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے]۔ اقبال اکادمی کے کلیات میں یہ مصرع اس طرح ہے:

وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یسین، وہی طہ

قرآن میں ”طہ“ اور ”یس“ ہے اور یہ دوسورتوں کے نام ہیں۔ جس شعر میں یہ دونوں نام آئے ہیں، اُس سے متعلق حاشیے میں اس اختلاف کی نشان دہی کی جائے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اقبال کے ہاتھ کی تحریر میں اگر یہ لفظ آئے ہیں، تو وہاں ان کا املا کیا ہے۔ مرتب جس املا کو ترجیح دے گا، اُس کی وجہ بتانا ہوگی۔ اصول تدوین کی پابندی کے علاوہ، اس طریق کار کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ مرتب مجبور ہوتا ہے ایسے ہر لفظ کی تحقیق پر، اور اس طرح بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ تدوین کے اس طریق کار کی پابندی نہ کیے جانے کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ دونوں کلیات ایسی طرح طرح کی غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

کبھی مصنف کسی نام یا تاریخ یا کسی حوالے سے متعلق غلطی کر جاتا ہے۔ اس کی متعدد وجہیں ہوتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سی صورتوں میں یادداشت پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور وہ کبھی کبھی ساتھ نہیں دیتی۔ اور کبھی کسی وجہ سے دانستہ غلط بیانی سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اسی لیے تحقیق کی احتیاط پسندی اس پر اصرار کرتی ہے کہ مصنفین کی ایسی نگارشات کو جانچ پرکھ لیا جائے۔ دو مثالوں سے اس کی وضاحت شاید بہتر طور پر ہو سکے گی۔

بالِ جبریل اشاعتِ شانزدہم [اپریل ۱۹۶۸ء] میں ص ۳۷ پر ایک قصیدہ نما

غزل کے ساتھ تمہیدی نوٹ بھی ہے جس میں اقبال نے لکھا ہے: ..... ”نومبر ۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنوی کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی.....“ اس پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے لکھا ہے: ”حالاں کہ یہ واقعہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کا ہے۔ انھوں نے یادداشت سے کام لیتے ہوئے نومبر لکھ دیا“۔ [تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ص ۳۱]۔

اسی مجموعے میں ص ۲۰۹ پر ”ابوالعلا معری“ کے عنوان سے ایک نظم ہے، اُس میں یہ مصرع بھی ہے: ”کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات“۔ اس کے حاشیے میں لکھا ہے: ”لزومات اُس کے قصائد کا مجموعہ ہے“۔ [بالِ جبویل، ص ۲۰۹]۔ ظ انصاری نے اس سے متعلق اپنی کتاب اقبال کھی تلاش میں یہ رائے ظاہر کی کہ اقبال نے معری کا مطالعہ انگریزی یا جرمن میں کیا ہوگا اور اس طرح کتاب کے نام کے صحیح تلفظ اور املا (لزو میات) سے نا آشنا رہے ہوں گے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں ظ انصاری کا قول نقل کر کے اُس سے اختلاف کیا ہے کہ اقبال نے اصل زبان یعنی عربی میں معری کی تصانیف نہیں دیکھی ہوں گی۔ اُن کا خیال ہے کہ ”متنِ کلام میں ضرورتِ شعری کے تحت اقبال نے ”لزومات“ باندھا اور حاشیے میں بھی یہی لکھ دیا“ [ص ۳۱]۔ ضرورتِ شعری کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر حاشیے میں بھی اسی کو نقل کر دینا بہت عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ بہ ہر حال، تحقیقی اڈیشن میں اس پر مفصل بحث کی جائے گی۔ حواشی میں معری، ”غفران“ اور ”لزومات“ پر تعارفی نوٹ بھی لکھے جائیں گے۔

تدوین کے نقطہ نظر سے یہ بھی ضروری ہے کہ طریق نگارش میں یکسانی ہو، یعنی جس املا کو اختیار کیا جائے، اُس کی پابندی کی جائے۔ یہ نہ ہو کہ ایک ہی لفظ یا ایک ہی انداز کے ٹکڑے کہیں ایک طرح ہوں اور کہیں دوسری طرح۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں گا۔ جن لفظوں کے آخر میں الف یا واو ہوتا ہے، اضافت کے لیے اُن کے آخر میں ء کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: خداے برتر، بوے گل۔ جاوید اقبال والے کلیات میں کہیں تو ایسے الفاظ اسی طرح ملتے ہیں، مثلاً ص ۴۱۹ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوے تو  
 راہ چو مارے گزد گرزوم بسوے تو  
 پوری غزل کے قوافی میں ے پر کہیں ہمزہ نہیں۔ یا جیسے یہ مصرع: دگرز سادہ  
 دیلہاے یارنتواں گفت (ص ۲۵۹)۔ اب ان مصرعوں کو دیکھیے:

سیلم ، مرا بجوئے تنک مایہ میچ (ص ۳۹۶)

در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز (ص ۳۲۸)

گدائے جلوہ رفتی برسرِ طور (ص ۲۱۰)

قدم در جستجوے آدمے زن (ص ۲۱۰)

ہر جگہ ے پر ہمزہ موجود ہے [یعنی بجوئے، ہوائے، گدائے، جستجوئے] اور یہ دو  
 رنگی ناقابل قبول ہے۔

اسی ذیل میں وہ لفظ آتے ہیں جن کے آخر میں می ہوتی ہے، جیسے: زندگی۔  
 اضافت کی صورت میں ایسے لفظوں میں کہیں تو می پر ہمزہ ہے اور کہیں نہیں۔ بس ایک  
 ایک مثال:

از شوخی آب و رگل درگفت و شنود آمد (ص ۲۵۵)

پیش تو گر بیاں کنم مستی ایں مقام را (ص ۲۴۷)

یعنی اک جگہ ”شوخی آب و رگل“ ہمزہ کے بغیر ہے اور دوسری جگہ ”مستی ایں مقام“  
 مع ہمزہ۔ ایسی دورنگی سے یہ کلیات بھرا ہوا ہے، لیکن کسی تحقیقی اڈیشن میں ایسی دورنگی  
 نہیں ہوسکتی۔ [یہاں ضمنی طور پر یہ عرض کر دیا جائے کہ ایسی صورتوں میں صحیح طریقہ کار یہ  
 ہوگا کہ می پر اضافت کا ہمزہ لگانے کے بجائے، اس کے نیچے اضافت کا زیر لگایا جائے،  
 جیسے: شوخی آب و رگل، زندگی فانی، گرمی اندیشہ۔ اور علامتِ اضافت کے طور پر جب  
 ے کا اضافہ کیا جائے گا، تو اُس ے پر [جس کی حیثیت علامتِ اضافت کی ہے] نہ تو ہمزہ  
 آئے گا اور نہ اُس کے نیچے زیر لگایا جائے گا، جیسے: ہوائے چمن، کوے ملامت]۔

یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب کوئی خاص اندازِ کتابت اختیار کیا جاتا ہے، یعنی ایسا طریق

املاے الفاظ جو متعارف نہ ہو، اُس صورت میں یہ لازم ہوتا ہے کہ مقدمے میں اُس کی نشان دہی کی جائے اور ضروری وضاحت پیش کی جائے۔ اس کلیات کا احوال اس لحاظ سے بہت تباہ ہے۔ میں صرف ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں گا۔ ان مصرعوں کو دیکھیے:

افگند در فرنگ صد آشوبِ تازہ (ص ۲۶۸)

خیز و بخاکِ تشنہٴ بادۂ زندگی فشاں (ص ۴۱۲)

ہم بہو اے جلوہٴ پارہ کنم حجابِ را (ص ۴۱۹)

خط کشیدہ الفاظ توجہ طلب ہیں۔ ان میں یاے وحدت اور یاے زائد کے لیے ہ پر ہمزہ لکھ کر، اُس کے نیچے زیر لگایا گیا ہے [تازہ، جلوہ، تشنہ]۔ یہ قطعی طور پر غیر متعارف اندازِ املا ہے۔ متعارف طرزِ کتابت دو ہیں: (۱) ہ پر ہمزہ لگایا جائے۔ (۲) ہ کے بعد ”اے“ کا اضافہ کیا جائے، یعنی تازہ، یا تازہ اے۔ مقدمہ مرتب میں اس غیر متعارف انداز کی نشان دہی کی جانا چاہیے تھی اور یہ بتایا جانا چاہیے تھا کہ اس ”ایجادِ بندہ“ اندازِ نگارش کو کس وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔۔۔ ستم تو یہ ہے کہ اس کی بھی پابندی نہیں ملتی، مثلاً:

ندیم بندہ کو محرم تست (ص ۹۱۳)

دی مغچہٴ با من اسرارِ محبت گفت (ص ۴۱۵)

یا جہانے تازہ یا امتحانے تازہ (ص ۴۱۶)

من فدای ایں دلِ دیوانہ

ہر زماں بخشد دگر ویرانہ (ص ۷۰۳)

یہاں قدیم انداز کو اختیار کیا گیا ہے کہ یاے وحدت و تنکیر و زائد کے لیے ہ پر صرف ہمزہ لگایا گیا ہے۔ طوالت کے خیال سے میں نے کم سے کم مثالوں پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا ہے، ورنہ یہ کلیات ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غیر علمی اندازِ نظر کو کیا کہا جائے، اس کے سوا کہ ادارے کا اصل مقصود تجارت تھا، اسی لیے علمی اندازِ نظر سے سروکار نہیں رکھا گیا۔ اس مصرعے کو دیکھیے:

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب (ص ۶۰۷)



اُردو میں ضروری مقامات پر درمیان لفظ واقع یاے معروف کے نیچے چھوٹا سا الف بنا دیا جاتا ہے۔ علامت یاے معروف کے طور پر، جیسے: پدید، یہ شکل 'ہ' بہ ظاہر اجنبی ہے۔ لازم تھا کہ مقدمے میں اس کی وضاحت کی جاتی کہ فارسی میں اس شکل کو کس آواز کی علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے اور کیوں --- اب آپ اقبال اکادمی کے کتبیات کو دیکھیے تو وہاں بالکل دوسرا نظام ملے گا۔ مثلاً یہی مرقومہ بالامصرع اُس میں اس طرح ملے گا:

زندہ ئی یا مردہ ئی یا جان بلب (ص ۴۹۲)

اگر کسی شخص کے سامنے کلام اقبال کے پرانے اڈیشن اور یہ دونوں کتبیات ہوں، تو وہ نیرنگی املا پر حیران رہ جائے گا۔ مزید وضاحت کے لیے میں صرف ایک مجموعے کی ایک غزل کے دو مصرعے پیش کرتا ہوں۔ پیام مشرق کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست

تجلیِ دگرے درخورِ تقاضا نیست

اُس غزل میں یہ مصرعے بھی ہیں:

تو رہ شناس نہ، و ز مقام بے خبری

(کتبیات جاوید اقبال، ص ۳۲۹)

بہ جادہ کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست (ایضاً)

[نہ اور جادہ] اقبال اکادمی کے کتبیات میں یہ اس طرح ملتے ہیں:

تو رہ شناس نہی و ز مقام بے خبری (ص ۳۰۲)

بہ جادہ ئی کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست (ص ۳۰۲)

املا اور متعلقات املا کی ایسی ساری بحشیں اور وضاحتیں مقدمے میں آتیں، سو اُس کو احتیاطاً شامل ہی نہیں کیا گیا۔ یہ دونوں کتبیات بہت سی باتوں میں مختلف الاحوال ہیں، مگر ایک بات ایسی ہے جس میں ان کے مرتبین میں اختلاف نہیں پایا جاتا اور وہ یہ ہے کہ شروع میں نہ تو مقدمہ شامل کیا جائے اور نہ آخر میں حواشی نام کی کوئی چیز ہو، تاکہ حساب کتاب کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے اور ہر شخص ہر طرح کی ذمے داریوں سے اور جواب دہی سے محفوظ

رہے۔ آپ کہیں گے کہ اصول تحقیق کے لحاظ سے ایسا کَلّیّات معیاری نہیں ہو سکتا۔ ضرور کہیے، لیکن بازار میں عقیدت مند خریداروں کی کمی نہیں اور اصل مخاطب وہی لوگ ہیں۔ اصل مقصود جب تجارت بن جائے، تو پھر تحقیق اور تدوین کے مطالبوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

املا سے متعلق ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جاوید اقبال والے فارسی کَلّیّات میں معروف، مجہول اور غنّہ آوازوں کے لحاظ سے جس طریق املا کو اختیار کیا گیا ہے، یہ وہی املا ہے جو پہلے دن سے ہندستان میں رائج رہا ہے۔ یہ وہی نظام ہے جو ایران میں بھی رائج تھا۔ پھر وہاں اُس میں تبدیلیاں ہوئیں، مثلاً یہ کہ غنّہ آواز ختم ہوگئی۔ یاے معروف و مجہول اور واو معروف و مجہول کی تفریق ختم ہوگئی، صرف معروف آواز باقی رہ گئی، مگر برصغیر میں ایسی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ جاوید اقبال کے کَلّیّات میں آخر لفظ میں واقع یاے معروف اور یاے مجہول میں صورت نگاری کی تفریق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ غنّہ آواز کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ پرانے طریق نگارش کے مطابق کہ آخر لفظ میں واقع ایسے نون پر نقطہ نہ رکھا جائے۔ یہ قطعی طور پر درست طریقہ کار ہے۔ اقبال کے ہاتھ کی جو تحریریں موجود ہیں، اور جن میں سے کچھ کے عکس اقبال اکادمی کَلّیّات میں بھی شامل ہیں، اُن میں اسی طریقہ تحریر کی پابندی التزام کے ساتھ ملتی ہے۔ کلام اقبال کے جو پرانے مطبوعہ نسخے ہیں، اُن میں بھی اسی طریق نگارش کی پابندی ملتی ہے۔☆

اس کے مقابلے میں اقبال اکادمی کے کَلّیّات فارسی میں جدید ایرانی املا کو اختیار کیا گیا ہے۔ قاری جب ان دونوں نسخوں کو دیکھے گا، تو وہ سمجھ نہیں پائے گا کہ یہ دونوں نسخے مختلف بلکہ متضاد اندازِ کتابت سے گراں بار کیوں ہیں، مگر اس سے بھی بڑھ کر وہ اس الجھن میں مبتلا ہو جائے گا کہ ان میں سے صحیح انداز کون سا ہے۔ مفصل مقدمہ ہوتا، جس میں اس

---

☆ ”ہندستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے مسائل“ کے عنوان سے میں نے ایک مفصل مضمون لکھا تھا جس میں اس مسئلے سے متعلق ضروری تفصیلات کو یک جا کر دیا ہے۔ یہ مضمون میری کتاب تفہیم میں شامل ہے۔

مسئلے پر گفتگو کی گئی ہوتی، تب اس پر روشنی پڑ سکتی تھی۔

یہاں ایک اور ستم ظریفی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اقبال اکادمی کے کلیاتِ فارسی میں طرزِ کتابت کا احوال بیان کیا گیا [جو سراسر اقبال کے طریق نگارش کے خلاف ہے]۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس کلیات کی اُس جلد میں جو اردو کلام پر مشتمل ہے، اُس میں جو فارسی اشعار آئے ہیں، اُن میں ایرانی طریق املا کے بجائے، ہندستانی طریق نگارش کی پابندی کی گئی ہے۔ یعنی ایک ہی شاعر کے کلام کے لیے دو مختلف طریق کتابت اختیار کیے گئے ہیں اور ہم کسی طرح معلوم نہیں کر سکتے کہ اس دورگی کی وجہ کیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا جواز کیا ہے۔ مقدمے میں ایسے اُمور زیرِ بحث آیا کرتے ہیں اور وہ موجود نہیں۔

تدوین میں ایک بڑا مسئلہ تخریج کا ہوتا ہے۔ ”تخریج“ کا مطلب یہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں اگر دوسرے شاعروں کے کلام کے اجزا آ گئے ہیں، تو اُن کی مکمل طور پر نشان دہی کی جائے۔ اگر شاعر نے خود ہی لکھ دیا ہے کہ یہ فلاں شاعر کا مصرع یا شعر ہے [اور اقبال نے کئی جگہ یہ لکھا ہے] اُس صورت میں اُس شاعر کے مجموعہ کلام میں اور اگر اُس کا دیوان مرتب نہ ہوا ہو تو دوسرے ماخذ میں اُس شعر کو تلاش کر کے، متن کا تقابل کیا جائے۔ اگر کوئی اختلاف ہو، تو اُس کی نشان دہی کی جائے۔ یہ تصدیق تو بہر طور کرنا ہوگی کہ یہ مصرع یا شعر اُسی شاعر کا ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ لازم ہوگا کہ اس کے لیے معتبر ماخذ سے کام لیا جائے۔ [تحقیق سے تعلق رکھنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ ہر خطی نسخہ یا ہر چھپی ہوئی کتاب معتبر ماخذ کی حیثیت نہیں رکھتی]۔ اگر شاعر نے خود حوالہ نہیں دیا ہے، اُس صورت میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ مصرع یا شعر کس کا ہے۔ مثلاً اقبال نے لکھا ہے:

بمَلکِ جمِ ندہمِ مصرعِ نظیری را

کسے کہ کشتہ نشد، از قبیلہ ما نیست

اقبال نے وضاحت کر دی ہے کہ دوسرا مصرع نظیری کا ہے۔ اب نظیری کے دیوان میں دیکھا جائے گا کہ (۱) یہ مصرع موجود ہے (۲) اسی طرح ہے (۳) پہلا مصرع کیا ہے۔

دوسری صورت: زبورِ عجم میں یہ شعر ہے:

بامید اینکہ روزے بشکارِ خواہی آمد  
ز کمندِ شہریاراں رمِ آہوانہ دارم

کلیات مرتبہ جاوید اقبال میں پہلے مصرعے کو سادہ واوین میں لکھا گیا ہے (ص ۴۱۳)۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مصرع اقبال کا نہیں، کسی اور شاعر کا ہے۔ اصولِ تخریج کے مطابق مرتب کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ بتائے کہ: (۱) یہ مصرع کس کا ہے۔ (۲) متن میں اختلاف تو نہیں۔ (۳) اس کا پہلا یا دوسرا مصرع کیا ہے۔ [یہ عرض کر دوں کہ یہ بہت مشہور مصرع ہے]۔ یا جیسے اسی کلیات میں ص ۱۴۴ پر ایک شعر ہے:

حرفِ چوں طائر بہ پرواز آورد  
نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

اس پر یہ حاشیہ ملتا ہے: ”مرزا غالب بہ تغیر الفاظ“ مرتب یہ بتائے گا کہ مرزا غالب کا اصل شعر کس طرح ہے اور وہ اُن کے کلیات میں کس جگہ ہے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ تخریج لازمی حصہ ہے تدوین کا۔ اسی کے ساتھ مرتب کی یہ ذمے داری بھی ہے کہ کلام میں جس قدر نام آئے ہوں، تلمیحات ہوں، واقعات کا حوالہ آیا ہو یا اقوال آئے ہوں، اُن سب کی مکمل طور پر وضاحت کرے۔ میں صرف ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں گا۔ محولہ بالا کلیات میں ص ۱۷ پر یہ شعر ہے:

فکرِ او کو کب ز گردوں چیدہ است  
سیفِ بُراں وقت را نامیدہ است

اس پر یہ حاشیہ ملتا ہے: ”الوقت سیف مقولہ ہے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا“۔ جاوید اقبال یا دوسرے مرتبین میں سے کسی ایک نے بھی یہ صراحت نہیں کی کہ اُن کے مرتبہ کلیات میں مختلف صفحات کے آخر میں جو مختصر حواشی ہیں، وہ کس کے ہیں، خود اقبال کے یا کسی اور کے۔ خیر، ہم فی الوقت یہ مانے لیتے ہیں کہ ایسے سب حواشی خود اقبال کے لکھے ہوئے ہیں۔ مرتب کلیات کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسے جملہ حواشی سے متعلق ضروری

معلومات فراہم کرے۔ مثلاً اسی حاشیے سے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ اس قول کا ماخذ کیا ہے۔ یعنی اصل عبارت کہاں ہے، امام شافعی کی کس تصنیف میں ہے اور کیا یہ قول انھی دو لفظوں پر مشتمل ہے یا اصلاً اس میں کوئی اور لفظ بھی ہے یا الفاظ بھی ہیں اور یہ کہ اصل قول کس سیاق و سباق میں آیا ہے۔

کلام اقبال کا تحقیقی اڈیشن مرتب کرنے کے سلسلے میں مناسب طریقہ کار یہ ہو سکتا ہے کہ کلام اقبال کے جتنے مجموعے ہیں، اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے، ان کو الگ الگ مرتب کیا جائے۔ ہر جلد میں اُس جلد سے متعلق آخر میں مفصل حواشی ہوں [جو کئی ضمیموں میں منقسم ہوں گے] اور شروع میں مفصل مقدمہ ہو۔ ہر مجموعے کو الگ الگ مرتب کرنا یوں ضروری ہے کہ بعض مجموعوں کے حواشی کی ضخامت کچھ زیادہ ہوگی، مثلاً بانگِ درا میں شامل کلام سے متعلق تفصیلات بہت ہیں۔ حواشی میں ہر نظم کے حوالے سے اُس کے زمانہ تصنیف کا تعین کیا جائے گا۔ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ پہلی بار کہاں چھپی تھی۔ کیا اس کے متن میں ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔ ایسے سارے تغیرات کی تفصیلات کو یکجا کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ اُس مجموعے کے جملہ مشتملات میں، متن کی ہر طرح کی تبدیلیوں کی تفصیلات کو مع حوالہ درج کیا جائے گا، یہ تبدیلیاں خواہ بہ لحاظ مقدار کلام ہوں، خواہ بہ اعتبار تبدیلی متن۔

اسی طرح مقدمے میں اُس مجموعے کے زمانہ ترتیب و طباعت اور دوسرے متعلقات کی تفصیلات ہوں گی۔ یہ بھی وضاحت کرنا ہوگی کہ اقبال کی زندگی میں یہ مجموعہ کتنی بار چھپا تھا، اُسے مرتب کس نے کیا تھا اور ایسی ہی دوسری باتیں۔ یہ بھی صراحت کی جائے گی کہ اُس مجموعے میں جو کلام شامل ہے، کیا وہ بہ خطّ اقبال بھی موجود ہے۔ ہے تو وہ کہاں ہے۔ مطبوعہ اور نخطی نسخوں یا مختلف تحریروں میں اختلاف تو نہیں۔ اگر ہے، تو اُس کی تفصیلات اور وجوہ ترجیح کا تعین۔ مقدمے ہی میں اصولِ املا، رموزِ اوقاف، علامات اور

نشانات کی تفصیل لکھی جائے گی اور ترتیبِ متن کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کی وضاحت کی جائے گی۔ آخر میں تلمیحات اور ضروری الفاظ پر مشتمل فرہنگ بھی ہوگی۔ اصولِ تخریج کے متعلقات کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔ ”تخریج“ لازمی حصہ ہے تدوین کا۔

جب سب مجموعے اس طرح مرتب ہو جائیں، یعنی اُن کے تحقیقی اڈیشن تیار ہو جائیں، تب ایسا کلیات بھی چھاپا جاسکتا ہے جو عام پڑھنے والوں کے لیے ہو، یا کوئی ایسا اڈیشن جو اُن لوگوں کے لیے ہو جو کتابوں کو ”شوہیں“ کی طرح ڈرائنگ روم کی زینت بناتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ لازم نہیں رہے گا کہ جو کلیات (یا کوئی مجموعہ) عام لوگوں کے لیے چھاپا جائے، یا تجارتی اغراض کے تحت چھاپا جائے۔ [جیسا کہ جاوید اقبال کا مرتبہ کلیات ہے] اُس میں وہ مفصل مقدمہ اور وسیع الذیل حواشی بھی شامل ہوں۔ البتہ یہ لازم ہوگا کہ ایسے سبھی نسخوں کا متن اُن تحقیقی اڈیشنوں کے مطابق ہو اور اس کی وضاحت مختصر مقدمہ مرتب یا عرض ناشر میں کر دی جائے۔

یہاں ایک بات کی طرح توجہ دلانا ضروری ہے۔ ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن میں کلامِ اقبال کی زمانی ترتیب کے متعلقات، اصلاحیں، ترمیمیں اور متروک کلام کی بحثیں شامل ہیں۔ ایسی کتابوں کی اہمیت سے انکار کرنا مقصود نہیں، لیکن یہ لازم ہے کہ اُن کتابوں میں مندرج جملہ تفصیلات کا تحقیق کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر اُن سے استفادہ مناسب نہیں ہوگا۔ چھان پھٹک کر اور اصل مآخذ سے اُن کا مقابلہ کر کے، اُن کو اصل کلام کے ساتھ حواشی میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں گا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے [سال طبع: ۱۹۸۸ء]۔ بہت محنت کی ہے، لیکن مقدمہ کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اصل مآخذ کو کم دیکھ پایا ہوں..... مجھے متعدد نظموں کی تاریخِ اشاعت نہ مل سکی۔ اُن کے رنگ کو دیکھ کر، تاثراتی طریقے پر اُن کے

زمانے کا اندازہ کیا ہے۔ علامہ کے مسودات تک رسائی ہوتی تو صحیح تر فیصلہ کر

پاتا [ص ۱۱۴]۔

یہ کتاب محنت اور لگن کے ساتھ لکھی گئی ہے، مگر اس کے مندرجات کی تصدیق ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کو نقل کرنا یا ان کو بہ طورِ ماخذ استعمال کرنا قطعی طور پر غیر مناسب ہوگا اور اصول تحقیق کے خلاف۔ اسی طرح سرودِ رفتہ بھی اچھی کتاب ہے، لیکن اُس میں موجود متعدد فروگزاشتوں کی نشان دہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی قابلِ قدر کتاب تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ میں کی ہے [شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، سال طبع: ۱۹۸۲ء]۔

غرض کہ ایسی کتابیں ایک تو سب کے سامنے نہیں ہوتیں، دوسرے یہ کہ ان کے مندرجات کی تصدیق ضروری ہے اور آخری بات یہ کہ تحقیقی اڈیشن کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اُس میں شامل متن سے متعلق جملہ ضروری تفصیلات کو حواشی میں شامل کر کے متن کے ساتھ ہی پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر اڈیشن کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

ایک مثال سے اس کی بہتر طور پر وضاحت ہو سکے گی۔ مثنوی اسرارِ خودی پہلی بار ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی☆ یہ اڈیشن نایاب نہ سہی، کم یاب ضرور ہے۔ جب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا تو اقبال نے متن میں کچھ تبدیلیاں کیں اور جب تیسرا اڈیشن شائع ہوا تو پھر کچھ تبدیلیاں کیں۔ پہلے اڈیشن میں اقبال کا لکھا ہوا دیباچہ موجود ہے، جسے دوسرے اڈیشن میں مختصر کیا گیا اور تیسرے اڈیشن میں اُسے شامل ہی نہیں کیا گیا، یعنی کالعدم قرار دے دیا گیا۔ یہ بات ادب کے بیش تر طالب علموں کو معلوم ہوگی کہ پہلے اڈیشن میں حافظ سے متعلق اشعار اور کتاب کے انتساب [بہ نام سر علی امام] سے متعلق جو اشعار تھے،

---

☆ اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) کے نام سے شاید خان نے اس مثنوی کی پہلی اور دوسری اشاعت کو عکس صورت میں مرتب کیا ہے [شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی، سال طبع: ۱۹۹۳ء]۔ میرے سامنے یہی اڈیشن ہے۔ اگر یہ کتاب میرے سامنے نہ ہوتی تو میں اس مثنوی سے متعلق کئی اہم باتوں سے لاعلم رہتا۔ طبع اول کا جو سنہ میں نے لکھا ہے، وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

اُن میں ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ دوسرے اڈیشن کے مختصر دیباچے میں حافظ سے متعلق اشعار کو خارج کر دینے کے متعلق خود اقبال نے اظہارِ رائے کیا ہے (وغیرہ)۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جاوید اقبال اور اقبال اکادمی، دونوں کے شائع کردہ کَلّیات اِن امور سے متعلق ساری تفصیلات سے خالی ہیں اور یہی حال دوسرے اڈیشنوں کا ہے۔

اصولِ تدوین کے مطابق اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کو جب (ایک جلد میں) مرتب کیا جائے گا تو اُس جلد کے حواشی میں اِن دونوں مثنویوں سے متعلق ایسے سارے متروک اور ترمیم شدہ اجزائی نشانِ دہی کی جائے گی۔ یہ بتایا جائے گا کہ پہلی دو اشاعتوں میں کیا کیا تھا اور کس طرح تھا۔ اقبال نے کتنے اشعار میں ترمیم کی۔ ترمیمات کی تفصیلات کے ساتھ، سارے متروک اجزائے نظم و نثر کی نشانِ دہی کی جائے گی اور تاریخوں کا تعین کیا جائے گا۔ مقدمے میں، اور امور کے علاوہ، جملہ اہم اشاعتوں کا مکمل تعارف بھی شامل کیا جائے گا۔

کلامِ اقبال کا تحقیقی اڈیشن مرتب کیے جانے پر جو میں نے اِس قدر زور دیا ہے تو اِس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ اصولاً اتنے بڑے اور اہم شاعر کے کلام کا ایک معیاری اڈیشن موجود ہونا چاہیے۔ دوسری ضمنی وجہ یہ ہے کہ جاوید اقبال اور اقبال اکادمی کے شائع کردہ کَلّیات نے بعض اہم سوالات پیدا کیے ہیں۔ اِس تحریر میں ایک دو مثالوں سے کام لوں گا:

۱- ضربِ کلیم کا جو پُرانا اڈیشن میرے سامنے ہے [طبع چہار دہم، جون ۱۹۶۸ء] اُس میں پہلی سطر میں جلی قلم سے کتاب کا نام ضربِ کلیم لکھا ہوا ہے۔ دوسری سطر میں ”یعنی“ ہے اور تیسری سطر میں یہ عبارت ہے: ”اعلانِ جنگِ دورِ حاضر کے خلاف“۔ اِس کے نیچے یہ دو شعر ہیں:

نہیں مقام کی خوگرِ طبیعتِ آزاد  
ہو اے سیرِ مثالِ نسیم پیدا کر  
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے  
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر



اس کے مقابلے میں جاوید اقبال اڈیشن میں پہلے صفحے پر صرف کتاب کا نام ہے اور سب سے نیچے ”اقبال“ لکھا ہوا ہے۔ ص ۳ سے فہرست مضامین شروع ہوتی ہے۔ دوسرا صفحہ خالی ہے۔ نثری عبارت ”یعنی اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف“ اس میں موجود نہیں اور دونوں منقولہ شعر بھی موجود نہیں۔

اقبال اکادمی اڈیشن میں سرورق پر محولہ بالا نثری عبارت موجود ہے، مگر اشعار اس صفحے پر موجود نہیں، اُن کو علاحدہ سے ص ۳ پر لکھا گیا ہے۔ یہ بھی تبدیلی ہے، معمولی سہی، مگر اصل مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ص ۲ پر بہ خطِ اقبال جو عکس شامل کیا گیا ہے، اُس کی پہلی سطر میں ضربِ کلیم لکھا ہوا ہے، اُس کے نیچے دائرے میں ”افکارِ تازہ“ مرقوم ہے اور اُس کے نیچے یہ عبارت ہے: ”اعلانِ جنگ زمانہ حاضر کے خلاف“۔ پڑھنے والے کے ذہن میں دو سوال پیدا ہو سکتے ہیں:

(۱) ”زمانہ حاضر“ کو ”دورِ حاضر“ سے جو بدلا گیا ہے، تو یہ تبدیلی کس نے کی؟ خود اقبال نے یا کس اور نے۔ (۲) ”افکارِ تازہ“ کا ٹکڑا کس بنا پر شامل نہیں کیا گیا؟ ظاہر ہے کہ ایسے سوالات متعلقہ حواشی میں زیر بحث آتے ہیں اور حواشی کسی مجموعے میں موجود نہیں۔

۲۔ بال جبریل کے پرانے اڈیشن [اشاعتِ شانزدہم، ۱۹۶۸ء] میں کچھ قطعے مختلف غزلوں کے آخر میں ملتے ہیں، مثلاً: اُس مجموعے کی پہلی غزل [میری نواے شوق سے شورِ حریمِ ذات میں] کے بعد وہ قطعہ ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے: ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے۔ اور تیسری غزل [گیسوے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر] کے بعد وہ قطعہ ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے: دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر۔۔۔ جاوید اقبال کے چھاپے ہوئے کلیات میں یہ عجیب صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ محولہ بالا پہلے قطعے کو تو پہلی غزل کے نیچے لکھنے کے بجائے، دوسری غزل [اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا] کے نیچے لکھا گیا ہے اور دوسرے قطعے کو پانچویں غزل [کیا عشق ایک زندگی مستعار کا] کے نیچے لکھا گیا ہے۔ اُن کے بعد غزل نمبر ۱۵ تک جو قطعے غزلوں کے ساتھ آئے ہیں، اُن سب کو اُن کی جگہ سے ہٹا کر ”رباعیات“ کے علاحدہ عنوان کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ اس غزل کے بعد آنے

والے قطعات کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہے۔ مزید برآں، غزل ۶۱ کے بعد وہ قطعہ لکھا گیا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے: اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے۔ جب کہ پرانے اڈیشن میں یہاں کوئی قطعہ نہیں۔

یہاں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) ترتیبِ کلام میں یہ تبدیلی کس کی مرضی سے کی گئی؟ کیا مصنف نے ایسا کیا تھا یا اس کی ہدایت کی تھی؟ اگر یہ مرتب یا ناشر کا کام ہے، اُس صورت میں یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اس کا حق کسی ناشر یا مرتب کو کس نے دیا ہے کہ وہ مصنف کی قائم کردہ ترتیب کو بدل دے۔ (۲) دوسرا سوال اس سے بھی زیادہ اہم ہے کہ ان پر ”رباعیات“ کا عنوان کس نے چسپاں کیا؟ پرانے (محولہ بالا) اڈیشن میں تو یہ موجود نہیں۔

اوپر جو حوالے دیے گئے ہیں، یہ جاوید اقبال اڈیشن کے حصہ بالِ جبریل ص ۷۹ تک کے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اقبال اکادمی اڈیشن (حصہ اُردو) میں بھی یہاں تک اسی کی مکمل طور پر پیروی کی گئی ہے۔ یعنی اکادمی اڈیشن کے مرتبین نے بہ طور خود تحقیق کرنے اور صحیح صورتِ حال کو سمجھنے کے بجائے محض نقل سے کام لیا ہے۔ کیا ایسے اڈیشن کو معتبر کہا جاسکتا ہے؟ اس سے زیادہ اہتمام تو اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے منشی نول کشور کے مطبعے میں ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

۳- ارمغانِ حجاز میں اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں کا کلام شامل ہے۔ اس مجموعے کی نویں اشاعت پیش نظر ہے۔ سالِ طبع: ۱۹۶۶ء۔ یہ مجموعہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے حصے میں ص ۲۱۰ تک فارسی کلام ہے اور اُس کے بعد اُردو کا کلام ہے۔ کلیات کے جاوید اقبال اڈیشن میں یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ کلیاتِ فارسی کی جلد میں اس مکمل مجموعے کو شامل کر لیا گیا ہے لیکن دو الگ الگ مجموعوں میں تقسیم کر کے۔ جہاں حصہ فارسی ختم ہوتا ہے، وہاں ارمغانِ حجاز، اُردو کا نیا سرورق لگا کر، اُسے ایک مستقل اور مکمل جُز کے طور پر رکھا گیا ہے۔ پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ اقبال کے دو الگ الگ مجموعے ہیں۔ ایک کا نام ہے: ارمغانِ حجاز، فارسی اور ایک کا نام ہے ارمغانِ حجاز، اُردو، حالانکہ یہ صحیح صورتِ حال نہیں۔

کلام اقبال کی تدوین

مزید ستم ظریفی یہ ہوئی ہے کہ جہاں فارسی حصہ ختم ہوتا ہے، اُس صفحے کے بالائی حصے پر اس مجموعے کے صفحے کا نمبر شمار ”۱۳۶“ لکھا ہوا ہے اور صفحے کے نیچے مکمل کلیات کے صفحوں کا نمبر شمار ”۱۰۲۸“ مندرج ہے۔ اس کے بعد ارمغانِ حجاز، اُردو کا سرورق ہے۔ اُس صفحے کی پیشانی پر نیا نمبر شمار ”۱“ لکھا گیا ہے اور اُس صفحے کے نچلے حصے میں نمبر شمار ”۶۳۳“ لکھا ہوا ہے۔ پڑھنے والا سمجھ ہی نہیں پائے گا کہ یہ ہوا کیا ہے؟

کلیاتِ اُردو کی جلد کے آخر میں صرف ارمغانِ حجاز، اُردو کو شامل کیا گیا ہے۔ اس سے اُس خیال کی مکمل تائید ہو جاتی ہے کہ اقبال کے دو مستقل مجموعے ہیں: ”ایک کا نام ہے: ارمغانِ حجاز، فارسی اور ایک کا نام ہے: ارمغانِ حجاز، اُردو“۔ اقبال اکادمی اڈیشن میں بھی ارمغانِ حجاز کو اسی طرح دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے، دونوں الگ الگ مجموعوں کی شکل میں فارسی اور اُردو کلام کی جلدوں میں رکھا گیا ہے۔ یہ تقلید کی گئی ہے جاوید اقبال کے اڈیشن کی، یہ دیکھے بغیر اور سوچے بغیر کہ ایسی تقسیم اصولاً جائز بھی ہے؟ مقدّمہ شامل کلیات ہوتا اور اُس میں یہ لوگ اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے، تب یہ ضرور ہو سکتا تھا کہ قاری بتلاے غلط نہیں نہ ہو۔

ارمغانِ حجاز کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ اس مجموعے کو اقبال کی وفات کے بعد چودھری محمد حسین نے مرتب کیا تھا اور انھی کی نگرانی میں کتابت ہوئی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے، تو پھر اس سلسلے میں یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلیاتِ اقبال مرتب کرنے والوں نے اصل مسودات سے مقابلہ کر کے، اس کی تصدیق کر لی ہے کہ اس مجموعے کے مندرجات اور اُن کا متن منشاے مصنف کے مطابق ہے؟ اگر نہیں، تو کیا اُن کو اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کہ ایسی صورت میں ایسے غیر مصدقہ متن کو اعتبار کا وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کی تحقیق اور تدوین کی نظر میں لازمی حیثیت ہوتی ہے۔ آخر یہ کیسے معلوم ہو کہ مصنف کی عدم موجودگی میں کسی مرتب نے [وہ چودھری محمد حسین ہو یا کوئی اور] متن میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا یا غلطی نہیں کی؟ یہ بات بھی وضاحت طلب تھی کہ اس مجموعے کے اصل مسودات محفوظ ہیں؟

موجود ہیں تو وہ کہاں ہیں؟ اس بحث میں ایک بہت اہم بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جاوید اقبال نے جو کلیات چھاپا ہے، اُس کے مختصر مقدمے میں لکھا ہے:

کلامِ اقبال کے اب تک جتنے اڈیشن شائع ہوئے، وہ سب کے سب اُنھیں پلیٹوں سے طبع ہوتے رہے جنھیں حضرت علامہ مرحوم نے خود اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا۔ اس لحاظ سے یہ پلیٹیں حضرت علامہ کے دوسرے تبرکات کی طرح عزّت و حرمت کا مقام رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی مولہ بالا کتاب میں اس کی تردید کی ہے۔ اُنھوں نے ہر مجموعے کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اقبال کی زندگی میں وہ کب چھپا تھا اور اُن کے انتقال کے بعد کس مجموعے کی نئی کتابت کرائی گئی۔ صرف ہالِ جبریل سے متعلق بعض تفصیلات نقل کرتا ہوں۔ ہاشمی صاحب کی تحقیق کے مطابق اس کا پہلا اڈیشن اقبال کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن اُن کی وفات کے بعد مئی ۱۹۴۱ء میں چودھری محمد حسین کی نگرانی میں شائع ہوا۔ اس اڈیشن کے لیے نئی کتابت کرائی گئی۔ اس اشاعتِ ثانی کی پلیٹیں محفوظ کر لی گئیں اور آٹھویں اشاعت تک اُنھی سے کام لیا جاتا رہا۔ نویں اشاعت نومبر ۱۹۵۴ء کی ہے، اور اُس اشاعت کے لیے نئی کتابت کرائی گئی۔

اس کا صاف طور پر مطلب یہ ہوا جاوید اقبال نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اصل حقیقت کا اظہار غالباً یوں مناسب نہیں سمجھا گیا ہوگا کہ اس طرح کئی سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کس نے نئی کتابت کرائی تھی، تصحیح کس نے کی تھی، اصل سے مقابلہ کس نے کیا تھا اور یہ بھی کہ کیا اصل نسخے سے مقابلہ کر لیا گیا تھا۔ اس طرح موخر اشاعتوں سے متعلق اور اُن پر مبنی اس کلیات کے متعلق جو حسن ظن دلوں میں بیٹھ گیا ہے، وہ برقرار نہیں رہ سکے گا۔ بہ قول رفیع الدین ہاشمی:

اقبال کی زندگی میں شائع شدہ اُن کے کسی اُردو مجموعے کے کسی اڈیشن کی پلیٹیں محفوظ نہ رہ سکیں، اس لیے اُن معدوم ”مستبرک پلیٹوں“ کی عزّت و حرمت کی بات محض مبالغہ ہے (ص ۴۲)۔

یہ بات بھی اسی سلسلے کی ہے کہ چودھری محمد حسین کی نگرانی میں جن مجموعوں کی دوبارہ کتابت کرائی گئی، تو ان میں کچھلی اشاعت کی غلطی ہائے کتابت کی تصحیح بھی کی گئی، مگر بعض غلطیاں باقی رہ گئیں اور بعض کا اضافہ ہو گیا۔ مثلاً بالِ جبیریل کی طبع اول میں چودہ اغلاط کتابت باقی رہ گئیں۔ دوسرے اڈیشن میں، جو اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوا تھا، طبع اول کی سات غلطیوں کی تصحیح ہو گئی اور باقی غلطیاں ویسی ہی رہ گئیں۔ مزید برآں، سات نئی غلطیوں کا اضافہ ہو گیا۔ جب نوں اڈیشن کی کتابت ہوئی، تو اُس میں کچھلی چھ غلطیاں درست کر دی گئیں مگر آٹھ غلطیاں بہ دستور موجود رہیں اور چودہ مزید اغلاط کا اضافہ ہو گیا [یہ تفصیل ہاشمی صاحب کی محولہ بالا کتاب سے ماخوذ ہے]۔

اس نوں اڈیشن میں بعض تبدیلیوں اور بعض تصرّفات نے بھی جگہ بنا لی ہے، مثلاً ایک غزل کا مشہور شعر ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اِس زمانے میں

تو اقبال اُس کو سمجھتا مقامِ کبریا کیا ہے

اِس پر حاشیہ بھی ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے: ”جرمنی کا مشہور فلسفی میٹشا.....“۔ دوسرے اڈیشن میں ”نطشہ“ ہے۔ نوں اڈیشن میں اسے ”میٹشا“ بنا دیا گیا ہے۔ میرے سامنے ۱۹۶۸ء کی سولھویں اشاعت ہے، اُس میں بھی یہی املا ملتا ہے (ص ۸۲)۔ جاوید اقبال کے نسخہٴ کلیات میں بھی یہاں ”میٹشا“ ہے اور اقبال اکادمی کے کلیاتِ اُردو میں ”نطشہ“ ہے، یعنی اشاعتِ اول و دوم کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اسی اقبال اکادمی کے حصہٴ کلیاتِ فارسی میں ص ۳۲۹ پر اسے ”نچہ“ لکھا گیا ہے۔ یعنی اُردو کلیات کا ”نطشہ“ اور ”میٹشا“ فارسی کلیات میں ”نچہ“ بن گیا [برصغیر میں ”نچہ“ تو تھے کا ہوا کرتا ہے]۔ ایرانِ جدید کی تقلید میں اِس تبدیلی کو، جسے تصرّف کہنا چاہیے، شامل کیا گیا ہے۔

اقبال اکادمی کے کلیاتِ فارسی میں جی بھر کے ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ میں ایسی مزید دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ص ۳۳۲ پر ایک عنوان ہے: ”جلال و گویتہ“۔ پہلے تو یہی سمجھنے میں دیر لگی کہ یہ ”گویتہ“ کیا بلا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ ”گوئے“

کی مسخ شدہ صورت ہے۔ خیر، میرے پاس پیام مشرق کا بارہواں ایڈیشن ہے، جس میں اس کی صراحت ہے کہ اسے جاوید اقبال نے شائع کیا ہے۔ اس ایڈیشن میں مذکورہ نظم کا عنوان ”جہال و گونے“ ہے۔ دونوں ناموں پر خط کھینچے ہوئے ہیں، اس سے بہ یک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نام ہیں۔ اسی صفحے پر ایک فٹ نوٹ ہے جس میں ساڑھے تین سطریں ہیں، جو یہاں سے شروع ہوتا ہے: ”نوٹ۔ نکتہ دان المنی سے مراد گونے ہے.....“۔ حاشیے کی یہ عبارت جاوید اقبال کے نسخہ کلیات کے حصہ فارسی میں موجود ہے (ص ۶۷۳) مگر اقبال اکادمی کے کلیات فارسی میں یہ موجود نہیں۔ یہی نہیں، پیام مشرق میں ایسے بہت سے حواشی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک حاشیہ بھی اکادمی کے نسخہ کلیات میں شامل نہیں۔ تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اقبال اکادمی کے مرتبین کی نظر میں یہ ساری عبارتیں [جو پیام مشرق کی پرانی اشاعتوں میں شامل ہیں اور جاوید اقبال کے نسخہ کلیات میں بھی شامل ہیں] اقبال کی نہیں؟ یہ تو محض چند مثالیں ہیں، پورا کلیات ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تحریر طویل ہوتی جا رہی ہے، اس لیے میں بس ایک اور مثال پیش کر رہا ہوں۔

بال جبریل میں ”قید خانے میں معتمد کی فریاد“ کے عنوان سے ایک نظم ہے، جس پر حاشیہ ملتا ہے۔ حاشیے کی عبارت یہاں سے شروع ہوتی ہے: ”معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک اور حکم راں نے اُس کو شکست دے کر.....“۔ اقبال کی وفات کے بعد مئی ۱۹۴۱ء میں چودھری محمد حسین کی نگرانی میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اُس ایڈیشن میں ”ہسپانیہ کے ایک اور حکم راں“ میں سے لفظ ”اور“ نکال دیا گیا اور اب سارے ایڈیشنوں میں ”ہسپانیہ کے ایک حکم راں“ ہے۔ ”تمہیدی نوٹ میں متذکرہ تبدیلی علامہ اقبال کی وفات کے بعد اشاعت کا اہتمام کرنے والوں نے اپنی صواب دید پر کی، غالباً چودھری محمد حسین نے۔ بہر حال یہ تبدیلی درست نہیں“ [تصانیف اقبال، ص ۳۲]۔ جو کچھ لکھا گیا، یہ مختصر بیان ہے اُن تبدیلیوں کا جو کلام اقبال کے مختلف مجموعوں میں راہ پا گئی ہیں۔ کلیات اقبال کے مرتبین نے ساری بحثوں اور جھگڑوں سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نہ تو حواشی لکھے جائیں اور نہ مفصل مقدمہ لکھا جائے۔ خیر، جاوید اقبال تو تحقیق

اور تدوین کے آدمی ہی نہیں، اُن سے کیا کہا جائے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اُن کے کلیات کو دیکھ کر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض تجارتی اغراض کے تحت اُسے شائع کیا گیا ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ اقبال اکادمی کے کلیات کو بھی ان سب ضروری اور لازمی اجزا سے محفوظ رکھا گیا۔ بے شمار روپیہ خرچ ہوا، بہت سے لوگوں نے مل کر ایک بڑے ادارے کے تحت کام کیا، لیکن احوال اس ”پنچایتی کلیات“ کا بھی وہی ہے کہ اس میں دو صفحے کا بھی مقدمہ مرتب (یا مرتبین) شامل نہیں۔ جہاں مفصل تحقیقی انداز کے مقدمے کو ہونا چاہیے تھا، وہاں ”خراج عقیدت“ کے عنوان سے اقبال کی شاعری سے متعلق سات صفحات میں مختلف افراد کے اقوال نقل کر دیے گئے ہیں اور بس۔ حواشی نام کا ایک صفحہ درکنار، ایک سطر بھی نہیں۔ متن سے متعلق بیسیوں سوالات پیدا ہوتے ہیں اور کسی سوال کا جواب موجود نہیں۔ بے ساختہ سردار جمعفری کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

درد برد ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال

اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب

اقبال اکادمی کے کلیات کا [جو دو جلدوں میں شائع ہوا ہے] تحقیق اور تدوین کے نقطہ نظر سے احوال جس قدر تباہ ہے، اُس کا بیان اس تحریر میں نہیں ساسکتا۔ میں ایک دل چسپ بلکہ عبرت ناک مثال پر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ جب یہ کلیات مجھے ملا تو میں نے دیکھا کہ کلیات فارسی میں ص ۴ پر دو قطعے ہیں۔ اُن میں سے دوسرا قطعہ اس طرح لکھا ہوا ہے:

”سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمی از جاز آید کہ ناید؟“

سر آمد رُو ز گاری این فقیری دگر دانایے راز آید کہ ناید؟“

پہلے تو نظراستفہامیہ نشانات پر رُکی جو تین مصرعوں کے آخر میں لگائے گئے ہیں۔ ان علاماتِ استفہام کا ان مصرعوں میں جواز، جب سمجھ میں نہیں آیا تو اُسے اپنا تصور فہم سمجھ لیا، مگر اس کے بعد ہی دوسرے شعر پر نظر رک گئی۔ بہت حیرانی ہوئی کہ اقبال کے ایک نہایت مشہور قطعے کو بھی صحیح طور پر نہیں لکھا جاسکتا! ”نسیمی“ اور ”فقیری“ سے قطع نظر کرتے ہوئے

عرض کروں کہ ”دانا یے راز“ قطعی طور پر غلط ہے۔ یہ مرگب اضافی ہے۔ اس میں دو مکی کا محل نہیں، صرف ایک کے لکھی جائے گی، یعنی ”داناے راز“ یا ایرانیوں کی رعایت سے ”دانا ی راز“۔ اسی طرح ”روزگاری“ بھی غلط محض ہے۔ اس میں ی غلط طور پر داخل کر دی گئی ہے۔ یہ بھی مرگب اضافی ہے، اس لیے ”روزگار“ کی رے کے نیچے اضافت کا زیر لگایا جائے گا۔ مکی کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، نہ ہندستانی طریق کتابت میں اور نہ ایرانی طریق املا میں۔

خیر، کچھ دنوں کے بعد اس قطعے کو دوبارہ دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اب جو ڈھونڈتا ہوں تو یہ قطعہ نہیں ملتا۔ ص ۴ موجود ہے، لیکن اُس پر کوئی قطعہ نہیں۔ قطعوں کے بجائے اُس صفحے پر ایرانی وزیر فرہنگ کا شکر یہ ادا کیا گیا ہے۔ شکرے کی یہ عبارت پہلے نظر سے نہیں گزری تھی۔ کئی بار ورق گردانی کی، وہ صفحہ نہیں ملا، جس پر دو قطعے میں نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

اچانک ذہن میں ایک خیال آیا۔ میرے پاس اس کلیات کے دو نسخے ہیں۔ جلد فارسی کا دوسرا نسخہ جو اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اُس میں ص ۴ پر وہ دونوں قطعے موجود ہیں۔ کلیات کے دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نسخے کے شروع کے سولہ صفحے بدل دیے گئے ہیں، مگر اس سلسلے میں کسی طرح کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اُن سولہ صفحوں کی تفصیل تو میں نے ایک دوسری تحریر میں لکھی ہے، یہاں صفحہ پانچ کے صرف ایک اندراج کے متعلق عرض کروں کہ اُس پر ”مجلس منظمہ“ کے عنوان کے تحت یہ مرقوم ہے: ”سرپرست: دکتر جاوید اقبال“۔ دوسرے نسخے سے یہ اندراج غائب ہے۔ وہاں ”مجلس منظمہ“ کا عنوان ہی نہیں، اُس کے بجائے ”حُسن اہتمام“ کے عنوان کے تحت چودہ حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔ جاوید اقبال کا نام بہ طور سرپرست کیوں نکالا گیا؟ اس کا احوال معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کدھر کا اشارہ تھا۔ شروع کے اُن سولہ صفحوں کے اندراجات کو یکسر بدل دیا گیا ہے۔ ایک قابل ذکر اضافہ یہ ہے کہ پہلے نسخے میں اُس جلد کی قیمت ساڑھے تین سو روپے درج ہے۔ دوسرے نسخے میں قیمت پانچ سو روپے ہے۔ اس کا بہ ظاہر مطلب یہی



معلوم ہوتا ہے کہ سولہ صفحے بدلے گئے تو اُن پر ڈیڑھ سو روپے فی جلد کے حساب سے خرچ آیا، یوں اب قیمت بڑھ کر پانچ سو روپے ہو گئی۔ یہ خیال رہے کہ یہ کسی تجارتی کمپنی کا چھاپا ہوا نہیں، ایک علمی ادارے نے اسے شائع کیا ہے۔

یہ محض اتفاق ہے کہ میرے پاس دونوں نسخے ہیں، سب کے پاس تو نہیں ہوں گے۔ کیسے معلوم ہوگا کہ پہلے کیا تھا اور بعد کو اُسے کیوں بدلا گیا۔ یہی بات کیسے معلوم ہوگی کہ تبدیلی کی گئی ہے۔ تبدیلی اگر ضروری تھی اور جاوید اقبال کی سرپرستی کو ختم کرنا تھا اور ایرانی وزیرِ محترم کا شکر یہ ادا کرنا ضروری تھا [جو پہلے ضروری نہیں تھا] تو یہ لازم تھا کہ اس تبدیلی کی نشان دہی کی جاتی۔ دونوں نسخوں پر سال اشاعت ایک ہی مندرج ہے [۱۹۹۰ء]۔ اس سے جو الجھن پیدا ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے، اُس کا اندازہ کسی نے نہیں لگایا۔ اسی ایک بات سے اس مرصع نسخہٴ کَلِّیَات کے متعلق کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔☆

اس تحریر کا مقصد صرف یہ ہے کہ اربابِ نظر اور اہلِ علم کی توجہ اس طرف منعطف کرائی جائے کہ ”شاعرِ ملت، شاعرِ مشرق“ اور ”حکیم الامت“ کے کلام کا تحقیق و تدوین کے لحاظ سے معیاری اڈیشن مرتب کیا جانا از بس ضروری ہے۔ یہ ایسی کمی ہے جس پر جس قدر فسوس کیا جائے، کم ہے۔ نقش و نگارِ پردہٴ در میں ہماری نظریں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ تجارت زدہ ذہنوں کے لیے اور عوام الناس کے لیے غیر تحقیقی اڈیشن ضرور پسندیدہ ہوں گے، مگر اہلِ نظر کے لیے یہ لمحہٴ فکر یہ ہیں اور یہ اہم سوال اس کا متقاضی ہے کہ نہایت درجہ علمی ذمے داری کے ساتھ اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کیا جائے۔

(تدوین۔ تحقیق، روایت: رشید حسن خاں۔ اے ایس پرنٹرز نئی دہلی، ۱۹۹۹ء)

☆ طبع دوم (۱۹۹۳ء) میں ص ۶۵ سے ”حسن اہتمام“ اور قطعہٴ تاریخ اشاعت از انور جاوید نکال کر،

”پیش لفظ“ از ڈاکٹر وحید قریشی شامل کیا گیا ہے۔ (ر۔ ہاشمی)

## تاریخ ہند: مزید تصریحات

زیر نظر کتاب میں شامل مضمون: ”تاریخ ہند: چند تصریحات“ کے سلسلے میں کچھ نئی معلومات میسر آئی ہیں، جنہیں ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

راقم الحروف نسخہ کفایت کی کسی مٹھی جلد (اسی طباعت کے کسی اور نسخے) کی تلاش میں رہا۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصہ پہلے اس کے ایک مٹھی نسخے کا سراغ ملا، جو مکمل ہے۔ نسخہ کفایت کا آخری صفحہ ۳۵۶ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ چونکہ آخری باب (۲۳) صفحہ ۳۵۴ سے شروع ہو رہا ہے، اس لیے وہ صفحہ ۴۰۰ تک پھیلا ہوا ہوگا، مگر اس نئے نسخے کا متن صفحہ ۳۵۸ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا نسخہ کفایت میں صرف دو صفحات (۳۵۷، ۳۵۸) موجود نہیں ہیں۔ نیا دریافت شدہ مذکورہ بالا نسخہ (= نسخہ سنجر پور) محمد مبارک شاہ جیلانی کے کتب خانہ سنجر پور، ریاست بہاول پور میں موجود ہے۔ مجھے اس کا عکس اپنے فاضل دوست ملک حق نواز خاں صاحب (پیرزنی ضلع اٹک) کی وساطت سے حاصل ہوا ہے۔

نئی معلومات و تصریحات کے ضمن میں دو تین باتیں قابل ذکر ہیں:

۱- نسخہ کفایت اور نسخہ سنجر پور کے سرورق یکساں ہیں۔ دونوں پر قیمت بھی فی جلد ۸/- آنے لکھی ہوئی ہے مگر نسخہ کفایت میں تعداد جلد کا ذکر نہیں ہے جب کہ نسخہ سنجر پور میں تعداد جلد دس ہزار درج ہے۔ نسخہ کفایت پر ’دفعہ اول‘ ہے جب کہ نسخہ سنجر پور میں ’دفعہ اول‘ لکھا ہوا ہے (اس کے سرورق کا عکس دیا جا رہا ہے)۔

۲- نسخہ کفایت، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ناقص الآخر ہے لیکن نسخہ سنجر پور مکمل ہے اور کتاب کا متن صفحہ ۳۵۸ پر مکمل ہو کر ختم ہوتا ہے۔

یہاں سکین صفحہ آئے گا

یہاں سکین صفحہ آئے گا

۳- نسخہ سنجر پور کی سب سے اہم چیز کتاب کے بائیں طرف شامل انگریزی زبان میں کتاب کا سرورق ہے۔ یہ انگریزی سرورق، اُردو سرورق کا ترجمہ ہے، تاہم اس میں *History of India* کے نیچے ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے:

Completely revised and brought down to 1912

اُردو اور انگریزی سرورقوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ اُردو سرورق پر ایجوکیشنل پبشرز کے الفاظ درج ہیں جب کہ انگریزی سرورق پر Mufid-i-Am Press کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ (انگریزی سرورق کا عکس بھی دیا جا رہا ہے۔)

۴- دس ہزار کی تعداد میں کتاب (نسخہ سنجر پور) کی اشاعت سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ اسے بطور نصابی کتاب منظور کر کے سکولوں میں پڑھایا جاتا رہا ہوگا۔

اگرچہ تاریخ ہند کے ترمیم شدہ ایڈیشن (نسخہ کفایت و سنجر) سے عالم گیر، محمود غزنوی، ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ سے متعلق بہت سی قابل اعتراض باتیں نکال دی گئی تھیں، اس کے باوجود، اس میں اب بھی ہندوستانی حکمرانوں اور انگریزی حکومت سے متعلق ایسے بیانات موجود ہیں، جو اقبال کے تصورات اور فکر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ بنا بریں یہ سوال اب بھی حل طلب ہے کہ اس کے سرورق پر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی پیرسٹر ایٹ لاء کے الفاظ کیوں درج ہیں؟

## کتابیات

وضاحت: زیر نظر مجموعے کے ہر مضمون کے آخر میں ”حوالے اور حواشی“ اس کے تحت اس مضمون میں محولہ کتابوں کے کوائف شامل ہیں۔ اس طرح ”اختصارات“ (ص ۱۶) کے تحت بھی چند کتابوں کے کوائف دیے گئے ہیں۔ ان سب کتابوں کے کتابیاتی کوائف دوبارہ یہاں نہیں دیے جا رہے۔

☆ علامہ اقبال کی تصانیف:

- ۱- اقبال بنام شاد: محمد عبداللہ قریشی (مرتب)۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۶ء۔
- ۲- اقبال درون خانہ [دوم]: خالد نظیر صوفی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۳ء۔
- ۳- اقبال نامہ، اول: شیخ عطاء اللہ (مرتب)۔ شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۴ء۔
- ۴- اقبال نامہ، دوم: شیخ عطاء اللہ (مرتب)۔ شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۵۱ء۔
- ۵- انوار اقبال: بشیر احمد ڈار (مرتب)۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۹ء۔
- ۶- خطوط اقبال: رفیع الدین ہاشمی (مرتب)۔ مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۷۶ء۔
- ۷- کلیات اقبال، اردو: شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۷۳ء۔
- ۸- کلیات اقبال، فارسی: شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۷۳ء۔
- ۹- گفتار اقبال: محمد رفیق افضل (مرتب)۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء۔
- ۱۰- مقالات اقبال: سید عبدالواحد معینی (مرتب)۔ آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۳ء۔
- ۱۱- Letters of Iqbal، بشیر احمد ڈار (مرتب)۔ اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۸ء۔
- ۱۲- Letters and Writings of Iqbal، بی اے ڈار (مرتب)۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۷ء۔
- ۱۳- Stray Reflections، جاوید اقبال (مرتب)۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۱ء۔

☆ دیگر مصنفین

- ۱- روزگار فقیر، [اڈل]: فقیر سید وحید الدین۔ لائن آرٹ پریس کراچی، ۱۹۶۳ء۔
- ۲- عروج اقبال: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۷ء۔
- ۳- مظلوم اقبال: شیخ اعجاز احمد۔ کراچی، ۱۹۸۵ء۔
- ۴- Iqbal: عطیہ بیگم۔ آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۹ء۔

## اشاریہ

مرتب

ڈاکٹر خالد ندیم

- ۱- یہ اشاریہ صفحہ ۷۷ سے ۳۱۷ کو محیط ہے۔
- ۲- اشاریہ اسما، مقامات، کتب و رسائل اور علمی و ادبی اور اشاعتی اداروں کے حوالوں تک محدود ہے
- ۳- علامہ اقبال کا ذکر تقریباً ہر صفحے پر آیا ہے، چنانچہ اقبال کا حوالہ اشاریے میں شامل نہیں کیا گیا۔
- ۴- کتب و رسائل اور اخبارات کے نام نسخ میں لکھے گئے ہیں

ابو ترابؓ، دیکھیے: علیؓ، حضرت

آدمؑ، حضرت: ۱۰۳

ابو ذر غفاریؓ: ۱۹۹

آرٹلڈ، پروفیسر: ۶۳، ۲۳۶، ۲۳۲، ۲۵۱، ۲۵۸

ابوراشد فاروقی: ۶۲، ۱۵۳

آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد: ۶۱

ابوسعید خدریؓ، حضرت: ۹۸

آسٹریا: ۶۷، ۷۷

ابوعبیدہؓ بن الجراح: ۱۲۸

آسیا: ۸۵۔ مزید دیکھیے ایشیا

ابو ہریرہؓ، حضرت: ۹۸

آفتاب اقبال: ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۳۰، ۳۰، ۲۵۰، ۲۶۰

ابن سینیا: ۱۲۹، ۱۳۰

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن: ۵۷

انک: ۲۱۳

آل احمد سرور، پروفیسر: ۲۶، ۲۷، ۵۸، ۵۸

اٹلی: ۷۷، ۱۲۹، ۲۳۲، ۲۳۸

آل عثمان: ۱۱۴

اجمل خاں، حکیم: ۲۸

آیور لاج، سر: ۲۲

احسان (لاہور): ۹۱

آمو: ۸۵

احمد بن حنبلؓ، امام: ۱۳۸

آندھرا پریش اسٹیٹ آرکائیوز: ۱۶۸

احمد شاہ ابدالی: ۱۱۳، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۶۷

آں حضورؐ، دیکھیے: محمدؐ، حضرت

احمد شجاع، حکیم: ۲۵۹

آئن سٹائن: ۲۳

احمدیہ پریس، حیدرآباد دکن: ۹۱

آئی ایم ایف: ۶۸

اخبار اردو: ۲۸۵

آئینہ ادب، لاہور: ۲۸، ۲۹، ۲۶۷

اختر راہی: ۹۲، ۲۶۸

آہنگ (کراچی): ۶۰

اختر مسعود: ۵۹

ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال:

۳۰۲

اخلاق اثر، ڈاکٹر: ۲۹، ۲۶۲

ابراہیمؑ، حضرت: ۱۷۰، ۱۷۰، ۱۹۶

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد: ۲۸۵

ابصار احمد، ڈاکٹر: ۲۹

ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور:

۵۸، ۲۶۷، ۲۶۹

ابن پرویس رقم: ۲۲۳

ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور: ۶۰-۶۲

ابوالحسنؓ دیکھیے، علیؓ، حضرت

ادارہ معارف اسلامیہ، لاہور: ۳۰

ابوالحسن علی ندوی، مولانا: ۵۳

ادارہ نقوش، لاہور: ۲۲

ابوالکلام آزاد، مولانا: ۲۳۳



- ادارہ یادگار غالب، کراچی: ۲۶۹
- اردو اکادمی، دہلی: ۱۷۰
- اردو اکیڈمی، لاہور: ۴۱
- اردو املا: ۲۸۵
- اردو بزمِ مشاعرہ: ۲۵۴
- اردو کورس: ۲۵۹
- اردو لغت: ۲۹۲
- اردو میں فنی تدوین: تعارف و تجزیہ: ۲۸۵
- اردو، کراچی: ۲۶۶
- ارشاد گورگانی: ۲۳۶
- ارشادات اقبال: ۲۴۰
- ارمغان حجاز: ۲۵، ۳۱، ۹۲، ۱۱۲، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۴، ۲۰۴
- ۳۰۷، ۳۰۶، ۲۹۱، ۲۲۲، ۲۱۵
- ارمغان دکن: ۲۹، ۳۰، ۳۱
- اپہین: دیکھیے ہسپانیہ
- اسرار احمد سہاروی، پروفیسر: ۵۲
- اسرار خودی: ۱۱۷، ۲۲۱، ۲۶۱، ۲۸۱، ۳۰۳، ۳۰۴
- اسرار خودی: فراموش شدہ ادیشن: ۳۰۳
- اسرار و رموز: ۱۳۴، ۱۷۰
- اسرائیل: ۲۱۵
- اسرائیل: ۸۷، ۸۸
- اسکندر: ۱۲۷-مزید دیکھیے سکندر
- اسلام اور جدید معاشی نظام: ۷۴
- اسلام آباد: ۴۹، ۵۹، ۶۰، ۲۶۵، ۲۶۹، ۲۸۵
- اسلام کا قانون بین الممالک: ۱۳۶
- اسلامک پیلی کیشنز، لاہور: ۲۹، ۷۲، ۱۱۰، ۱۳۲، ۱۳۳
- اسلامی تصورات، اقبال اور عصرِ حاضر: ۵۰
- اسلامی فکر کی تشکیل نو: ۵۹
- اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات: ۱۳۲، ۱۳۳
- اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ: ۵۲
- اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور: ۱۳۶
- اسلم انصاری، پروفیسر: ۶۰
- اسلوب احمد انصاری: ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۸۳، ۲۸۴
- اشبیلیہ: ۳۱۰
- اشراق، لاہور: ۶۱
- اشعری، ابوالحسن: ۴۴
- اصلاحات اقبال: ۲۱۶
- اعتقاد پبلسٹک ہاؤس، دہلی: ۱۳۴
- اعجاز احمد، شیخ: ۱۱۱، ۲۶۴
- اعظم گڑھ: ۱۳۲، ۲۳۲
- افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۶۹، ۲۸۲
- افتخار امام صدیقی: ۲۶۸
- افرنگ: دیکھیے فرنگ
- افریقہ: ۶۸، ۶۹، ۷۷، ۸۷
- افغانستان: ۷۱، ۸۰، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۲
- ۱۳۰، ۱۳۳، ۲۳۶، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۶۱
- افکار معلم، لاہور: ۷۵
- اقبال (بزمِ اقبال، لاہور): ۵۸، ۶۱، ۱۱۲، ۲۶۷، ۲۶۹

- اقبال: ایک مسلم سیاسی مفکر: ۶۴
- ۱۷۲، ۳۱
- اقبال اور عبدالحق: ۲۹
- اقبال اور عبدالقادر: ۲۴۰
- اقبال اور عطائی: ۲۶۵
- اقبال اور غزل: ۲۸۵
- اقبال اور گجرات: ۲۶۵
- اقبال اور مغربی فکر: ۶۰
- اقبال اور ممنون: ۲۶۴
- اقبال اور مودودی: ۱۵۳، ۶۲
- اقبال بنام شاد: ۱۱۰، ۲۹، ۲۸
- اقبال پر تحقیقی مقالے: ۲۶۶
- اقبال درون خانہ: ۱۱۰، ۱۷۱، ۱۷۱، ۲۳۱، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۶۸
- اقبال ریویو، لاہور: ۲۶۲، ۱۳۵، ۲۶۶، ۲۶۹
- اقبال ریویو، حیدرآباد دکن: ۱۷۲
- اقبال سنگھ: ۲۶۷
- اقبال شناسی: ۶۱
- اقبال عہد آفرین: ۶۰
- اقبال کا تصورِ آخرت: ۵۱
- اقبال کا تصورِ اجتہاد: ۲۸
- اقبال کا تصورِ جنت و دوزخ: ۶۰
- اقبال کا نظریہ خودی: ۵۰
- اقبال کامل: ۳۳۲
- اقبال کی ابتدائی زندگی: ۲۶۸، ۲۶۴
- اقبال کی تلاش: ۲۹۴
- اقبال: جادوگرِ ہندی نژاد: ۲۶۶
- اقبال: جہانِ دیگر: ۲۶۵، ۱۳۵، ۹۲
- اقبال: جہانِ دیگر اردو/انگریزی: ۲۶۶/۲۶۵
- اقبال: حیاتِ عصر: ۲۶۵
- اقبال: دانائے راز: ۲۵۳
- اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں: ۹۲، ۲۶۸
- اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیل نو: ۶۲، ۶۰
- اقبال: نئی تحقیق: ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۲۶۴
- اقبال: یورپ میں: ۲۶۴، ۲۶۹
- اقبال اکادمی پاکستان، لاہور: ۴۱، ۵۱، ۵۷-۶۱، ۹۳، ۱۳۳، ۱۷۱، ۱۷۵، ۲۶۷-۲۷۲، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۱۱
- اقبال اکادمی، کراچی: ۲۸، ۱۳۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹
- اقبال اکیڈمی، حیدرآباد دکن: ۱۷۲، ۲۹
- اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر: ۴۸، ۵۱، ۶۰، ۶۲، ۲۸۵
- اقبال اور اجتہاد: ۵۰
- اقبال اور بزمِ اقبال: ۳۱
- اقبال اور بھوپال: ۲۶۴، ۲۶۸
- اقبال اور پاکستان: ۷۵
- اقبال اور پنجاب کونسل: ۲۶۴
- اقبال اور حیدرآباد (نظرِ حیدرآبادی): ۲۸، ۲۹
- اقبال اور حیدرآباد (تخلیل احمد): ۲۸، ۲۹، ۳۰

- اقبال کی شخصیت اور شاعری: ۱۳۴
- اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ: ۲۶۹
- اقبال کی شعری و فکری جہات: ۶۲
- اقبال کی صحبت میں: ۲۶۴
- اقبال کی مابعد الطبیعیات: ۵۷
- اقبال کے حضور: ۲۵۱، ۱۳۴، ۹۳
- اقبال کے ہم صفیر: ۲۶۵
- اقبال کے ہم نشین: ۲۶۴
- اقبال میوزیم، لاہور: ۲۲۳، ۲۵۱، ۲۶۸
- اقبال نامہ: ۴۲، ۹۲، ۹۳، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷
- ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷
- اقبال نامے: ۲۹
- اقبالی مجرم: ۲۶۷، ۲۶۸
- اقبالیات، لاہور: ۵۱، ۶۰، ۶۱، ۶۲
- اقبالیات کا مطالعہ: ۴۱
- اقبالیات کے تین سال: ۶۰
- اقبالیات نذیر نیازی: ۱۳۳
- اقبالیاتی جائزے: ۲۶۷
- اقبال ہند (خلاصہ تاریخ ہند): ۱۵۶
- اقدام، لاہور: ۲۳۴، ۲۶۸
- اقوام متحدہ: ۹۰
- اکبر حیدری، سر: ۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵
- ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱
- اکبر علی، سید: ۲۶۹
- اکبر، شہنشاہ جلال الدین: ۱۵۸، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۷۰
- البحوث الاسلامیہ: ۷۵
- الہی، ڈاکٹر: ۵۳
- الجزائر: ۱۲۲
- الجمعیۃ: ۱۳۲
- الجهاد فی الاسلام: ۱۳۲، ۱۳۳
- الرشید، لاہور: ۲۲۸
- الفیصل، لاہور: ۲۶۷
- القمر انٹر پرائز، لاہور: ۲۲۹، ۲۸۵
- الکتب پبلشرز، حیدرآباد دکن: ۲۸، ۲۹
- المسلمون: ۷۵
- امامہ، حضرت: ۹۷
- امراؤ سنگھ میٹھی، سردار: ۲۲، ۲۳، ۲۵
- امرت الیکٹرک پریس، لاہور: ۱۵۲
- امرتسر: ۱۵۵
- امروز، لاہور: ۲۲۸، ۲۲۹
- امریکا: ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۷۵، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸
- املا نامہ: ۲۸۵
- انجمن حمایت اسلام، لاہور: ۲۸، ۳۸، ۲۳۸، ۲۵۱
- انصاری، ڈاکٹر: ۲۹
- انقلاب، لاہور: ۴۳، ۵۸، ۲۳۱، ۲۳۳
- انگلستان + برطانیہ: ۲۱، ۶۳، ۶۷، ۷۲، ۷۴
- انوار اقبال: ۳۱، ۷۲، ۹۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۶، ۱۵۷
- ۱۶۹، ۲۲۹
- انور پاشا، غازی: ۸۵، ۱۲۴

انور جاوید: ۳۱۳

بازیافت، لاہور: ۱۷۴

انور شاہ کاشمیری، سید: ۱۳۶

باغ و بہار: ۲۷۳

انیس، میر: ۳۳، ۳۲، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹

باقیاتِ اقبال: ۱۷۴

۴۱، ۴۰

باقیاتِ اقبال: ۱۷۴، ۲۵۴

اودھ: ۳۸

باقیاتِ شعرِ اقبال: ۱۷۴

اوراقِ گم گشتہ: ۲۹

بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ: ۲۲۹، ۲۸۵

اورنگ زیب عالم گیر: ۱۳۸، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۳

بال جبریل: ۶۶، ۷۲، ۸۱، ۹۲، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۲

۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱

۱۱۷، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۳، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۷۳

۱۷۷، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۰۲، ۲۰۹، ۲۱۶

اورینٹل کالج، لاہور: ۲۵۸

۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۴۵، ۲۷۸-۲۸۴

اورینٹل کالج لائبریری، لاہور: ۹۳، ۱۳۴

۲۹۳، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۰

اورینٹل کالج میگزین (لاہور): ۲۱۹

بالک: ۸۵

ایبٹ آباد: ۲۳۶

بانگِ درا: ۷۲، ۹۰، ۹۱، ۹۳، ۱۱۰-۱۱۲

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ: ۱۳۴

۱۳۳-۱۳۶، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۱۶

ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور: ۲۷۲، ۳۱۷

۲۲۲، ۲۷۲، ۲۷۶، ۲۷۸، ۳۰۱

ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی: ۵۸

بخارا: ۱۲۲، ۱۲۱، ۸۵

ایڈم سمٹھ (Adam Smith): ۷۲

بخاری شریف: ۹۸، ۱۳۳

ایڈولفس روڈ، فیسبری ناتھ لندن: ۲۵۴

پدر: ۱۲۵، ۱۸۹

ایران: ۷۱، ۸۶، ۸۷، ۱۲۵، ۱۳۳، ۲۹۸، ۳۰۹

برصغیر: ۲۹۸، ۳۰۹

ایشیا: ۶۸، ۶۹، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۹۱، ۱۹۳

بر عظیم: ۴۵، ۶۳، ۸۲، ۱۱۹، ۲۸۰، ۲۸۳

ایماونگے ناسٹ: ۲۶۰

براہیم: دیکھیے ابراہیم

ایبٹ آباد: ۲۲۱

برطانیہ: دیکھیے: انگلستان

ایوب صابر، پروفیسر: ۲۶۹

برگساں: ۴۴

اے ایس پرنٹرز، نئی دہلی: ۳۱۳

برگ شل ہسٹری: ۶۰

بابالول جج: ۲۵۶

برلن: ۸۵

بابر، شہنشاہ ظہیر الدین: ۶۷، ۱۱۳، ۱۶۶، ۱۷۱

برما: ۱۳۳

- برنارڈ شا: ۴۴  
برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر: ۴۴، ۵۳، ۶۰  
برہان قاطع: ۲۹۲  
بزمِ اقبال کی زُودادیں (بزمِ اقبال، لاہور): ۲۶۷  
بزمِ اقبال، لاہور: ۴۵، ۵۰، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۹۲  
بزمِ اقبال، ۲۳۲، ۲۶۷، ۲۶۸  
بشیر احمد ڈار: ۴۳، ۵۷، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۲، ۲۲۹  
۲۳۳  
بشیر احمد قریشی، پروفیسر: ۶۱  
بشیر الدین محمود، مرزا: ۲۳۶  
بشیر ضیائی: ۲۵۲  
بلقان: ۸۵  
بلوچستان: ۲۳۳  
بھٹی: ۲۱، ۱۵۶، ۲۶۸  
بنگور: ۴۳، ۲۲۵  
بوعلی سینا: ۱۷۹، ۱۹۸  
بوستانِ خیال: ۲۶۹  
بوسنیا: ۷۱، ۱۳۳  
بون یونیورسٹی: ۸۹  
بہادر یار جنگ: ۲۱، ۲۷، ۲۹  
بہار (بھارتی صوبہ): ۲۸۴  
بہارِ عجم (گفت): ۲۹۲  
بہاول پور: ۱۳۶، ۳۱۴  
بہاء اللہ: ۱۳۴  
بھارت: ۲۸، ۴۹، ۵۸، ۱۳۹، ۲۵۳، ۲۵۵
- بھارتی پنجاب: ۱۷۱  
بھوپال: ۲۱، ۲۲، ۲۹، ۴۰، ۴۳، ۴۴، ۲۶۴  
بیدل: ۱۲۱  
بیرون موچی دروازہ: ۲۵۹  
بیگم رشیدہ آفتاب اقبال: ۲۶۵  
بیگم سراج کبر حیدری: ۱۸  
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد: ۵۹  
پاکستان: ۴۵، ۴۸، ۸۲، ۱۴۰، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۷۱، ۱۷۲  
۲۳۷، ۲۸۰، ۲۸۷  
پاکستان انسٹیٹیوٹ، جامعہ کراچی: ۴۹، ۶۰  
پاکستان ٹائمر پریس، لاہور: ۲۸۱  
پاکستان ٹیلی وژن لاہور: ۶۱  
پانی پت: ۲۴۲  
پٹنہ: ۵۸، ۲۱۶  
پٹھان کوٹ: ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۵۳  
پرننگال: ۷۴  
پرننگال پبلس: ۲۵۸  
پرویو، رقم، منشی عبدالحجیر: ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۸  
۲۲۹، ۲۷۶، ۲۷۷  
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق: ۲۳، ۶۹  
۷۷، ۹۲، ۱۴۵، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵  
پشاور: ۳۱، ۴۲، ۲۲۴  
پشاور یونیورسٹی، پشاور: ۳۱، ۴۲  
پلستا (بحری جہاز): ۲۱  
پنجاب: ۲۶۱، ۲۳۲، ۱۴۶



- ثبوت حاضر ہیں: ۱۳۴
- جابرؓ، حضرت: ۹۸
- جامعہ ام القری، مکہ: ۵۳
- جامعہ پنجاب، لاہور: ۵۱، ۵۸، ۶۱، ۲۶۷- مزید دیکھیے پنجاب یونیورسٹی
- جامعہ عثمانیہ: ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۹
- جامعہ کراچی: ۲۹
- جامعہ ملیہ اسلامیہ، نجی دہلی: ۶۰، ۲۳۳
- جاوید اقبال، ڈاکٹر: ۴۵، ۹۶، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۵۴- ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۹۱، ۲۸۹- ۲۸۷، ۲۸۱، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۳
- جاوید منزل، لاہور: ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۶۲، ۲۶۸، ۲۸۲
- جاوید نادیہ: ۲۷، ۳۱، ۵۶، ۸۱، ۹۱، ۹۳، ۱۱۲، ۱۳۴، ۱۳۵
- ۲۷۸، ۲۲۳، ۲۲۲، ۱۷۰، ۱۷۵
- جبریل جبریل: ۱۸۵، ۱۹۶، ۱۹۸
- جرمنی: ۷۷، ۸۳، ۸۵، ۸۱
- جشن کفایت اللہ کمیٹی، مالیر کوٹلہ: ۱۷۱
- جعفر بلوچ، پروفیسر: ۲۶۵
- جگن ناتھ آزاد، پروفیسر: ۴۶، ۵۹، ۲۵۳، ۲۶۶
- جمال الدین افغانی: ۸۱
- جمال پور: ۱۳۲، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۵۳
- جمیل احمد قریشی: ۲۷۷
- جم جمشید: ۱۲۳، ۱۹۵، ۲۲۴
- جنگ، لاہور: ۷۳، ۲۲۹
- جنوبی ہند: ۲۰، ۲۵۶
- جنیوا: ۷۰
- جوہر: ۵۹، ۷۲
- جوہر، مولانا محمد علی: ۲۸۴
- جہات اقبال: ۶۱
- جہاد اسلامی: ۱۳۳، ۱۳۴
- چراغ حسن حسرت: ۲۳۲، ۲۵۸، ۲۶۸، ۲۶۹
- چراغ حسن حسرت: احوال و آثار: ۲۶۸، ۲۶۹
- چراغ راہ، کراچی: ۵۹
- چند یادیں، چند تاثرات: ۲۶۷
- چنگیز: ۶۸، ۱۲۷
- چودھری محمد حسین اور اقبال، روابط: ۱۳۴، ۹۳
- چچینا: ۱۳۰، ۱۳۳
- چچین: ۱۲۹
- چینی ترکستان: ۱۲۲
- حافظ شیرازی، خولجہ: ۳۰۳، ۳۰۴
- حالی: ۲۸
- حبشہ: ۱۲۹
- حبیب الرحمن ثروانی، مولانا: ۱۶۸
- حجاز: ۱۳۰، ۲۶۱، ۳۱۱
- حرا پہلی کیشنز، لاہور: ۶۰
- حرف اقبال: ۱۵۲
- حرم: ۳۳، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۳۰، ۱۳۹، ۱۴۴، ۱۸۸، ۱۸۹، ۲۱۳، ۲۰۹، ۲۱۶
- حسن: ۴۱

اقبالیات: تفہیم و تخریہ

حسن اختر، راجا: ۲۳۴

حسن اختر، ملک: ۲۶۶

حسن شاہ صاحبزادہ، پروفیسر: ۶۱

حسن نظامی، خواجہ: ۲۹

حسینؒ، حضرت: ۳۳-۳۵، ۴۰، ۴۱، ۱۱۷، ۱۲۵

۱۳۰، ۱۲۶

حسین احمد دینی، مولانا: ۱۴۷

حسین محمد جعفری: ۶۲، ۶۰

حضور حضور رسالت مآبؐ: دیکھیے محمدؐ، حضرت

حق نواز خاں، ملک: ۳۱۴

حکمت گوٹھے اور فکر اقبال: ۶۲، ۶۰

حکیم غزنوی: دیکھیے حکیم سنائی غزنوی

حمید احمد خاں، پروفیسر: ۴۶، ۱۲۱، ۱۲۲

حمید احمد خاں، نواب: ۲۲، ۲۱

حمید الدین فراہی، مولانا: ۱۶۸

حمید اللہ شاہ ہاشمی: ۲۲۸

حوادث آشنا: ۲۶۷

حیات اقبال: ۲۳۵، ۲۴۱

حیات اقبال [چراغ حسن حسرت]: ۲۳۲، ۲۵۸

۲۶۹، ۲۶۸

حیات اقبال: ۲۶۵

حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں: ۲۶۴

حیات اقبال کے چند مخفی گوشے: ۵۸

۲۶۷، ۲۶۵

حیات انور: ۱۵۳

۳۲۸

حیات و پیام علامہ اقبال: ۲۶۴

حیدرآباد [سندھ]: ۲۸۵

حیدرآباد وکن: ۱-۳۱، ۳۷، ۴۳، ۹۱، ۹۲، ۱۳۲،

۱۴۷، ۱۵۴، ۱۶۸، ۱۷۲، ۲۳۷، ۲۴۳، ۲۶۴،

۲۷۱

حیدرآباد وکن ہائی کورٹ: ۱۸

حیدر کرار: دیکھیے: علیؒ، حضرت

خالد بن ولید: ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۸

خالد مسعود، ڈاکٹر: ۴۸

خالد نظیر صوفی: ۹۶، ۱۷۱، ۲۳۳، ۲۴۱، ۲۶۰، ۲۶۵،

۲۶۷

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، لاہور: ۶۱، ۷۱

خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: ۵۸

خدنگ نظر: ۳۳۱

خرم علی شفیق: ۲۶۵

خضر، حضرت: ۲۲۴

خضر یاسین: ۵۱

خطبات اقبال: نئے تناظر میں: ۵۱، ۵۷

خطبات اقبال پر ایک نظر (مہر شریف بٹا): ۵۸

خطبات اقبال پر ایک نظر: ۴۸، ۵۸، ۶۲

خطبات بہاول پور: ۱۳۶

خطبات بیاد اقبال: ۶۱

خطبات مدراس: ۵۲، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۴۴

خطبہ الہ آباد: ۱۴۹، ۲۶۱

خطبہ علی گڑھ: ۷۹، ۱۵۹، ۲۴۴



- خطوطِ اقبال: ۲۹، ۹۱، ۲۶۸
- خطوطِ اقبال بنام بیگم گرامی: ۲۲۸
- خطوطِ مودودی: ۱۵۳
- خلج [فارسی]: ۷۰
- خلیفہ عبدالکلیم، ڈاکٹر: ۵۸
- خلیق: ۴۱
- خلیل احمد حامدی: ۱۳۳
- خلیل الرحمن عبدالرحمن، ڈاکٹر: ۶۲
- خلیل اللہ: دیکھیے ابراہیم، حضرت
- خواجہ لولاک: ۱۹۸
- خورشید احمد، پروفیسر: ۵۹
- خورشید احمد شکوری: ۲۶۹
- خورشید کمال عزیز، پروفیسر: ۲۶۷
- خیابان، پشاور: ۳۱، ۳۲
- خیبر ٹیکن، دیکھیے: علی، حضرت: ۲۲۵
- خیبر کشا، دیکھیے: علی، حضرت: ۱۸۱
- دارالادب پاکستان، کراچی: ۳۱
- دارالاسلام: ۱۳۳، ۱۳۷
- دارالمصنفین، اعظم گڑھ: ۱۳۲
- دارحراء، مکہ: ۶۲
- داغ، نواب مرزا: ۲۳۶، ۲۴۰، ۲۵۷
- دانائے راز: ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۹
- دانش گاہ پنجاب، لاہور: ۵۸۔ مزید دیکھیے پنجاب
- یونیورسٹی
- دیر، مرزا: ۳۵
- دجلہ: ۱۳۰
- دکن: ۲۵، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۹۱، ۹۲، ۱۳۷
- ۲۵۱، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۳۷، ۱۷۲، ۱۶۸، ۱۵۴
- دما دم روان سے ہم زندگی: ۲۶۵
- دُشمن: ۱۲۸
- دہلی: ۲۹، ۵۰، ۵۸، ۵۹، ۷۰، ۲۶۰، ۲۶۶
- ۲۶۸، ۲۷۱، ۲۷۳، ۳۰۳
- دہلی یونیورسٹی: ۶۲، ۷۲، ۷۳
- دین محمد، شمس: ۱۸
- دیوبند: ۱۵۳
- دیوانِ غالب (مرقعِ چغتائی): ۲۸۸
- دیوانِ غالب (مطبعِ نظامی): ۲۸۹
- دیوانِ غالب (نسخہ عرش): ۲۸۸
- ڈنمارک: ۷۴
- ڈورس احمد: ۲۶۴
- ڈھا کا: ۱۶۱
- ڈاکٹر حسین، ڈاکٹر: ۲۸۳، ۲۸۴
- ڈاکٹر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ
- ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی: ۶۰
- ذکر اقبال: ۱۵۳، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۴۳
- ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹
- ذوالفقار علی خاں، نواب سر: ۱۷
- راج بلب (حاکم ڈھا کا): ۱۶۱
- رازی: ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۶۴
- راس مسعود: ۲۴۴

- راغب احسن: ۸۳، ۱۳۵  
 رام پرشاد، پروفیسر لالہ: ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۶۸  
 ۲۵۹، ۱۶۹  
 راولپنڈی: ۶۰  
 راعے صاحب گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلسرز،  
 لاہور: ۱۵۶، ۱۶۹  
 رحمان، ڈاکٹر ایس اے: ۲۳۲، ۲۳۳  
 رحیم بخش شاہین: ۲۹، ۳۹، ۶۰  
 رخصت سفر: ۱۷۴  
 رستم: ۱۹۵  
 رسول اکرم رسول کریم رسول ہاشمی: دیکھیے:  
 محمد، حضرت  
 رشید حسن خاں: ۳۱، ۴۲، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹  
 ۲۸۲، ۲۸۵، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹  
 رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: ۲۸، ۳۱، ۵۹، ۵۳، ۱۵۳، ۱۷۵  
 ۲۲۸، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۸۸، ۲۹۳، ۳۰۳  
 ۳۰۷-۳۰۹  
 رموز بے خودی: ۱۱۷، ۱۶۹، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۴، ۳۰۴  
 روایات اقبال: ۲۶۴  
 روح انیس: ۴۱  
 روداد اقبال: ۲۶۶  
 روزگار فقیر: ۲۸، ۱۵۵، ۱۶۹، ۲۴۱، ۲۶۷، ۲۶۸  
 روزنامہ چہ: ۲۹  
 روزنامہ چہ ع ام: ۲۶۸  
 روس: ۷۷، ۸۰، ۸۵، ۸۷  
 روم: ۲۴۴
- رومی، مولانا جلال الدین: ۱۰۶، ۱۵۰، ۱۸۱، ۲۶۴  
 رھوڈز لیچرز: ۲۶۱  
 ریڈیو پاکستان لاہور: ۶۱  
 زاہد منیر عامر: ۶۱  
 زبور عجم: ۱۱۱، ۱۱۲، ۲۲۲، ۳۰۰  
 زٹل نامہ: ۲۷۳  
 زمیندار، لاہور: ۸۰  
 زندہ رُود: ۵۸، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۶۲  
 ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۶۹  
 زین یار جنگ، نواب: ۲۷  
 زینت اللہ جاوید، ڈاکٹر: ۱۷۱  
 سالک، عبدالحجید: ۱۵۳، ۱۶۱، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۴۲  
 ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۷، ۲۶۷  
 سان فرانسسکو: ۷۳  
 سپین: دیکھیے: ہسپانیہ  
 سجاد حسین شاہ شیرازی: ۲۶۵، ۲۶۹  
 سحر البیان (مرتب: رشید حسن خاں): ۲۷۳  
 سراج الدولہ، نواب: ۱۶۰، ۱۶۴، ۱۶۶  
 سراج الدین پال: ۳۹  
 سردار بیگم: ۲۳۰، ۲۵۱  
 سرسید احمد خاں: ۱۱۹، ۱۳۳، ۱۳۸، ۲۵۷  
 سرگذشت اقبال: ۲۳۵، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴  
 ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸  
 سرمایہ حیات: ۵۲  
 سرود رفتہ: ۱۷۴، ۲۵۲، ۲۶۸، ۳۰۴

- سرورد سحر آفرین: ۵۱  
سرمور، رجب علی بیگ: ۴۱  
سرہند: ۲۲۲، ۲۲۰  
سری نگر: ۲۸، ۵۱، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۵، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۷۸، ۷۹، ۸۰
- سومناٹ: ۱۳۰، ۱۸۸  
سوویت یونین: ۸۶  
سوڈان: ۷۴
- سوار احمد اکبر آبادی، مولانا: ۲۶، ۲۸، ۵۳، ۵۸، ۶۲  
سعید اختر وڑائی، ڈاکٹر: ۲۶۹، ۲۶۴  
سفیر نامہ اقبال: ۲۶۵، ۲۶۹  
سکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ: ۲۵۷  
سلطان صلاح الدین ایوبی: ۱۱۹  
سلطان محمد فاتح: ۱۱۹  
سلطان محمود حسین، سید: ۲۵۷، ۲۶۴  
سلطنت عثمانیہ: ۱۴۳  
سلیم منصور خالد: ۱۵۳  
سلیمان ندوی، سید: ۵۳، ۸۳، ۹۲، ۱۳۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۹۷، ۲۴۴  
سلیم: ۲۹۵  
سمرقند: ۱۲۲، ۸۵  
سمندری: ۶۰  
سنائی غزنوی، حکیم: ۱۱۳، ۱۷۹، ۱۷۹، ۲۹۴  
سنجر: ۱۲۰، ۲۲۴  
سنجر پور: ۳۱۴، ۳۱۷  
سنگ میل پیلی کیسٹرز، لاہور: ۵۹، ۶۰، ۲۶۸
- سیارہ، لاہور: ۹۳، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۸۳، ۲۸۵  
سیالکوٹ: ۲۵۰، ۲۵۶، ۲۶۴  
سید احمد شہید بریلوی: ۱۱۹، ۱۳۸  
سید الشہداء: دیکھیے: حسینؑ، حضرت  
سید عبداللہ، ڈاکٹر: ۲۳، ۲۶، ۴۷، ۵۷، ۵۸، ۵۹  
سید نذیر نیازی: حیات اور تصانیف: ۵۸  
سیرت اقبال: ۲۳۲  
سیرنگ پٹنم: ۱۶۰  
سیر افغانستان: ۹۲  
شاعر، بمبئی: ۲۶۸  
شافعیؒ، امام: ۳۰۱، ۳۰۰  
شان الحق حق: ۲۷۹  
شائستہ خاں: ۳۰۳  
شاہ اسماعیل شہید: ۱۱۹، ۱۳۸  
شاہ جہاں: ۱۶۴  
شاہکار، لاہور: ۳۳۵  
شاہ ولی اللہ دہلوی: ۱۱۹، ۱۳۸  
شہلی نعمانی: ۲۸، ۱۳۶  
شہیرؒ: دیکھیے: حسینؑ، حضرت  
شہنشاہ: ۶۴  
شرق اوسط: ۷۰  
شریف گلزار: ۲۲۸، ۲۲۹

اقبالیات: تفہیم و تجزیہ

شعبہ اردو، پشاور: ۳۱، ۴۲

شعبہ اردو، لاہور: ۱۷۲

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی: ۶۲

شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد  
۶۰:

شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور: ۵۱

شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور: ۶۱

شعبہ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن: ۴۹

شعبہ، حضرت: ۲۲۷

شفا عمت احمد خاں، ڈاکٹر: ۲۱

شفیع داؤدی، مولانا: ۲۱

تکلیب ارسلان، امیر: ۴۳

تکلیب احمد، سید: ۱۷، ۲۸-۳۱، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۷۳  
۲۶۴

شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: ۵۷

شمس الرحمن فاروقی: ۲۷۷، ۲۸۴

شیم احمد: ۶۰

شواجی: ۱۶۷

شورش کاشمیری: ۶۲، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۶۷

شور محشر: ۲۵۴

شہرت بخاری: ۲۷۴

شہزاد احمد: ۵۹

شہزاد قیصر: ۶۰

شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: ۵۸، ۱۳۳، ۱۷۷، ۲۲۸،  
۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۲

۳۳۲

شیخ مبارک علی، لاہور: ۲۲۱

شیخ محمد اشرف، لاہور: ۵۰، ۵۷

شیرانی، حافظ محمود: ۲۸۸

شیر شاہ سوری: ۱۶۶

شیشتان: ۷۱

شریف کنجاہی: ۵۹

صابر حسین کلروی، ڈاکٹر: ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۹۸، ۱۹۹

۲۱۷، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۶۴

صادق علی دلاوری: ۱۷۴، ۲۵۲، ۲۶۸

صباح الدین عبدالرحمن، سید: ۲۶۰

صحیفہ، لاہور: ۱۶۸

صدر یار جنگ، نواب: دیکھیے مولانا حبیب الرحمن  
شروانی

صدیق جاوید، ڈاکٹر: ۲۲۹، ۲۶۶، ۲۸۵

صفدر محمود، ڈاکٹر: ۷۳

صلاح الدین احمد: ۱۲۱

صہبا لکھنوی: ۲۶۴، ۲۶۸

ضاحک، میر: ۴۱

ضربِ کلیم: ۷۲، ۸۱، ۹۲، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۷۷، ۱۳۳-  
۱۳۶، ۱۵۲، ۲۰۴، ۲۱۳، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۲،

۲۷۶، ۲۷۸، ۳۰۴، ۳۰۵

ضربِ کلیم مع شرح: ۱۳۴

ضمیر الدین، حافظ: ۵۹

ضیاء الحسن فاروقی: ۵۵

طارق پبلی کیشنز، بھوپال: ۲۹

- طالب فارسی لکھنؤی: ۲۳۲
- طاہر الدین، نشی: ۲۵۱
- طاہر تونسوی: ۲۶۵
- طرابلس: ۱۱۶
- طغرل: ۲۲۴
- طفیل محمد میاں: ۱۱۰
- طواسین اقبال (ایس ایم عمر فاروق): ۵۱، ۶۱
- طیب منیر، ڈاکٹر: ۲۶۸
- ظانصاری: ۲۹، ۲۹۴
- ظاہر شاہ: ۱۱۳
- ظفر الحسن، ڈاکٹر سید: ۴۳، ۴۴
- ظفر حجازی، محمد صدیق: ۲۶۵
- ظفر علی خاں، مولانا: ۲۴
- ظہور احمد ظہور: ۱۷۱
- عابد حسین، ڈاکٹر: ۵۹، ۳۶
- عابد علی عابد: ۳۵، ۳۷، ۳۸
- عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر: ۲۳۳، ۲۶۷
- عالی مجلس تحفظ ختم نبوت، ملتان: ۱۳۴
- عباس آرام: ۴۷
- عبدالحق، پروفیسر: ۶۲
- عبدالحق، بابائے اردو مولوی: ۲۲
- عبدالحق انصاری، ایم: ۶۰
- عبدالحلیم شرر: ۲۴
- عبدالرب نشتر، سردار: ۲۳۲
- عبدالرزاق، مولوی: ۲۰
- عبدالرؤف عروج: ۳۰، ۳۱
- عبدالسلام خورشید: ۲۳۵، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶
- عبدالسلام ندوی: ۲۳۲
- عبدالعزیز، مولوی (والد پرویں رقم): ۲۲۱
- عبدالغفار کھلیل: ۱۷۴
- عبدالغنی: ۱۶۹
- عبدالقادر، سر شیخ: ۲۸، ۲۳۱، ۲۳۹، ۲۴۵، ۲۶۶
- عبدالکریم ربیع: ۱۲۲
- عبداللطیف اعظمی: ۲۵۳
- عبداللہ المسدوسی: ۲۹
- عبداللہ خمیسنگی: ۲۶۹
- عبداللہ شاہ ہاشمی: ۱۳۳
- عبدالمجید خاں ساجد: ۲۶۵
- عبدالمجید خوش نویس: دیکھیے پرویں رقم
- عبدالمجید سلہریا: ۶۱
- عبدالمنعمی، ڈاکٹر: ۵۰
- عبدالواحد بگلوری: ۱۷۰
- عبدالواحد معینی، سید: ۲۷، ۲۹، ۹۱، ۱۷۴، ۲۳۳
- ۲۴۴، ۲۵۲، ۲۶۷
- عبدالوحید خواجہ، دیکھیے کے اے وحید
- عبدالودود، قاضی: ۲۸۸
- عتیق صدیقی: ۲۶۶
- عثمانیہ یونیورسٹی: دیکھیے جامعہ عثمانیہ
- عجم: ۱۲۶

- عراق: ۱۳۳، ۱۳۰، ۸۶، ۷۳، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
- علم الاقتصاد: ۵۱۱
- علم مجلسی: ۲۰۱
- علمی کتب خانہ، لاہور: ۲۶۹
- علیؑ، حضرت + خیر کشا + خیر شکن: ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
- علمی کتب خانہ، لاہور: ۲۶۹
- عروج اقبال: ۲۶۹، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۴، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۴۴، ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۲۱۴، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰، ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
- عسکری رئیس، میر: ۴۱
- عشرت حسن انور: ۵۱، ۴۳
- عطا خورشید، ڈاکٹر: ۲۸۵
- عطا محمد، شیخ: ۲۳۳
- عطار: ۱۰۶
- عطیہ بیگم / عطیہ فیضی: ۱۷، ۲۸، ۲۴۲، ۲۵۵، ۲۶۰، ۲۶۹
- علامت، لاہور: ۷۱
- علامہ اقبال: اپنوں کی نظر میں: ۲۶۵
- علامہ اقبال اور پین یونیورسٹی، اسلام آباد: ۴۹، ۵۱، ۲۶۹، ۲۶۵، ۶۰
- علامہ اقبال اور اصول اجتہاد: ۵۰
- علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال: ۲۶۵
- علامہ اقبال اور جہان اسلام: ۶۱
- علامہ اقبال پر ۱۹۷۶ء تک مطبوعہ سوانحی کتب کا تحقیقی جائزہ: ۲۶۹
- علامہ اقبال روڈ، لاہور: ۲۸۲
- علامہ اقبال کا سالِ ولادت ۱۹۷۳ء یا ۱۹۷۷ء:
- ۲۶۴
- علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کا جائزہ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء: ۲۶۹
- غفران: ۲۹۴
- غزالی، امام: ۱۰۶، ۱۳۸
- غزنوی۔ دیکھیے محمود غزنوی
- غزنی: ۱۶۰
- غفران: ۲۹۴

- غلام احمد پنڈت، خواجہ: ۶۱  
غلام احمد قادیانی، مرزا: ۱۱۹، ۱۳۳  
غلام رسول عدیم: ۲۶۵  
غلام رسول محمد: ۵۱  
غلام رسول ملک: ۵۱  
غلام رسول مہر، مولانا: ۱۱۶، ۱۶۱، ۱۷۴، ۲۲۸، ۲۳۱-  
۲۳۳، ۲۴۰، ۲۵۲، ۲۶۸  
غلام سرور راہی: ۲۲۸، ۲۲۹  
غلام قادر بلگرامی، مولانا: ۱۸، ۱۹  
غلام قاسم مجاہد بلوچ: ۲۶۵  
فارس: ۱۶۶  
فارکو ہرن، مس: ۸۷، ۹۱  
فاطمہ بنت عبداللہ: ۱۱۶  
فرائت: ۱۳۰  
فرانس: ۲۷۷، ۲۳۴  
فردوسی: ۱۶۶  
فرزند علی، چودھری: ۲۶۸  
فرعون: ۱۳۱، ۱۹۵  
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ۲۲۹  
فرنگ: ۶۳-۶۶، ۶۹، ۷۱، ۸۵، ۱۱۳، ۱۸۱، ۱۹۷  
۲۱۱، ۲۱۵، ۲۹۶  
فرہنگ فارسی: ۲۹۲  
فسانہ عجائب: ۲۷۳، ۲۲  
فقیر محمد چشتی نظامی، حکیم: ۲۲۱  
فکر اسلامی کی تشکیل نو: ۲۸
- فکر اقبال: ۵۸  
فلپائن: ۱۳۳  
فلسطین: ۷۱، ۸۷، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۳  
فلسفہ اقبال: خطبات کی روشنی میں: ۴۹،  
۶۲  
فن لینڈ: ۷۴  
فسبری نارٹھ لندن: ۲۵۴  
فنون، لاہور: ۵۹  
فیروز سنز، لاہور: ۵۰  
فیروز شاہ تغلق: ۱۶۶  
فیصل آباد: ۲۲۸  
قادر سی اے: ۶۰  
قائد اعظم: ۸۲، ۸۹، ۱۰۹، ۱۵۰  
قرآن مجید: ۵۰، ۶۲، ۸۹، ۹۱، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۳،  
۱۰۴، ۱۲۱، ۱۲۶، ۲۹۳  
قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: ۶۰، ۶۲  
قرطبہ: ۸۳، ۷۷  
قمر کتاب گھر، کراچی: ۲۲۹  
قنوج: ۱۶۶  
قیصر: ۱۲۵  
کابل: ۲۷۷، ۲۳۳  
کامن ویلتھ (Common Wealth): ۲۱  
کان پور: ۲۸۹  
کبیر (دریا): ۸۳  
محمد حسین، چودھری: ۲۳۲، ۲۳۳، ۳۰۷-۳۱۰

- کلاسیکی ادب کی فرہنگ: ۲۷۳
- کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ: ۲۶۸
- گلورا ڈوسپرنگ: ۷۵
- کلیاتِ اقبال: ۲۰
- کلیاتِ اقبال اردو: ۳۱، ۹۲، ۱۱۲، ۱۵۲، ۱۵۴، ۲۷۱-۲۷۲
- ۲۷۹، ۲۸۷-۲۸۹، ۳۰۷
- کلیاتِ اقبال اردو (اکادمی): ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۷۶، ۲۷۷
- ۲۷۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۳۰۴، ۳۰۵
- کلیاتِ اقبال اردو (ڈی کس اڈیشن): ۲۷۴، ۲۷۸، ۲۸۲
- کلیاتِ اقبال اردو (سپر ڈی کس اڈیشن): ۲۷۸
- کلیاتِ اقبال اردو (عوامی اڈیشن): ۲۷۴، ۲۷۸
- ۲۸۲
- کلیاتِ اقبال اردو (غ ع): ۲۷۱-۲۷۴، ۲۷۶-۲۷۷
- ۲۸۲، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۱-۲۹۳، ۳۰۲
- ۳۰۳-۳۰۹، ۳۱۱
- کلیاتِ اقبال فارسی: ۲۷۱، ۲۷۹، ۲۸۱، ۳۰۷
- کلیاتِ اقبال فارسی (اکادمی): ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۷۹
- ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۷-۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۷-۲۹۹
- ۲۹۹-۳۰۹، ۳۱۱
- کلیاتِ اقبال فارسی (غ ع): ۲۸۰، ۲۸۹، ۲۹۱
- ۲۹۲، ۲۹۸-۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۶
- ۳۰۷-۳۱۲، ۳۱۰
- کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال: ۱۷۵، ۱۹۸، ۱۹۹
- ۲۰۱، ۲۰۴، ۲۱۶، ۲۱۷
- کلیاتِ مکاتیبِ اقبال: ۱۴۰، ۱۷۰

- نیاز علی خاں، چودھری: ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۵۴
- کپور آرٹ پرنٹنگ پریس، لاہور: ۲۶۹
- کتاب سرائے، لاہور: ۲۶۹
- کتاب منزل، لاہور: ۲۶۸
- کتاب (لاہور): ۲۲۸، ۲۲۹
- کتابیاتِ اقبال: ۲۷۴
- کتب خانہ سنجر پور: ۳۱۷
- کتب خانہ طلوعِ اسلام، لاہور: ۳۲۱
- کتب خانہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد: ۲۶۹
- کراچی: ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۹۲، ۹۳، ۱۱۱
- ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۵۷، ۱۶۹، ۱۷۴، ۲۲۹، ۲۶۴-۲۶۶
- ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۹۲
- کراچی یونیورسٹی: ۶۰-مزید دیکھیے جامعہ کراچی
- کراچی: ۳۳، ۳۵
- کرسٹینا اوسٹر بلڈ، ڈاکٹر: ۲۸۵
- کریم بی بی (اہلیہ اقبال): ۲۶، ۲۵۰، ۲۵۴
- کریم بی بی (ہشیرہ اقبال): ۱۰۵
- کسرئی: ۱۲۵
- کشف المحجوب: ۱۱۰
- کشمیر: ۲۸، ۷۱، ۸۷، ۱۳۰، ۱۳۳، ۲۵۶
- کشمیر یونیورسٹی، سری نگر: ۲۸، ۶۰، ۶۱
- کشمیری میگزین: ۲۳۱
- کشن پرنٹرز، سرمہاراجا: ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۹۵
- کفایت اللہ: شخصیت اور خدمات: ۱۷۱



کلید اقبال: ۱۶۹

کلیم [حضرت موسیٰ]: ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۳۱، ۱۳۸، ۱۴۸،  
۱۹۶، ۲۱۱، ۲۱۷، ۳۰۴

کنول آرٹ پریس، لاہور: ۷۵

کنیر فاطمہ یوسف: ۵۹

کوسوا: ۱۳۰، ۱۳۳

کے ریجنٹر و: ۱۲۳، ۱۸۵

کیسل سٹریٹ: ۲۵۸

کیلی فورنیا: ۷۳

کیمرج: ۲۵۴، ۲۵۸

کیمرج یونیورسٹی: ۲۵۴

کے ایف سی: ۶۸

کے کے عزیز: دیکھیے خورشید کمال عزیز

گائز ہال، دہلی یونیورسٹی: ۲۷۴

گجرات: ۱۶۶، ۲۶۵

گردیزی پبلشرز، کراچی: ۹۲، ۱۳۵، ۲۶۵

گفتار اقبال: ۷۳، ۱۵۲

گلزار نسیم: ۲۷۳

گلشن پروین: ۵۱

گلوب پبلشرز، لاہور: ۲۶۷

گوپی چند نارنگ: ۲۸۵

گویتہ (درست: گوئے): ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۰۹

گوہرانوالہ: ۵۲، ۲۲۱

گورستان شاہی (نظم): ۱۸

گورنمنٹ کالج، لاہور: ۱۵۶، ۲۵۱، ۲۵۶، ۲۵۸

۲۵۹

گورنمنٹ ہائی اسکول، لدھیانہ: ۱۷۱

گوئے: ۲۸۰، ۲۸۲، ۳۰۹، ۳۱۰

گیان چند جین، ڈاکٹر: ۳۰۲

لارڈ مینو: ۱۵۶

لائن آرٹ پریس، کراچی، لاہور: ۱۶۹، ۲۶۷

لاہور: ۱۸، ۲۸، ۲۹، ۴۱، ۴۲، ۴۵، ۵۰، ۵۱، ۵۷

۶۲، ۷۱، ۷۵، ۷۳، ۷۴، ۹۱، ۹۳، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۳۱

۱۳۵، ۱۳۷، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۹

۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۲۰۱، ۲۱۹

۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۳۵، ۲۳۹

۲۵۶، ۲۵۸، ۲۶۴، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۸۱

۲۸۳، ۲۸۷، ۲۸۸، ۳۰۳

لبنان: ۱۳۳

لدھیانہ: ۱۷۱

لزومیات (ابوالعلا معری): ۲۹۴

لطیف احمد شروانی: ۹۱-۹۳

لکھنؤ: ۳۶-۳۸، ۴۰، ۴۱، ۲۶۰

لندن: ۲۰، ۵۷، ۹۵، ۱۳۹، ۲۵۴

لندن سکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس:

۲۵۴

لنکن ان: ۲۵۴

مش: دیکھیے میاں محمد شفیع

مارشل لا سے مارشل لا تک (سید نور احمد):

۱۵۴

مالیر کوئلہ: ۱۶۴، ۱۷۱

- محمد اکبر منیر، پروفیسر: ۱۵۱، ۹۳، ۸۶، ۸۶، ۹۳، ۱۵۱
- محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر: ۵۹
- محمد الدین فوق / محمد دین فوق: ۲۳۱، ۲۶۵، ۲۶۷
- محمد السورتی، مولانا: ۲۶
- محمد امین اندرابی: ۲۸۵
- محمد انور حارث: ۱۷۴
- محمد بشیر الحق / دیسوی عظیم آبادی: ۱۷۴، ۲۱۶
- محمد بن سعد، ڈاکٹر: ۷۵
- محمد بن عبدالوہاب: ۱۳۸
- محمد جمیل: ۹۳
- محمد حسام الدین خاں غوری: ۳۱
- محمد حسن قرشی، حکیم: ۲۳۳
- محمد حسن، ڈاکٹر: ۲۵
- محمد حسین شاہ، ڈاکٹر سید: ۲۵۰
- محمد حمزہ فاروقی: ۲۹، ۵۸، ۲۶۵، ۲۶۷
- محمد حنیف شاہد: ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۶۲، ۲۶۴
- ۲۶۶
- محمد رفیق چودھری: ۶۰
- محمد رفیق خالد: ۲۶۵
- محمد ریاض، ڈاکٹر: ۳۹
- محمد سعید، مولوی: ۶۱
- محمد سعید شیخ، پروفیسر: ۲۸
- محمد سمیع الحق، ڈاکٹر: ۵۸، ۵۹
- محمد سہیل عمر: ۵۱، ۵۳، ۵۷، ۵۸، ۶۰، ۶۱
- محمد شریف بقا: ۵۸
- ماہ طلعت علوی: ۶۲
- مبارک علی، شیخ: ۲۲۹
- متعلقات خطبات اقبال: ۴۷، ۵۷، ۵۹
- مثنویات شوق: ۲۷۳
- مجالس اقبال: ۲۶۵
- محمد والف ثانی: ۱۲۱، ۱۳۸
- مجلس اقبال: ۲۳۱
- مجلس ترقی ادب، لاہور: ۲۸، ۲۹، ۳۲، ۳۶، ۱۳۳
- مجلس قانون ساز پنجاب: ۲۶۱
- مجلس نشریات اسلام، کراچی: ۶۲
- مجلس اقوام: ۶۷، ۶۸، ۷۸، ۷۹، ۹۱
- مجلہ تحقیق، لاہور: ۲۰۱
- محبوب بک ڈپو، فیصل آباد: ۲۲۸
- محمّن الملک: ۲۲، ۲۸
- محمد، حضرت: ۸۸، ۹۷، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۵، ۱۱۸، ۱۲۲
- ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۱
- ۱۶۱، ۱۸۳، ۱۹۷
- محمد اجمل، ڈاکٹر: ۶۰
- محمد احسن خاں: ۲۶۹
- محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر: ۳۳، ۳۵
- محمد احمد خاں: ۲۹
- محمد ازہر شاہ قیصر: ۱۵۳
- محمد افضل، ڈاکٹر: ۵۹
- محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات: ۲۵۳
- محمد اقبال و موقفہ من الحضارة الغربية: ۶۲

- محمد شفیع، مولوی: ۲۸۸  
 محمد شفیع، میاں (م ش): ۲۳۹، ۱۵۴  
 محمد صادق، ڈاکٹر: ۲۵۸  
 محمد صالح، منشی: ۱۵۰  
 محمد ضیاء الحق، جنرل: ۲۳۹  
 محمد طاہر فاروقی: ۱۶۱، ۲۳۲  
 محمد طفیل (مدیر نقوش): ۲۳۹  
 محمد عالم مختار حق: ۲۲۸  
 محمد عبدالغنی نیازی، شاہ: ۵۸  
 محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر: ۲۶۴  
 محمد عبداللہ قریشی: ۲۸، ۱۷۲، ۲۵۲، ۲۶۴، ۲۶۵  
 ۲۶۷  
 محمد عثمان، پروفیسر: ۵۵، ۴۸  
 محمد علی جناح: دیکھیے قائد اعظم  
 محمد فرید الحق: ۹۲، ۱۳۵، ۲۶۵  
 محمد کفایت اللہ: ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۷۱  
 محمد مبارک شاہ جیلانی: ۳۱۴  
 محمد متین خالد: ۱۳۴  
 محمد مجیب، پروفیسر: ۲۸۳  
 محمد معز الدین، ڈاکٹر: ۱۵۸  
 محمد منور، پروفیسر: ۴۶، ۵۲، ۵۸  
 محمد منیر سلج: ۲۶۵  
 محمد یوسف گورایہ، ڈاکٹر: ۵۰، ۵۵  
 محمود احمد غازی، ڈاکٹر: ۱۳۶  
 محمود غزنوی: ۱۱۳، ۱۳۰، ۱۶۰، ۱۶۶، ۱۸۸، ۳۱۷  
 محمود نظامی: ۱۵۲  
 مختار صدیقی: ۶۰  
 مسخزن (لاہور): ۲۸، ۲۵۱  
 مدراس: ۴۳، ۴۴، ۴۵  
 مدراس مسلم ایسوسی ایشن: ۲۴۴  
 مدینہ شریف: ۶۴  
 مذہبی افکار کی تعمیر نو: ۵۹  
 مرتضیٰ، دیکھیے: علی، حضرت  
 مرثیہ نگاری اور میر انیس: ۴۱، ۴۲  
 مرغوب ایجنسی، لاہور: ۲۶۹  
 مرغوب رقم، منشی فضل الہی: ۲۲۱  
 مزار اقبال: ۲۷  
 مزار اقبال: ۲۶۵  
 مسافر: ۹۲، ۱۱۳، ۲۲۲  
 مسجد قرطبہ: ۲۳۵  
 مسعود حسن رضوی ادیب: ۴۱  
 مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور: ۲۶۹  
 مسلم شریف: ۹۸، ۱۳۳، ۱۳۴  
 مسولینی: ۱۲۹، ۲۴۴، ۲۴۸، ۲۵۵  
 مسیح: ۱۹۶  
 مشتاق احمد خاں، نواب: ۱۸، ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۳۰  
 مشتاق احمد گنائی: ۵۱  
 مشرقی یورپ: ۸۳، ۸۵، ۸۷  
 مشکوٰۃ شریف: ۹۸  
 مشیر الحق، ڈاکٹر: ۵۵

مکتبہ ادب جدید، لاہور: ۲۶۸  
 مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور: ۶۲، ۱۵۳  
 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی: ۵۰، ۷۲، ۲۶۸، ۳۰۳  
 مکتبہ حرمت، راولپنڈی: ۶۰  
 مکتبہ خلیل، لاہور: ۵۹  
 مکتبہ معیار، کراچی: ۲۹  
 مکتبہ شریف: ۵۳، ۶۴  
 ملتان: ۶۰، ۱۳۴، ۲۶۵  
 ملفوظات [اقبال]: ۱۵۲  
 ممتاز حسن، ڈاکٹر: ۲۹، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۲  
 ممتاز علی اینڈ سنز، لاہور: ۲۲۱  
 منٹو، لاہور: ۱۵۶  
 منشورات، لاہور: ۱۵۳  
 منظور احمد: ۶۱  
 منیر نیازی: ۷۳  
 منیرہ سلطنت: ۲۴۵  
 موازنۃ انیس و دبیر: ۳۲  
 موہووی، مولانا ابوالاعلیٰ: ۵۳، ۵۵، ۶۲، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱  
 موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دہلی: ۲۶۸  
 موسیٰ، حضرت: ۱۱۷  
 مہاتما گاندھی: ۲۸۳  
 مہدی یار جنگ، نواب: ۳۰  
 میر جعفر: ۲۷  
 میر حسن، مولوی سید: ۶۳، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲

اقبالیات: تفہیم و تجزیہ  
 مصباح الحق صدیقی: ۲۶۵  
 مصطفیٰ، دیکھیے: محمد، حضرت  
 مصطلحات ٹھگی: ۲۷۳  
 مضامین اقبال: ۹۱  
 مطالب بانگِ درا: ۱۳۳  
 مطبوع نظامی، کان پور: ۲۸۹  
 مطبوعات چٹان، لاہور: ۲۶۷  
 مظفر الدین قریشی، ڈاکٹر: ۲۶، ۳۱، ۳۱، ۳۲  
 مظفر آباد: ۶۱  
 مظفر حسین [چودھری]: ۶۱  
 مظفر حسین برنی، سید: ۱۷۰  
 مظلوم اقبال: ۱۱۱، ۲۶۲، ۳۲۹  
 معاصرین: اقبال کی نظر میں: ۲۸  
 معتمد: ۳۱۰  
 معری، ابوالعلا: ۲۹۴  
 معز الدین احمد: ۱۳۳  
 معین، ڈاکٹر: ۲۹۲  
 معین الرحمن، ڈاکٹر سید: ۴۱  
 معین نواز جنگ، سر: ۲۵، ۲۶، ۳۰  
 مفکر پاکستان: ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹  
 مفکر پاکستان اور حیدرآباد: ۳۱  
 مقالاتِ اجمل: ۶۰  
 مقالاتِ اقبال: ۹۱، ۱۵۲، ۱۵۳  
 مکاتیبِ اقبال بنام گرامی: ۲۸، ۲۹، ۳۱  
 مکاتیبِ رشید حسن بنام رفیع الدین ہاشمی: ۳۱

نظر حیدر آبادی: ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱

میر صادق: ۷۷

نظیر صوفی: ۲۶۳

میسنور: ۲۳۳، ۱۶۰، ۲۳۲

نظیری: ۲۹۹

میک ڈوملڈ: ۶۸

نعیم احمد: ۶۱

میونخ یونیورسٹی: ۲۵۸، ۲۵۴

نفس الکیڈمی، حیدرآباد دکن: ۹۲

میونسپل گزٹ، لاہور: ۱۸

نفس رقم، سید انور حسین: ۲۲۲

نادر شاہ درانی: ۱۱۳، ۱۲۰

نقد و نظر، علی گڑھ: ۲۶۹، ۲۸۳

ناز، ایم ایس: ۲۳۵، ۲۳۱، ۲۶۰، ۲۶۵

نقشِ اقبال: ۲۹، ۳۱، ۲۶۷

ناگاساکی: ۷۰

نقوشِ اقبال: ۶۲

ناروے: ۷۴

نقوش، لاہور: ۵۹، ۱۵۴، ۲۳۹

نبی رنبی آخر الزماں رنبی اکرم رنبی کریم: دیکھیے: محمد،

حضرت

نواب بھوپال: دیکھیے نواب حمید اللہ خاں

نجف: ۶۳

نوادِرِ اقبال: ۱۷۴

نجم الدین اربکان: ۷۱

نوائے وقت، لاہور: ۶۲

نذرِ اقبال: ۲۶۶

نور احمد، حافظ: ۲۲۲

نذیر احمد، ڈپٹی: ۲۸، ۲۵۴

نور احمد، سید: ۱۳۹، ۱۵۴

نذیر احمد، ملک: ۱۶۹

نور الہی، خواجہ: ۱۶۹

نذیر سنز، لاہور: ۶۰

نور محمد، شیخ: ۶۳، ۹۷، ۲۵۶، ۲۵۷

نوشیرواں: ۲۲۵

نذیر نیازی، سید: ۴۵، ۴۶، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۸

نول کشور، منشی: ۳۰۶

۵۹، ۹۳، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۵۳، ۲۳۲، ۲۳۵

نئی دہلی: ۶۰، ۳۱۳

۲۳۹-۲۵۳، ۲۵۹، ۲۶۰

نسیم اختر: ۵۸، ۵۹

نہرو، پنڈت جواہر لال: ۲۲۷، ۲۶۸، ۲۸۴

نطشہ (درست: میٹھے) مزید دیکھیے: نیچہ، میٹھا

نیچہ (درست: میٹھے) ۳۰۹، مزید دیکھیے: نطشہ، میٹھا

نظام الملک، نواب (اولین نظام دکن): ۱۶۹

میٹھا / میٹھے: ۳۰۹، مزید دیکھیے: نطشہ، نیچہ

نظام دکن: ۲۱، ۲۵، ۳۰، ۳۱

نیرنگ خیال (لاہور): ۵۸، ۲۳۱

نظام طوسی: ۲۴

نیشنل بینک، کراچی: ۱۵۷

اقبالیات: تفہیم و تجزیہ

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت اقبال:

۲۳۵، ۲۳۲، ۲۳۹

نیوز ویک [News Week]: ۷۴

والدہ آفتاب اقبال: دیکھیے کریم بی بی (اہلیہ اقبال)

والدہ جاوید اقبال: مزید دیکھیے سردار بیگم

وحید احمد: ۶۵، ۲۲۸

وحید الدین، پروفیسر سید: ۴۹، ۵۶

وحید الدین، فقیر سید: ۱۵۶، ۱۶۹، ۲۳۳

وحید عشرت، ڈاکٹر: ۵۹، ۶۱

وحید قریشی، ڈاکٹر: ۴۷، ۴۸، ۲۶۸، ۲۵۸، ۱۷۴، ۱۷۵

۳۱۳

وحید، کے اے (خواجہ عبدالوہید): ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۶۹

ورلڈ بنک: ۶۸

وزیر علی، ڈپٹی: ۲۵۷

وزیر علی، میر: ۲۵۴

وسطی ایشیا: ۸۳، ۸۵، ۸۶، ۱۲۲

وفات نامہ اقبال: ۲۶۵

وقار الملک: ۲۴

وقار عظیم، پروفیسر سید: ۳۳، ۴۱، ۴۶

ولزلی، لارڈ: ۱۶۰

ویروی، مرزا امام: ۲۲۲

ویلز، ایچ جی: ۴۳

ہارٹن، پروفیسر: ۸۹

ہاشم بگرامی، سید: ۱۸

ہائڈل برگ یونیورسٹی: ۲۸۵

۳۴۲

ہسپانیہ + انڈس + سپین + اسپین: ۷۲، ۷۹، ۸۳

۸۴، ۱۱۸، ۱۲۹، ۲۴۲، ۲۴۸، ۳۱۰

ہفتہ جشن اقبال (آزاد کشمیر ریڈیو، مظفر آباد): ۶۱

ہمایوں، شہنشاہ نصیر الدین: ۱۶۶

ہندو ہندستان: ۲۱، ۲۷، ۳۸، ۴۰، ۴۵، ۶۳، ۷۷

۷۸، ۸۴، ۸۵، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۳

۱۵۵-۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۷۰، ۲۴۲

۲۴۷، ۲۴۸، ۲۸۳، ۲۹۸

ہیرس، جرنیل: ۱۶۰

ہیروشیما: ۷۰

یاد اقبال (صابر کلرووی): ۳۳۵

یکن: ۴۱

یورپ: ۲۲، ۴۱، ۶۳-۶۴، ۷۹، ۷۴، ۷۸، ۷۹، ۸۰

۸۳، ۸۵، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۴۳-۱۴۵، ۱۸۷، ۲۴۱

۲۴۲، ۲۴۵، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۷۷

یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: ۲۷، ۵۶، ۱۱۹، ۱۲۲

یونان: ۷۴

۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب: ۵۹

(کے اے وحید) *A Bibliography of Iqbal*:

۱۵۵، ۱۶۹

Abdul Qadir, Sheikh: ۲۶۷

Adam Smith: ۷۲

Alamgir: ۱۵۹

*Allama Iqbal and the Authority to*

*Interpret in a Modern Islamic*

*State: ۵۰*

- League of Nations: ۶۷, ۷۸
- Amritsar: ۱۵۵
- Letters and Writings of Iqbal: ۹۱, ۱۵۲
- Arabia: ۴۱
- Letters of Iqbal: ۹۲, ۱۵۲
- Articles on Iqbal (بشیر احمد ڈار): ۷۵
- Mumtaz Hasan: ۱۵۶
- Bibliography of Iqbal (عبدالغنی، خواجہ نور)  
عبدالغنی: ۱۶۹
- Mufid-i-Am Press: ۳۱۷
- Cantab: ۲۵۸
- Orient Longmans, Calcutta: ۲۶۷
- Calcutta: ۲۶۷
- Six Lectures on the Reconstruction  
of Religious Thought in Islam  
: ۴۳, ۴۷
- Europe: ۱۴۵
- India: ۲۶۸
- Speeches, Writings and Statements  
of Iqbal: ۹۱, ۱۳۶
- History of India: ۳۱۶, ۳۱۷
- Stray Reflections: ۱۵۲
- Iqbal (عظیمی فیضی): ۲۸
- Tarikh i Hind: ۱۵۵
- Iqbal As I Knew Him: ۲۶۴
- The Ardent Pilgrim (Iqbal Singh): ۲۶۷
- Iqbal Centenary Papers (جامعہ پنجاب):  
۶۰
- The Development of Metaphysics in  
Persia: ۲۵۸,
- Iqbal Review (لاہور): ۵۱, ۶۰
- The Metaphysics of Iqbal: ۴۴
- Iqbal and Tagore: ۵۹
- The Reconstruction of Religious  
Thought in Islam: ۵۵, ۶۲, ۶۶,  
۷۲, ۹۳, ۱۱۱, ۱۵۳
- Iqbal i Hind (خلاصہ تاریخ ہند): ۱۵۵
- Iqbal in Pictures: ۱۵۶, ۱۶۹
- Iqbal's Reconstruction of Ijtihad:  
۴۹
- Time: ۶۹
- Iqbal: ۲۳, ۱۵۶, ۲۶۷
- Wedding Bells are not ringing (رپورٹ):  
۷۴
- Iqbal: Essay and Studies: ۶۰
- Journal of Research Society of  
Pakistan: ۲۶۹
- Lala Ram Parshad: ۱۵۵



## اقبالیات پر مصنف کی تصانیف و تالیفات

- اقبال کی طویل نظمیں (تنقید و تجزیہ)  
لاہور: ۴-۱۹۷۱ء-۱۹۸۱ء-۱۹۸۵ء
- کتبِ اقبالیات (مختصر کتابیات)  
لاہور: ۱۹۷۵ء
- خطوطِ اقبال (تحقیق و تدوین)  
لاہور: ۶-۱۹۷۶ء-دہلی: ۷-۱۹۷۷ء
- اقبال بحیثیت شاعر (انتخاب و تدوین)  
لاہور: ۷-۱۹۷۷ء-۲۰۰۷ء  
علی گڑھ: ۱۹۸۲ء-۱۹۹۶ء
- کتابیاتِ اقبال (مفصل کتابیات)  
لاہور: ۷-۱۹۷۷ء
- تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ (تحقیق)  
لاہور: ۱۹۸۲ء-۲۰۰۲ء-۲۰۱۱ء
- ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب (تعارف و تجزیہ)  
لاہور: ۱۹۸۶ء
- ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب (تعارف و تجزیہ)  
لاہور: ۱۹۸۸ء
- اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ (انتخاب مضامین)  
لاہور: ۱۹۸۹ء
- اقبال شناسی اور محور (انتخاب مضامین)  
لاہور: ۱۹۸۹ء
- اقبالیاتی جائزے (تحقیقی و تنقیدی مضامین)  
لاہور: ۱۹۹۰ء
- علامہ اقبال (منتخب کتابیات)  
اسلام آباد: ۱۹۹۳ء
- اقبالیات کے تین سال ۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء (تعارف و تجزیہ)  
لاہور: ۱۹۹۲ء
- علامہ اقبال اور میرِ حجاز (تجزیہ و تنقید)  
لاہور: ۱۹۹۳ء-۲۰۱۵ء
- اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے (شریک مصنف)  
اسلام آباد: ۱۹۹۴ء
- تحقیقِ اقبالیات کے مآخذ (تحقیق)  
لاہور: ۱۹۹۶ء
- اقبالیات کے سوسال (منتخب مضامین) شریک مؤلف  
اسلام آباد: ۲۰۰۳ء-۲۰۰۷ء-۲۰۱۲ء
- اقبالیات: تفہیم و تجزیہ (تحقیق و تنقید)  
لاہور: ۲۰۰۵ء-۲۰۱۰ء-۲۰۱۶ء
- علامہ اقبال: شخصیت اور فکر و فن  
اسلام آباد: ۲۰۰۸ء-لاہور: ۲۰۱۰ء-۲۰۱۶ء
- پاکستان میں اقبالیاتی ادب (۱۹۴۷ء-۲۰۰۸ء)  
لاہور: ۲۰۰۹ء
- علامہ اقبال: مسائل و مباحث (ڈاکٹر سید عبداللہ) تدوین  
لاہور: ۲۰۱۲ء
- اقبال کا تصور ریاست (ڈاکٹر وحید قریشی) تدوین  
لاہور: ۲۰۱۴ء
- اقبالیاتی ادب، حالیہ پیش رفت  
سری نگر: ۲۰۱۴ء